کُلیّات چودھری محمد علی رُدولوی

(15 مئی 1882 - 10 ستمبر 1959)

(جلد سوم)

ترتیب و تدوین

مسعود الحق

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومتِ ہند

ویسٹ بلاک۔1، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 066 110

کُلیّات چودھری محمد علی رُدولوی

(15 مئی 1882 - 10 ستمبر 1959)

(جلد سوم)

ترتیب و تدوین

مسعود الحق

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومتِ ہند

ویسٹ بلاک-1، آر. کے. پورم، نئی دہلی- 066 110

Kulliyat-e-Chaudhry Mohammad Ali Rudaulvi Vol. III
Edited by
Masood ul Haque

پہلا ایڈیشن : 1100
سنہ اشاعت : ستمبر 2005 شک 1927
قیمت : -/172 روپے
شمار سلسلۂ مطبوعات : 1242
کمپوزنگ : پرنس گرافکس، نئی دہلی

ISBN : 81-7587-108-3 (Set)
ISBN : 81-7587-111-3 (Vol. III)

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 1، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی-110066
فون نمبر: 26103938، 26103381، 26179657، فیکس: 26108159
ای۔میل: urducoun@ndf.vsnl.net.in، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: فہمی کمپیوٹرس، جامع مسجد دہلی- 110006

پیش لفظ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ایک قومی مقتدرہ کی حیثیت سے کام کررہی ہے۔ اس کی کارگزاریوں کا دائرہ کئی جہتوں کا احاطہ کرتا ہے جن میں اردو کی ان علمی و ادبی کتابوں کی مکرّر اشاعت بھی شامل ہے جو اردو زبان و ادب کے ارتقاء میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں اور اب دھیرے دھیرے نایاب ہوتی جارہی ہیں۔ ہمارا یہ ادبی سرمایہ محض ماضی کا قیمتی ورثہ ہی نہیں، بلکہ یہ حال کی تعمیر اور مستقبل کی منصوبہ بندی میں ہماری رہنمائی بھی کرتا ہے اور اس لیے اس سے کما حقہ، واقفیت بھی نئی نسلوں کے لیے ضروری ہے۔ قومی اردو کونسل نضبہٖ منصوبے کے تحت عہدِ قدیم کے شاعروں اور نثر نگاروں سے لے کر عہد جدید کے شاعروں اور نثر نگاروں تک تمام اہم اہلِ فکر و فن کی تصنیفات شائع کرنے کی خواہاں ہے تاکہ نہ صرف اردو کے اس قیمتی علمی و ادبی سرمائے کو آنے والی نسلوں تک پہنچایا جاسکے بلکہ زمانے کی دستبرد سے بھی اسے محفوظ رکھا جاسکے۔

عہدِ حاضر میں اردو کے مستند کلاسیکی متون کی حصولیابی، نیز ان کی کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے، لیکن قومی اردو کونسل نے حتی الواسع اس مسئلے پر قابو پانے کی کوشش کی ہے۔ کلیاتِ چودھری محمد علی ردولوی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جسے کونسل قارئین کی خدمت میں پیش کررہی ہے۔

اہل علم سے گزارش ہے کہ کتاب میں کوئی خامی نظر آئے تو تحریر فرمائیں تاکہ اگلی اشاعت میں دور کی جاسکے۔

ایس۔ موہن

ڈائرکٹر انچارج

عرضِ مرتّب

کبھی کبھی خاموشی ہی آواز بن جاتی ہے۔ بات چیت دلچسپ ہوجاتی ہے۔ اگر کوئی موضوع نہ ہو۔ اسی طرح خط لکھنے کے لیے بھی کسی مخصوص خیال یا موضوع کی ضرورت نہیں ہوتی، خط اپنا مضمون خود پیدا کرلیتا ہے، ہاں زندگی سے دلچسپی اور اس کا احترام ضروری ہے کہ خطوط کا تانابانا زندگی کی چھوٹی چھوٹی بلکہ بظاہر معمولی باتوں ہی سے بُنا جاتا ہے۔ غالب کے خطوط اسی لیے اہم ہیں کہ ان میں نہ فلسفہ ہے، نہ استدلال، ایک باتیں کرنے والا ہے اور ایک ان باتوں کا سننے والا اور بس۔ چھوٹی چھوٹی باتیں جن میں زندگی کا لطف ہے چھوٹے چھوٹے راز جنھیں چھپائے رکھنے کا بھی جی چاہے اور جنھیں کسی سے کہنے کی خواہش بھی بے قرار کرے۔ رازوں کو چھپانے اور انھیں افشا کرنے کا یہی فیصلہ حسن عمل ہے اور اچھے خط کی تخلیق کی وجہ۔ اچھے خط ادبی کارنامے ہوتے ہیں، غالب کے خطوط اسی زمرے میں آتے ہیں — چودھری محمد علی کے خطوط؟ فیصلہ ہمیں اور آپ کو کرنا ہوگا۔

چودھری صاحب کے خطوط بھی اس لحاظ سے ہماری توجہ کے مستحق ہیں کہ جن خوبیوں نے خطوط غالب کو دوام بخشا، کم وبیش وہی خوبیاں ہمیں چودھری صاحب کے خطوط میں نظر آتی ہیں — چودھری صاحب کے ذہن و کردار کا فروغ ونشوونما روشن خیالی، وسیع القلبی اور وسیع المشربی میں ہوا یا یوں کہہ لیجیے کہ ان کا خمیر 'انسانیت' سے بنا۔

ان کے خطوط ان کی شخصیت کے آئینہ دار ہیں۔ خلوص، وضعداری، شگفتہ مزاجی، خوش ذوقی وخوش باشی کے ساتھ ساتھ جو ایک قلندرانہ شان ان کے رہن سہن اور ان کی رفتار و گفتار میں تھی اس سب کی جھلک ان کے ان خطوط میں دیکھی جاسکتی ہے۔ آپ ان خطوں میں اصلی محمد علی سے بالمشافہ مل سکتے ہیں۔

> ''......خطوں کو نجی ہونا چاہیے۔ نجی باتوں میں رنگارنگی، دلچسپی،
> تنوع اور عمومیت پیدا کرنا اچھے مکتوب نگار کا کام ہے۔ یہ ساری

خوبیاں از خود پیدا ہوجاتی ہیں شرط یہ ہے کہ وہ دیکھے اور محسوس کرے۔ دیکھنے اور محسوس کرنے سے اسلوب بنتا ہے، دیکھنے اور محسوس کرنے ہی میں جدت ہوتی ہے۔ دیکھنے اور محسوس کرنے ہی میں وہ بصیرت ہے جو جزو کو کل سے زیادہ حسین بنا دیتی ہے...... ایک اچھا مکتوب نگار ان نجی باتوں میں وہ رنگ بھر دیتا ہے کہ یہ باتیں ہمیں اپنی داستان معلوم ہونے لگتی ہیں......''۔
(خورشیدالاسلام 'تنقیدیں' (صفحہ ۱-۱۰)

غالبؔ کی طرح چودھری صاحب کے خطوط بھی اپنے اندر ایک دوست کا سا اپنا پن اور یگانگیت رکھتے ہیں۔ ان کے خطوط میں بلاغت تلاش نہ کیجیے یہ شاید ان میں ملے بھی نہیں، ہاں زندگی کی چاشنی ضرور مل جائے گی۔ لوگ شاید زندگی کو دور سے دیکھتے ہیں، وہ اسی قدر جلوے کے عادی ہوتے ہیں، غالبؔ سے پہلے شاید یہی عام چلن تھا .... زندگی کو برت کر کچھ کہنے والے کم لوگ ہوتے تھے، چودھری محمد علی رودولوی نے زندگی کو برتا اس کے نشیب کی اذیتوں کا لطف اٹھایا اس کے فراز کے خوش آئند دکھوں کا مزہ چکھا اور قطرے پر گہر ہونے تک جو کچھ گزری اسے بیان کردیا...... انھوں نے بھرپور زندگی گزاری اور فن کو زندگی پر فضلیت دینے کے بجائے زندگی کو اپنے فن کا وسیلہ بنالیا۔

ان کی یہی خوبی انھیں دوسرے خطوط نگاروں سے ممتاز کرتی ہے اور ان کے خطوط کو ادب کا درجہ دیتی ہے۔

آخر میں چند الفاظ خطوط کے اس مجموعے کے بارے میں یہ خطوط چودھری صاحب کی سب سے چھوٹی بیٹی ہما بیگم اخلاق حسین نے شائع کیے تھے۔ 1977 میں اردو اکیڈمی سندھ کراچی نے محترمہ بیگم صاحبہ کی فرمائش پر اور ان کے اشتراک سے ایک اضافہ شدہ ایڈیشن شائع کیا۔ مجموعے میں خطوط کسی خاص ترتیب سے نہیں ہیں۔ میں نے انھیں تاریخ وار کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس طرح شاید ان کی افادیت میں کچھ اضافہ ہوجائے اور سماجی اور تہذیبی تاریخ کے رسیا کے لیے شاید کچھ مواد بھی مل جائے۔

خطوط میں تقریباً دو سو افراد کے نام آئے ہیں۔ میں ان میں سے بہت سوں کو جانتا بھی نہیں ہوں۔ پھر بھی میں نے کم و بیش اَسّی افراد سے متعلق معلومات حاصل کرکے ان کا

انتہائی مختصر تعارف لکھ دیا ہے۔ ان میں تمام لوگ چودھری صاحب سے قریب کے لوگ ہیں اور تقریباً سارے لوگ پاکستان میں تھے یا ہیں۔ ان کے بارے میں یہ معلومات چودھری صاحب کے نواسے ابوالفضل صاحب نے دی ہے۔ جو کراچی میں رہتے ہیں میں ان کا انتہائی ممنون ہوں۔ اس سے خطوط کی معنویت میں بھی اضافہ ہوا ہوگا اور اس کے سیاق وسباق بھی زیادہ واضح ہوئے ہوں گے۔

ایک بات اور۔ پاکستان میں شائع ہونے والے اضافہ شدہ ایڈیشن میں خطوط کی تعداد ایک سو اکیاسی ہے جبکہ اب یہ تعداد بڑھ کر دو سو دس ہوگئی ہے۔ اس اضافے کے لیے میں شارب ردولوی کا مشکور ہوں۔ اضافہ شدہ سارے خطوط ان ہی کی عنایت ہے۔

ہما بیگم اخلاق حسین

25 اگست 1907 ۔ 14 اگست 2002

چودھری صاحب کی سب سے چھوٹی بیٹی۔ الموڑے میں پیدا ہوئیں اور اس کی برف پوش پہاڑیوں کی نسبت سے ہما نام رکھا گیا۔ اصلی نام رقیہ تھا۔ چودھری صاحب کے خطوط ''گویا دبستاں کھل گیا'' کا مجموعہ مرتب کر کے اور شائع کر کے آپ نے اردو ادب کی گراں قدر خدمت انجام دی، علمی اور ادبی کاموں سے ایک فطری لگاؤ تھا، جدید تعلیم حاصل کرنے کے باوجود دین داری کے ذوق کے ساتھ تبلیغ دین کا بھی شوق تھا۔ ایک کتاب ''بھولی ہوئی باتیں'' لکھی ہے جس میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا وہ جذبہ کارفرما ہے جس کو امت مسلمہ کی اکثریت بھلا چکی ہے۔ اس کے علاوہ ایک کتاب ''خوش آں ہوائے کز یاد خوش آید'' لکھی۔ انسانی زندگی میں دھنک کی طرح کئی رنگ آمیزیاں اپنی یادداشتیں چھوڑ جاتی ہیں۔ اس کتاب کو اسی زمرے میں سمجھ لیجیے۔ ایک تیسری اور ضخیم کتاب ''جوئبار'' کے نام سے ہے۔ یہ متعدد شعراء کے کلام کا انتخاب ہے۔ یہ ان کی وہ تصنیفات ہیں جن کا مجھے علم ہے۔ کچھ اور چیزیں بھی ہوسکتی ہیں۔

(مرتب)

گویا دبستاں کھل گیا

یعنے

ادیب شہیر چودھری محمد علی صاحب ردولوی کے مکاتیب کا ایک منتخب مجموعہ

جسے

اُن کی چھوٹی صاحبزادی محترمہ ہما بیگم و بیگم جسٹس سید اخلاق حسین نے

مرتب کیا

اور ان ہی کی فرمائش اور اشتراک سے

اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی

نے شائع کیا

اضافہ شدہ ایڈیشن

۱۹۷۷ء

کتابت

منشی احمد علی خوشنویس

طباعت

باب الاسلام پرنٹنگ پریس آرام باغ کراچی

انتساب

اپنی بُوبُو مرحُومہ (وَالدہ) کے نام

جن کی نسبت

میرا ایمان یہ ہے کہ اُن سے کبھی کسی کو دُکھ

نہیں پہنچا

اور نہ گناہ سرزَد ہوئے

دَراز دل بست دلم باسرِ زُلف پیوند

تا ابد سرنگُشَد وز سرِ پیماں نرَوَد

فہرست

ضمیمہ:

متفرقات:

پیش لفظ

پھول وہ جو مہشیر چڑھے۔ کام وہ اچھا جس سے کسی کو فائدہ پہنچ جائے۔ کتاب لکھنے کا مقصد بھی وہیں تک جائز جہاں تک اس میں تعمیری خیال مضمر ہو۔ یہ ضروری نہیں کہ بڑے بڑے مسائل ہی پر کتاب لکھی جائے۔ دنیا میں وہی شخص جو بڑی بات کرتا ہے ایک چھوٹی سی بات کرنے پر مجبور ہوتا ہے، لہٰذا زندگی کے ہر چھوٹے بڑے پہلو کو کافی اہمیت حاصل ہے۔ ہر شخص بڑے کام نہیں کرسکتا۔ البتہ چھوٹے کام شوق اور سلیقے سے کرنے کی کوشش تو کر ہی سکتا ہے۔

یہ خطوط معلوم نہیں کسی کو پسند آئیں گے یا نہیں اور پسند آئے بھی تو کس حد تک۔ ان خطوط کو شائع کروانے میں میرا اپنا ذاتی مقصد یہ ہے کہ اگر انھیں ضائع ہونے سے بچا لیا جائے اور اکٹھا کر کے دنیائے ادب کو دے دیا جائے تو پرکھنے والے کچھ نہ کچھ پرکھ ہی لیں گے۔ میرا خیال ہے کہ ان خطوط میں تحریر سے زیادہ گفتگو کا انداز نمایاں ہے۔ زبان سلیس اور بامحاورہ ہے۔ موضوعاتِ کلام دلچسپ، رنگین اور زندگی کی حقیقتوں سے مملو ہیں۔

چودھری صاحب کی شخصیت کی خصوصیات جو ان خطوط میں ظاہر ہوتی ہیں ان میں بعض ایسی ہیں جنھیں کوئی محسوس کیے بغیر رہ ہی نہیں سکتا ہے۔ وہ اپنے ملنے والوں سے بڑے جی سے ملتے ہیں۔ گفتگو میں خلوص ہوتا ہے۔ اپنے اور مخاطب کے تعلقات پر اعتماد یہاں تک ہوتا ہے کہ خطوط میں جہاں دیکھیے دل کے پردے اٹھے نظر آتے ہیں۔ قریب آکر یوں باتیں کرتے ہیں کہ دوستی کا حق ادا ہوجاتا ہے۔ یہاں تک کہ خفگی میں بھی ان کی یگانگت کا انداز جھلکتا ہے۔

بہرکیف یہ تو میرے اپنے دل اور نگاہ کا کھیل تھا، جس کے متعلق میں کوئی دعویٰ نہیں کرسکتی ہوں، البتہ اس کا یقین ہے کہ انتہائی نیک نیتی سے چودھری محمد علی صاحب ردولوی کے خطوط کا یہ مجموعہ نظرثانی کر رہی ہوں، میرا ارادہ ۱۹۳۰ء-۱۹۳۲ء سے تھا کہ ان خطوط کو

ادبی دنیا سے روشناس کرایا جائے۔ اس وقت میں نے تہیہ کرلیا تھا کہ میاں جان (چودھری محمد علی صاحب) کے خطوط چھپواؤں گی۔

آج بحمداللہ وہ ارادہ پورا ہو رہا ہے اور اسی عقیدت کے ساتھ ان کی خصوصیات تحریر پر ایمان مستحکم ہے۔

ہمارے مہربان مولانا صلاح الدین احمد صاحب بھی چودھری صاحب کے بڑے دوستوں اور قدردانوں میں سے ہیں، یہاں تک کہ انھی کے ذریعے سے یہ کتاب چھپی اور اس کی تمہید لکھنے کی ذمہ داری بھی یہ کہہ کر قبول کرلی کہ ''یہ میرا فرض ہے، اور میں اسے ضرور انجام دوں گا۔'' اس سے زیادہ قدردانی اور کیا ہوسکتی ہے۔ دیباچہ انھوں نے لکھا مجھے نہیں معلوم کہ کیا لکھا (کیونکہ میں نے ابھی دیکھا ہی نہیں ہے) البتہ یہ معلوم ہے کہ جو لکھا ہے وہ ضرور صحیح ہوگا اور ایک بڑے نباض کی حیثیت سے لکھا ہوگا۔

ان کی عنایات کا شکریہ ادا کروں یہ بدتمیزی ہوگی۔ صرف دعا گو ہوں اور دعا گو رہنے کی متمنی۔

ان خطوط سے متعلق پڑھنے والوں سے اتنی التجا اور ہے کہ ''انسان ناقص ہے'' پر نظر رکھتے ہوئے میری غلطیوں کو ازراہِ کرم معاف کردیں۔

بیگم ہما اخلاق حسین

اس کتاب میں

چودھری محمد علی صاحب ردولوی ہمارے ان چند اکابرِ ادب میں سے ہیں جن کی ذات میں مشرقی وضعداری اور مغربی آزاد خیالی کی بہترین کیفیتیں ایک ہی وقت میں نہایت خوش امتزاجی سے جمع ہوگئی ہیں۔ حسن اتفاق سے آپ کے کردار کی تربیت ایک ایسے زمانہ میں ہوئی جو ہندوستان میں لبرلزم کے فروغ کا زمانہ تھا۔ مغربی تہذیب کی روشنی مشرقی تمدن کے ایوانوں میں بڑی تیزی سے نفوذ کر رہی تھی، اور ان مٹتے ہوئے نقوش پر غالب آرہی تھی، جو ہماری ہزارسالہ روایات کی یادگار تھے۔ اسی عالم میں ہمارے معاشرہ کے ایک بہت بڑے طبقے نے اس روشنی کو نہ صرف اپنی آنکھوں میں جگہ دینا بہتر سمجھا بلکہ اپنے دلوں کے خلوت کدے بھی اس کے لیے کھول دیے۔ ایک اور طبقہ ایسا تھا کہ جس نے اس سے بچنے کے لیے ان تاریک گوشوں کی طرف فرار اختیار کیا جن پر فرسودگی و پسماندگی کی دبیز چادریں تہہ بہ تہہ پڑی ہوئی تھیں لیکن ایک قلیل التعداد گروہ ایسا بھی تھا جس نے اس سیلاب نور کو متبسم لبوں سے خوش آمدید تو کہا مگر اس کے سامنے سربسجود نہیں ہوا بلکہ اسے اپنے آئینہ دل میں صرف اس حد تک انعکاس پذیر ہونے دیا جس حد تک ہماری تہذیب، ہمارا اپنا ادب اور ہماری اپنی روایات اسے قبول کرنے پر آمادہ ہوئیں۔ اس مختصر گروہ کے رہبروں کے نام انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ اور میری ناقص رائے میں چودھری محمد علی کا نام ان میں سرِفہرست ہے۔

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا چودھری صاحب کے کردار کا فروغ لبرلزم کی فضا میں ہوا اور یہی وجہ ہے کہ ان کی تمام تصانیف اور تخلیقات میں لبرلزم کا عنصر بدرجۂ غایت نمایاں ہے۔ مجموعۂ زیرِنظر میں کہ ان کے نجی خطوط کا ایک دلآویز مجموعہ ہے، لبرلزم کا یہ رجحان اپنے عروج پر نظر آتا ہے، وہ اپنی بیٹی سے بھی اسی انداز میں گفتگو فرماتے ہیں جسے

وہ احباب کے لیے اختیار کرتے ہیں اور اس بارے میں کسی تصنع یا تورّع کا دور دور تک سراغ نہیں ملتا اور یہی کیفیت ان کے اخلاص اور ان کے صدق کی آئینہ دار اور ان کی روانیِ نگارش اور خوبیِ تحریر کی آفریدگار ہے۔

جن صاحبوں نے مکاتیب غالبؔ کے بعد خطوط کے اُن متعدد مجموعوں کا مطالعہ کیا ہے جو وقتاً فوقتاً گزشتہ پون صدی میں ہمارے سامنے آئے ہیں، وہ مجموعۂ زیرِنظر کو دیکھنے کے بعد غالباً میرے اس خیال کی تائید فرمائیں گے کہ جن خوبیوں اور خصوصیات نے غالبؔ کے خطوط کو دوام بخشا وہ ایک لباس تازہ میں اس مجموعہ کی زیب و زینت ہیں۔ وہی سلاست، وہی بے تکلفی، وہی شگفتگی، وہی برجستگی اور سب سے بڑھ کر وہی احساس یگانگت اور وہی کیف مخاطب جو اردوئے معلّٰی اور عودِ ہندی کے مکاتیب میں پایا جاتا ہے۔ ایک بہت بڑی حد تک ان خطوط میں بھی اپنی پوری رعنائی سے جلوہ افروز ہے اور ازبسکہ ان کے جمع کرنے کا کسی کو خیال تک نہیں تھا اور ان کی نوعیت بھی سراسر نجی ہے۔ اس لیے ان کیفیتوں کی قدر و قیمت اور بھی بڑھ گئی ہے۔

مکاتیب محمد علی کی ادبی خوبیوں کی نسبت صرف اسی قدر کہنا کافی ہوگا کہ چودھری صاحب کو زبان و بیان کی لطافتوں اور نزاکتوں پر جو بے پناہ قدرت حاصل ہے، وہ اس مجموعے کے قریب قریب ہر خط میں جھلکتی ہے اور بعض مکاتیب میں تو اس کے کرشمے ہر ہر سطر پر دل کا دامن کھینچتے ہیں اور پڑھنے والے کی نظر اس لطافت زار میں گم ہوکر رہ جاتی ہے۔

چودھری صاحب کی نگارش کی ایک نہایت اہم خصوصیت ان کی وہ لطیف حس مزاح ہے جو اعلیٰ ادب کی نادر خصوصیات میں شمار ہوئی ہے، چونکہ وہ فطرتاً ایک نہایت خوش نظر فنکار ہیں۔ اس لیے ان کی نگاہ کسی صورت حال کے مضحک پہلو پر سب سے پہلے پڑتی ہے، اور یہ پہلو ان کی نگاہ پڑتے ہی جگمگا اٹھتا ہے اور ان کے ہر پڑھنے والے کے لیے حظ و انبساط کی ایک مسلسل کیفیت فراہم کرتا چلا جاتا ہے۔

محترمہ ہما بیگم نے یہ مجموعہ مرتب فرما کر درحقیقت اردو ادب کی ایک گراں قدر خدمت سرانجام دی ہے اور مجھے یقین ہے کہ اہل ذوق اس یادگار مجموعے کے مطالعہ سے

نہ صرف محظوظ و مستفید ہوں گے بلکہ اس کے اوراق میں ایک رخصت ہوتی ہوئی تہذیب اور ایک گم شدہ تمدن کے نقوش جمیل کو رخشندہ و تابندہ اور ایک دلآویز شخصیت اور ایک سحر نگار ادیب کے نوادر احساس اور لطائف صحبت کو ہمیشہ زندہ اور پائندہ پائیں گے۔

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

صلاح الدین احمد

تعارف

(دوسری اشاعت پر)

اردو کے منتخب شہ پاروں میں خطوط کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا نہ خطوط کے انتخاب میں چودھری محمد علی کے خطوط سے چشم پوشی روا رکھی جاسکتی ہے۔ دونوں باتیں قرین انصاف نہ ہوں گی۔ جس طرح نثر کی تاریخ میں خطوط کا ایک خاص مقام ہے اسی طرح اس صنف خاص میں چودھری صاحب کا بھی ایک مرتبہ ہے جس کے آس پاس دور تک خلا دکھائی دیتا ہے۔

اردو خطوط نگاری کی ابتداء اور انتہا غالبؔ پر ہوئی۔ یہ بات جو خطوط نگاری کے ضمن میں بے اختیار قلم تک آتی ہے دراصل ایک انداز ستائش ہے اور ایک کلیہ کے طور پر بھی ان معنی میں چنداں غلط نہیں کہ خطوط نگاری کے جس اسلوب کی طرح غالبؔ نے ڈالی تھی وہی آج تک اس صنف تحریر کا مرغوب و پسندیدہ انداز ہے۔

سانحوں نے اس پرتکلف انداز نگارش کو یکسر ختم کردیا تھا جس سے خطوط نگاری اس وقت تک عبارت سمجھی جاتی تھی۔ اس کے بالمقابل جو دبستاں انھوں نے کھولا اس نے ان کے بعد بھی بہت کچھ بہار دکھائی۔

چنانچہ خطوط نگاری ادب کی ایک مستقل صنف اور اردو ادب کی تاریخ کا ایک مستقل باب بن گئی ہے۔ اس میں انداز اور موضوعات کی بڑی بوقلمونی ملے گی۔ تاریخ اور تحقیق کے سلسلے میں بھی ادیبوں کے خطوط کا وہ ذخیرہ جو اب تک منظرعام تک آیا ہے ایک گراں قدر سرمایہ ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ غالبؔ کے بعد نجی خطوط میں تحریر کی یہ دلآویزی اور لطف مطالعہ جو چودھری محمد علی ردولوی کے خطوط میں ملتا ہے اور کہیں نہیں ملتا۔

ان کے خطوط کی دلچسپی غالبؔ کے خطوط کی طرح علمی اور تاریخی افادیت کے علاوہ ان کے خلوص و نگارش اور لطافت اظہار پر قائم ہے۔

اردو خطوط کے سرمایہ میں علمی اور سیاسی خطوط بھی ہیں جیسے کہ علامہ اقبال اور مولانا

محمد علی کے خطوط اور رومانوی بھی مثلاً شبلی کے خطوط افسانوی خطوط سے یہاں بحث نہیں ہے جیسے کہ قاضی عبدالغفار یا ڈاکٹر عندلیب شادانی کی افسانوی تصنیفات جو خطوط کی شکل میں ہیں۔ ان کے علاوہ بھی بعض مصنفین کے خطوط دانستہ ادبی کاوشوں کی حیثیت رکھتے ہیں، اور ادب پاروں کے طور پر تحریر کیے گئے ہیں، جیسے کہ علامہ نیاز فتح پوری کے خطوط۔ بعض خطوط سوانح سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کی اہمیت صرف اس قدر ہوتی ہے کہ ان سے مصنف کے شخصی کردار پر روشنی پڑتی ہے لیکن ہر طرح کے خطوط ادبی نقطۂ نظر سے معتبر یا قابل لحاظ نہیں ہوتے۔ خواہ انھیں ادیبوں ہی نے لکھا ہو۔ ضروری نہیں کہ کوئی بڑا ادیب اچھا خطوط نگار بھی ہو۔ خطوط کے مطالعے کا لطف جب ہے کہ نجی ہوں، بے ساختہ و بے تکلفانہ ہوں اور بہر صورت دلچسپ اور لائق مطالعہ انشاء پردازی سے الگ رہتے ہوئے بھی ادبیت سے معرّا نہ ہوں۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی بیٹی اندرا کے نام جو خطوط لکھے وہ دراصل خطوط کی ذیل میں نہیں آتے کہ یہ خطوط نگاری محض تاریخ نگاری کا ایک بہانہ تھی۔ اس تصنیف کو خطوط کا پیرایہ دے کر پنڈت جی نے گویا اسے اپنی بیٹی کے نام سے منسوب یا معنون کر دیا ہے۔

چودھری محمد علی کے خطوط (ہما بیگم) کے نام کسی علمی تصنیف یا محض ادب نگاری کا حیلہ و بہانہ نہیں اور پھر بھی عین ادب قرار پاتے ہیں۔ پرلطف و دلآویز ہونے کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں فکر انگیز بھی ہیں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کی اپنی شخصیت ان میں پوری طرح جھلک جاتی ہے جو ان تحریروں سے کچھ کم دلآویز نہ تھی۔ ادیبوں کی شخصیت کے بارے میں کوئی کلیہ قائم نہیں کیا جاسکتا کہ وہ کیسی ہوتی ہے کیسی نہیں ہوتی۔ دوسرے افسانوں کی طرح اس زمرے میں بھی بھانت بھانت کے کردار نظر آتے ہیں۔ کہیں لاؤبالی پن ملے گا تو کہیں بااصول زندگی اور متانت و سنجیدگی بھی۔ کہیں انسانی کمزوری اپنا جلوہ دکھائے گی تو کہیں الوہیت پرستی نظر آئے گی، مگر حق یہ ہے کہ جب تک ادیب اپنی ہی ذہنی سطح پر بھرپور اور متنوع زندگی نہ گزارے جو گوناگوں تجربات سے مالامال ہو اس کی ذہنی اور اخلاقی تربیت اور کردار تشنۂ تکمیل رہتا ہے۔ چودھری صاحب ایک پختہ و شائستہ کردار کے انسان اور بڑی دلآویز شخصیت کے مالک تھے ان کی آنکھ میں موہنی تھی اور دل ایسا کھلا ہوا تھا کہ جو کوئی ان سے مل لیتا ان کے لطف و مہر کا گرویدہ ہو جاتا۔

ہر دل کو اس چشم کرم سے تھا یوں لگاؤ
گویا کہ وہ ہمیں سے لگائے ہوئے ہے دل

خلوص، وضع داری، شگفتہ مزاجی، خوش ذوقی و خوش باشی کے ساتھ ساتھ جو ایک قلندرانہ شان ان کی رفتار و گفتار میں تھی اس نے ان کی شخصیت کو نہایت پرکشش اور یگانۂ روزگار بنا دیا تھا۔

ان کے خطوط کی اشاعت سے ہمارے ادبی سرمایہ میں گراں قدر اضافہ ہوا ہے لیکن دراصل اہل ذوق کی تشنگی دور نہیں ہوئی۔ ایک صورت تو یہ تھی کہ اس مجموعے کو صرف انھیں خطوط تک محدود رکھا جاتا جو ہما بیگم کے نام لکھے گئے، لیکن اس کے بعد ایک زیادہ جادۂ تالیف کی ضرورت باقی رہتی۔ ابھی چودھری صاحب کے بعض جاننے والے موجود ہیں جنھیں ان کی ذات سے کسی نہ کسی طرح کا تقرب رہا ہے جستجو کی جائے تو شاید اور بھی کچھ خطوط میسر آ جائیں۔ سردست اسی مختصر مجموعے کو غنیمت شمار کیے بغیر چارہ نہیں۔

چودھری صاحب مرحوم کی دوسری دل پذیر تصانیف بھی دوبارہ اشاعت کی محتاج ہیں جن کا سلسلہ خاصا دراز ہے ان کا اہل ذوق کی نظروں سے اوجھل رہنا اردو ادب اور خود ان تصانیف پر بڑا ظلم ہے۔

(شان الحق حقی)

چودھری محمد علی رُدولوی

(15 مئی 1882 — 10 ستمبر 1959)

(۱)

علن کے نام

نومبر ۱۹۲۵ء

میری پیاری علّن [(1)] ...... دعاہا...... بیکار خط نویسی کا عارضہ مجھ کو نہیں ہے لیکن جب دل پر اثر ہوتا ہے تو جس طرح بیماری میں دوا ڈاکٹر کی فکر کرتا ہوں اسی طرح خط بھی لکھتا ہوں۔ کوتاہ بیں لوگ خط لکھنا محبت کی کسوٹی جانتے ہیں لیکن ہم تم لوگ عقلمند لوگ ہیں۔ ہر چیز کی قیمت وہی ٹھہراتے ہیں جو مالیت کے لحاظ سے مناسب ہوتی ہے۔

تمھاری تفریح کے لیے بُوبُو [(2)] کی ڈائری سے تاریخ وار احوال لکھتا ہوں جس سے تم کو شاید کچھ گھر کا مزہ مل جائے۔ تمھارے جانے کے دوسرے دن زائرن اپنے بھائی کے یہاں گئیں۔ لوگوں کو بڑا رنج ہوا گو کہ ابھی یہ نہیں معلوم کہ وہ صرف بھائی کے یہاں جاکر واپس آئیں گی یا یہ شوہر کے یہاں جانے کی پہلی منزل ہے۔ مگر لوگوں کے چہرے اداس ہیں۔ مجھ کو بھی رنج ہے مگر اب اس کی وجہ دوسری ہے۔ یعنی شام کو جب دل گھبراتا تھا تو خیال کرتا تھا کہ اللہ میاں زائرن غش آجائے۔ ابھی دعا ختم نہ ہوتی تھی کہ آدمی بلانے آجاتا تھا۔ اس وقت خیال ہوتا تھا کہ کاش میں نے سلطنت مانگ لی ہوتی۔ پھر اپنے دل کو تسکین دے لیتا تھا کہ تب نہ قبول ہوتی۔ قبول اگر ہوتی ہیں تو ایسی ہی دعائیں۔

حریف مطلب مشکل نہیں فسون نیاز
دعا قبول ہو یارب کہ عمر خضر دراز

خیر اللہ یہی دعا قبول کرلے کہ کسی دوسرے ہی کو غش آنے لگے۔

۴؍نومبر...... نوشاد کو میں نے تمھارے سامنے ہی معطل کردیا تھا۔ آج انھوں نے استعفا بھیج دیا اور میں نے منظور بھی کرلیا، لیکن یقیناً نعمت وغیرہ سفارش کریں گے اس وقت دیکھا جائے گا۔ میری کمر میں چک آگئی ہے۔

۵؍نومبر...... تمھاری بُوبُو کو خفیف تنفس رہا۔ ۶؍نومبر...... غضنفر صاحب کا خط فیض آباد سے آیا۔ میاں جان احمد علی، صابر ہمارا کھیل دیکھنے آئیں۔ دروازے پر بازار گرم ہے اور لوگ سودا کر رہے ہیں۔ ہر چہار طرف لرزے کا بازار گرم ہے اور لوگ جگر طحال خرید رہے ہیں۔

۷؍نومبر...... آج گھر میں جڑاول خریدی گئی۔ احمد علی فیض آباد ہاکی میچ دیکھنے گئے۔

۸؍نومبر...... رات لڈن [3] فیض آباد سے رودولی چلے اور سوتے ہوئے لکھنؤ پہنچے۔ آٹھ بجے کی گاڑی پر پھر واپس آئے اور 12؍بجے کی گاڑی سے پھر واپس گئے۔ دوپہر کی گاڑی سے ہانپتے کانپتے میاں سلمان [4] آئے۔ ارے میاں یہ کیا ہوا۔ جی زکام ہوگیا اور سانس بھی تو پھولتی ہے۔ جی ہاں اور دیکھیں بخار تو نہیں ہے۔ لیجیے بخار بھی تو ہے۔ رات بھر تنفس، حکیم ڈاکٹر، پہلے میری دوا ہوئی جب کارگر نہ ہوئی تو ڈاکٹر نیولی دانت نکالتے ہوئے آئے۔ دوسرے دن افاقہ ہوا۔ الحمدللہ میاں تفضل [5] بھی...... ہی آئے۔ ناحق چوٹ جولاہا کھائے۔ کرگا چھوڑ تماشے جائے، رنگ سونلا گیا ہے۔ دس دن کے لیے آئے ہیں اور دل کی آنکھیں پھاڑ پھاڑ تم کو ڈھونڈھ رہے ہیں۔ صفیہ [6] نے شرم حیا چھوڑ کر طلعت [7] کو گود میں اٹھا لیا۔ وہ رونے لگی۔ نہ معلوم دودھ مانگتی تھی کہ انھوں نے چٹکی بھنبھوڑ کھائی۔ ہما کا لرزہ مفارقت کر گیا مگر اس نقاہت سے سلام کو ہاتھ اٹھایا کہ میاں تفضل کھسیانے ہوگئے۔ زبان حال سے گویا ہوئے کہ ان دونوں کا یہ حال ہے۔ اَلّن اپنی سسرال گئیں، اب میں کس کو پڑھاؤں۔

۹؍نومبر...... آج اخلاق احمد علی کے دوست آئے۔ اب وہ ماشاء اللہ بی اے اور بیرسٹر...... محمد علی نے احمد علی سے ان کو چھین لیا۔ گویا محمد علی کا سن 21 برس کا ہے۔ ! وہ غریب یکبارگی 43 برس کا ہوگیا جس کو اپنی عمر اور تقاضائے عمر کا احساس نہ ہو وہ آدمی دوکوڑی کا۔

۱۰؍نومبر...... آج اَلّن کا خط مرادآباد سے آیا گجن کا خط اٹاوے سے آیا۔ علّن اب وہاں گھبراتی ہیں۔ ان کی بوبو یہاں گھبراتی ہیں۔ محمد علی بہت پریشان ہیں۔ علاقے کا حساب پھر بگڑ گیا۔ اس طرف محمد علی نے کوئی بیجا خرچ نہیں کیا بلکہ روپے کے معاملے میں

بہت تکلیف اٹھاتے ہیں۔ یہ تمھاری بوبو نے ڈائری میں لکھا ہے۔ تمھارے میاں جان کہتے ہیں۔ جب سے جاے بال تب سے یہی حوال۔ بنا ہی کب تھا جو انتظام اب بگڑ گیا۔

۱۱رنومبر...... کوڑھ گیا کھاج آئی۔ غریب احمد علی کو تنفس نے چھوڑا لرزے نے پکڑا۔ رات کو دوا محمد علی کی ہوئی۔ صبح کو ڈاکٹر پھاند پڑے۔ نہ معلوم کس کی دوا نے فائدہ کیا۔ جادی[8] بات بناتی ہے اور دونوں کے منھ پر دونوں کی ایسی بات کرتی ہے۔ اس کو سلمان کی تندرستی سے غرض ہے کسی سے خدا واسطے کی لڑائی کاہے کو مول لے۔

۱۲رنومبر ...... آج اگہن کا پہلا دن ہے۔ میرے ورم جگر زیادہ ہوگیا۔ جگر ہما اور صفیہ کو بھی ہے۔ یہ بیان تمھاری بوبو کا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمھاری بوبو کی بیماری اختیاری ہے جس کا دوسرا نام ہسٹریا ہے کیونکہ ہمیشہ موقع پر اچھی ہوجاتی ہیں۔ ابھی گھر میں کوئی زیادہ بیمار پڑے ابھی یہ اچھی ہوجائیں۔ بیاہ، کام، کاج میں کبھی تم کو یاد ہے کہ تمھاری بوبو نے چار آدمیوں کا کام تنہا نہ کیا ہو۔ خیر یہ بیماری بھی غنیمت ہے اور یہ تندرستی بھی اچھی ہے۔ اکثر بی بیوں کو دیکھا ہے کہ اس سے کم بیماری میں ساتھ چھوڑ کر انتقال کرجاتی ہیں۔ اس وفادار کی وفاداری دیکھئے کہ میرے بڑھاپے کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔

تقیہ ماشاء اللہ اچھی ہیں۔ اب ان کو کھانے کی ترکیب معلوم ہوگئی ہے مگر نگلنے کی ادگت ابھی نہیں آئی ...... ستارن[9] ان کو آٹے کی گُلّی تل کر دے دیتی ہیں اور وہ مزے سے کھترکھتر کر کھاتی جاتی ہیں۔ ان کے جی دیکھتے جاتے ہیں جب حلق میں جاکر اٹکتی ہے تب انگلی سے نکال لیتے ہیں اور پھر بھی سبق نہیں لیتیں ...... میری کمر میں ابھی تک کھٹک باقی ہے۔

تمھارے لینے کے لیے 14 کو آدمی روانہ ہوگا۔ یعنی جب تم یہ خط پڑھتی ہوگی تو آدمی تم سے قریب ہوتا جائے گا۔ تمھاری بوبو کہتی ہیں کہ اپنی ضروری چیزیں لیتی آنا۔ میں ایسی لغو بات کاہے کو کہتا۔ کیا علن ہماری کوئی بیوقوف ہیں جو ایسا کریں گی۔

موقع کی بات نہ بھولنا اپنی نندوں کو اپنی بوبو کی طرف سے دعا اور اپنی ساس کو سلام کہہ دینا۔ ابرار تم کو بہت یاد کرتی ہیں...... میرا اِسن جو آپا[10] کے پاس کام کرتی ہے۔

ابرار کا کھانا نہیں پکاتی۔ میر اسن کی ذات اس کا اعتبار ہی کیا۔ ابرار آج کل خود محنت کرتی ہیں اور پریشان نہیں ہوتیں۔

بندر بہت دق کرتے تھے۔ ایک بندر گھر میں میرے ہاتھ سے مارا گیا۔ ایک بندر بسن نے باغ میں مارا۔ زخمی بندروں کے پاس ان کے اعزاء برادری جمع ہوئے۔ جس کو جتنا واسطہ تھا ویسا برتاؤ کیا۔ ایک نے منہ چھوکر دیکھا، ایک نے ہاتھ اٹھایا۔ بہت سے دور دور بیٹھے رہے۔ کچھ قریب بیٹھے رہے۔ جب مر گیا سب چلے گئے۔

مرنے کے بعد ساتھ کسی نے دیا نہ شاؔد
جو حد کا یار غار ہوا قبر تک گیا

جابر نے الگ خط بھیجا ہے جو پہنچا ہوگا۔

تمھارا نالائق

باپ

(غیر مطبوعہ)

''سرخ و سفید رنگ، خوب گھنی سیاہ بڑی بڑی مونچھیں۔ ململ کا کرتہ اس پر انگرکھا۔ بڑی مہری کا چھالٹین (لٹھے) کا پاجامہ۔ کبھی شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ۔ ایک شاندار ملازم ساتھ، لڈوں کی ہانڈی تھامے ہوئے۔ بڑے بے تکلفانہ انداز میں پھاٹک میں داخل ہوتے، ان کی غیر معمولی شوخی ظرافت اور کھلے ہوئے ہاتھ کی بدولت بچوں، بوڑھوں اور نوکروں سبھی کو ان کی آمد کی خوشی ہوتی۔ بزرگوں تک کو تحفے تحائف سے نوازتے، نوکروں پر انعام و اکرام کی بارش ہوتی۔ اور بچے مٹھائی کی ہانڈی فوراً اُچک لیتے.. ''

(انیس قدوائی: ''اب جن کے دیکھنے کو...'' صفحہ 53)

آل رضا[11] کے نام

عزیزی الّن میاں، دعا!

دل کے تقاضے سے اس دن بھی لکھا تھا، آج بھی لکھتا ہوں۔ لیکن آج جانتا ہوں کہ خط لکھ رہا ہوں۔ اس شاعری کی مجھ کو خبر نہ تھی۔ جب سنتا تھا کہ جناب سید آل رضا صاحب کی تعریفیں مشاعرے میں ہوئیں، دہل جاتا تھا کہ ایک نہ ایک دن ہم کو بھی سننا پڑے گا۔ اب جو دیکھا تو یہ دعائیں مانگتا ہوں کہ ہر دل والے کو یہ شاعری سننا نصیب ہو۔ بوڑھا آدمی ہوں، مگر پڑھنے میں دو بار آواز گرفتہ ہوگئی۔ دو مرتبہ آنکھوں میں آنسو آگئے۔

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

میں یہ نہیں کہتا کہ نوائے رضا میں ہر چیز نئی ہے لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ دل کا زبان داں دل ہوتا ہے اور اس مجموعے کے اشعار اسی مُنصہ گوش کے 'کام کے' ہیں۔ اچھی طرح سے یاد نہیں ایمرسن نے شاید شیکسپیئر کے مضمون میں کہیں ذکر کیا ہے کہ خیال کسی کی مِلک نہیں، جو اس کو اپنا کرلے اس کا ہے۔ گویا یہ ایک تلوار ہے جو اس کا گھائل ہولیتا ہے اسی کو عطا ہوتی ہے۔

مثال کے طور پر کون شعر لکھوں۔ پوری کتاب ایک رنگ میں رنگی ہوئی ہے جس طرح کی طبیعت جس وقت ہوتی ہے اسی طرح کا شعر اس وقت اثر کر جاتا ہے۔ میں جن اشعار پر رو دیا تھا وہ یہ تھے:

زندگی ختم جہاں کی، وہ جگہ پھر نہ ملی
تیرے کوچے سے اٹھائے لیے جاتے ہیں مجھے
شرم کہاں کی، شرم گنوا کر یہ بھی مار ہے قسمت کی
بھیک جو منھ مانگی لینے میں ہاتھ بڑھائے اور رہ جائے

حافظ کے یہاں ایک غزل ہے قطعہ بند جس کا مطلع ہے۔

در سرائے مغاں رفتہ بود آب زدہ
نشستہ پیر و صلائے بہ شیخ و شیاب زدہ

اس میں ایک شعر ہے:

وصال دولت بیدار ترسمت ندہند
کہ خفتۂ تو در آغوش بخت خواب زدہ

گو آپ کے دوسرے شعر سے اس کا مضمون کسی قدر علیحدہ ہے۔ لیکن جو اس کو سمجھتا ہوگا وہ اس شعر کا بھی مزا اٹھالے گا۔ ہومر سے لے کر اہسن تک جس چیز کی تعریف ہوئی ہے وہ مسائل کو نظم کر دینے کی نہیں ہے۔ دل کی کیفیات کی صحیح ترجمانی کی ہے۔ آپ کا یہ شعر ؎

ہیں محبت میں مزے دنیا کے لیکن اے رضاؔ ایک ہی جانب سے جو ہو اس محبت میں نہیں

یہ مسئلہ جس مولوی سے پوچھ لیجیے آپ کو بتا دے گا کہ کتاب کی رو سے غلط ہے۔ مگر کاش میں ایسی غلط تصویر انسانی جذبات کی اتار لیتا۔ دو ہزار مسائل اس ایک غلطی پر سے صدقے اتارے ہیں۔

میں کیا اور میرا خیال کیا، دل کہتا ہے کہ "نوائے رضا" کی وجہ سے شاعری کا رنگ بدل جانے والا ہے اور جو شخص اس کی اشاعت میں کوتاہی کرے گا مذاقِ سلیم حشر میں اس کا دامن پکڑے گا۔

آپ کے مجموعے میں ایک عیب بھی ہے۔ جیسے بعض خوبصورت عورتیں ہوتی ہیں جو دن سے زیادہ شمع کی روشنی میں بھلی معلوم ہوتی ہیں اور انگریزی میں ان کو candle light beauty کہتے ہیں۔

اسی طرح یہ کتاب بھی مجمع میں اچھی لگے یا نہیں تنہائی میں کتنوں کی مونس ہوگی۔

محمد علی عفی عنہ
مئی ۱۹۳۰ء

ہما بیگم[12] کے نام

الموڑہ میں ملا.................. ۴ یا ۵ ستمبر ۱۹۳۲ء

ہما پیاری، دعا!

معلوم نہیں تم کب تک آؤ گی۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ تمھارا وزن تین سیر سے کچھ اور بڑھا یا نہیں۔ آج تین چار روز ہوئے مجھ کو کاظم کا خط ملا کہ کجن[13] بہت بیمار ہیں۔ دوسرے دن چھبّن کو بارہ بنکی روانہ کیا اور جابر[14] کو لے کر یہاں چلا آیا۔ سلمان لکھنؤ میں ہیں یہاں آتے وقت مجھ سے ملاقات نہیں ہوئی۔ یونین ایک جماعت ہر یونیورسٹی میں تیار کی جاتی ہے جس میں علاوہ اور باتوں کے تقریریں کی جاتی ہیں۔ اس کا الیکشن ہوتا ہے اور بڑی اہم چیز تصور کی جاتی ہے۔ سلمان اس کے لیے کھڑے ہوئے ہیں۔ یقیناً نتیجہ لکھنؤ میں معلوم ہوگیا ہوگا مگر یہاں ابھی تک نہیں معلوم ہوا۔

حیدری[15] کجن کے ساتھ یہاں گانا سیکھ رہی ہے۔ میرے خیال میں باوجود بیوقوفی کے اس کو کچھ نہ کچھ ضرور آجائے گا۔ آج ایک ہارمونیم بھی بائیس روپے کا اس کے لیے مول لیا جارہا ہے۔ دن بھر ہنسا کرتی ہے اور بہت خوش ہے۔ مگر جب میاں کا خیال آجاتا ہے تو رونے پر تیار ہوجاتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ میراثیوں کے یہاں غیر مرد سے گانا سیکھنا منع ہے۔ میرے خیال میں حسین باندی[16] نے اپنی جلن اور حسد میں اپنے تین پیسے کا خون کیا ہے اور اس کے شوہر کو بمبئی میں حال لکھ بھیجا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یا تو وہ کہتا تھا کہ وہیں رہو اور میں خرچ دیے جاؤں گا۔ یا نادری حکم بھیج رہا ہے کہ فوراً چلی آؤ۔ میں نے اس کو صلاح دی ہے کہ کرایہ کا روپیہ مانگ بھیجے۔ جب روپیہ آجائے گا تو لکھ بھیجے گی کہ چیتھڑے لگائے تھی۔ اس کے کپڑے بنوالیے اور روپیہ بھیجو تو آؤں۔ اول تو روپیہ بھیجے گا نہیں اور بھیجے تو کہے کہ یہاں قرض دار ہوگئی تھی۔ اگر اس کو نہ ادا کرتی تو یہاں غیر جگہ سے کیوں کر

جاتی۔ اس کے اوپر ضرور لڑائی ہوجائے گی اور ملاپ ہوتے ہوتے کم سے کم چھ مہینے لگیں گے۔ تب تک کچھ نہ کچھ ضرور آجائے گا۔ کُجن کے یہاں جو مغلانی ہے جس کے میاں غریب کا دماغ پھرا ہوا تھا وہ اچھا ہوگیا۔ مغلانی بہت خوش ہے۔ میں نے اس کو بات بات پر کبھی مسکراتے نہیں دیکھا تھا۔ اب بہت خوش ہے۔ کُجن کہتی ہیں کہ لڑکا بھی ہونے والا ہے۔ حیدریا سے ہر وقت چہلیں ہوا کرتی ہیں۔

مٹھوا[17] دوسرا بیاہ کرنے جاتا ہے۔ فی الحال شمسل[18] کے بڑے گھرے سہاگ ہیں اور کہتے ہیں کہ بیاہ کے ایک دن پہلے شمسل کو رخصت کردیں گے۔ شمسل کو دروازے پر جوتے کے اسکول کے مکان کے دوسرے حصّے میں رکھے ہیں اور روٹی کپڑا مٹھوا ہی کے ذمّے ہے۔ میرا خیال ہے کہ شادی کے بعد مٹھوا اچھا خاصا پریشان ہوگا۔ دونوں بہویں اس کی بیوی کی جان عذاب میں کردیں گی۔ مٹھوا بی بی کی طرف داری کرے گا اور محلّے والے پنچ برادری سب بہوؤں کی پرچک لیں گے۔

جادی ہماری خدمت خوب کرتی ہے۔ مگر دماغ وہی ساتویں آسمان پر ہے۔ غریب عصمت[19] کا حال تو سن ہی چکی ہو۔ خاتون[20] ابھی تک فیض آباد میں ہیں، نہ معلوم بچیں یا نہ بچیں۔ حسن احمد[21] (سنا ہے) کہتے ہیں کہ اگر خاتون اچھی ہوگئیں تو ہمارا کھیل ہی بگڑ جائے گا۔ نہ معلوم کون کھیل بنا ہے جو بگڑ جائے گا اور بن کر کیسا کھیل تیار ہوگا۔

ڈاکٹر گوبند پرشاد کی تعیناتی ضلع رائے بریلی میں کسی جگہ ہوئی ہے۔ کل میں نے ان کو بلوایا تھا۔ انھوں نے مجھ کو دیکھ کر کہا کہ قلب میں ایک خفیف سی چربی آگئی ہے۔ اگر ان باتوں کے بعد بھی رخت سفر باندھنے پر نہ تیار ہوں تو اللہ میاں کو کون برا کہہ سکتا ہے۔ بچوں کو اور لچھو[22] کو دعا۔

کل انشاء اللہ تعالیٰ گھر جاؤں گا۔ موٹر میرا بہت دنوں سے ٹوٹا پڑا ہے۔

محمد علی عفی عنہ

۴

ہما بیگم کے نام

الموڑہ میں ملا ۲۲ر تمبر ۱۹۳۲ء

میری مصاحب میری بیٹی، دعائیں!

تمھارا حکم ہے کہ ایک اور خط لکھوں۔ لیجیے ایک خط اور لیجیے۔ میں رودولی میں پا بہ زنجیر ہوں۔ وجہ کیا کہ روز معلوم ہوتا ہے کہ موٹر کل تیار ہو جائے گا اور ہمیشہ وہی روز اول رہتا ہے۔ تمھارے تفضل ماموں دو چار روز کے لیے گھر آئے تھے۔ آج نانپارہ گئے ہیں۔ کہتے تھے کہ وہاں رہ کر ملازمت کی کوشش کروں گا۔ میرا دل کہتا ہے کہ دو ایک دن نانپارے میں رہ کر گھوڑی بکھیلے ہی میں دم لے گی۔ مگر میں کس منہ سے کہوں سوپ تو سوپ ہنسے چھلنی کیا ہنسے جس میں بہتر چھید۔ شاہ ضیاء الحق کی بی بی سے پندرہ سولہ برس کے بعد ملاپ ہوا ہے۔ اتنے زمانہ تک بیچارے بندر کی طرح زندگی بسر کیا کیے۔ کھانا بازار سے کھایا۔ کباب روٹی باورچی کے یہاں سے مول لے لی نہیں تو دکان ہی پر، حلوائی سے مٹھائی لے کر کھالی۔ پانی گھر میں آکر پی لیا۔ پان ملا تو ملا نہیں تو ایک کھٹیا منہ میں ڈال اور پیرزادگی کے مزے چوس چوس کر لیا کیے۔ ریوڑی کھٹیا کچھ مول لینا نہیں۔ مخدوم صاحب کے مزار پر انوار کی طرح ہر وقت برسا کرتی ہیں۔ اب بے چارے پکی پکائی روٹی پاتے ہیں ؎

عید ہوئی ذوق والے شام کو۔ مگر ہو تو گئی

غرۂ رمضان سے ہر حال میں غنیمت ہے۔

موتی جان[23] بے چاری قضا کر گئیں۔ مگر کسی سے خدمت نہیں لی۔ شام کو دروازے پر بیٹھی تھیں، صبح کو جب دروازہ نہ کھلا تو جگن بڑھئی نے حق ہمسائگی ادا کیا۔ دیوار پھاند کر گھر میں گھسا دیکھا تو انگنائی میں پڑی ہیں اور رمقے سانس آ جا رہی ہے۔ ادھر

سے غفورا ماں دوپہر کا کھانا لے کر پہنچی ادھر موتی جان نے ؎

زجام دہر مئے کل من علیہا فان

نوش کیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ چھینکا ٹوٹا بلی کے بھاگوں۔ وہ گھر انور کو دیا گیا۔ ابھی دلہنیا[24] سدن[25] وہاں گئی نہیں ہیں مگر ان کے نامزد ہوگیا ہے۔ دلہنیا کے لڑکا ہونے والا ہے۔ دن قریب ہوں گے۔ گو قریب تر نہیں معلوم ہوتے۔ وہ بہت خوش ہے۔ باورچی خانے سے سہ دری آتے وقت ذرا سا سر جھکا کر کنکھیوں سے اپنا پیٹ دیکھتی چلتی ہے۔ مجھ کو نہ معلوم آپ ہی آپ کیوں خوشی ہے۔ مجھ کو معلوم ہوتا ہے کہ گویا میرے ہی پوتا پیدا ہونے والا ہے۔

حسن احمد غریب محل اور اس گھر کے درمیان میں گھوما کرتے ہیں۔ ابو[26] نے ان کے لیے سلطان پور میں کچھ ٹھیکہ کا ڈھچر ڈالا ہے۔ دیکھیے کیا نتیجہ نکلتا ہے اور کب کام شروع کرتے ہیں۔ نہ معلوم تم کو لکھ چکا ہوں کہ نہیں۔ شمسل کے لڑکا ہونے والا ہے۔ مٹھو بہت خوش ہیں۔ یہی حال سب گدھوں کا ہوتا ہے۔ نام گنواتے شرم نہیں معلوم ہوتی ہے۔

عظمت،[27] مٹھو اور ہم حج کو ساتھ گئے تھے۔ گو اعمال ایسے نہ ہوں مگر 'رحمت حق بہانہ می جوید' کے حکم سے ممکن ہے انشاء اللہ تعالیٰ حج مقبول ہوا ہوگا۔ کیونکہ خدا جس شخص کو دوست رکھتا ہے اس کو امتحان میں ڈالتا ہے۔ چنانچہ ہم لوگ بیبیوں کی مفارقت میں امتحان میں مبتلا کیے گئے اور سب کے سب فیل ہوگئے۔ انا خلقنا الانسان فی احسن تقویم۔ ثم رددناہ اسفل السافلین۔

گریموفون کے بارے میں تم نے لکھا ہے کہ تم کو پسند نہیں ہے۔ واقعی گانا اس کو نہیں کہہ سکتے۔ میں خود عمر بھر یہی کہا کیا۔ لیکن بی بی اگر ریکارڈ عمدہ ہوں اور آواز ملائم ہو تو خوش آئند ثابت ہوتا ہے۔ ممکن ہے مجھ کو اس وجہ سے معلوم ہوتا ہو کہ مجھ کو بے کاری کا مشغلہ ہاتھ آیا ہے۔ خیر انشاء اللہ تعالیٰ سننا دو چار ریکارڈ اچھے ہیں۔

راقم

تمہارا خادم محمد علی عفی عنہ

خط ختم کرنے کے بعد دیکھا تو ایک صفحہ باقی رہ گیا ہے۔ ہزار دماغ دوڑایا، کوئی مضمون دماغ میں نہیں آتا۔

نہ معلوم الموڑے میں تم کو اپنی پیدائش کا گھر ملا یا نہیں۔ پھر ایک مرتبہ پتا لکھے دیتا ہوں۔ بازار کی طرف سے اگر تمھارے مکان کی طرف آؤ تو گرجا کے داہنے بائیں دو سڑکیں ہیں۔ ایک سڑک جیل کو گئی ہے اور دوسری عیسائیوں کے سینی ٹوریم کو گئی ہے۔ اگر تم داہنے ہاتھ والی سڑک لو تو گرجا تمھارے بائیں ہاتھ پر پڑے گا اور وہ مکان داہنے ہاتھ پر۔ بالکل لب راہ اس میں جو کمرہ بازار کے رخ پر یعنی سب سے پہلا ہے وہی تمھاری پیدائش کی جگہ ہے۔ ممکن ہے اب قطع بدل گئی ہو۔ مکان کے مالک کا نام جیوانند پنتھ تھا۔ یہ ہندو تھے مگر اسی مکان کے پاس کچھ عیسائی پنتھ بھی رہتے تھے۔ اب ممکن ہے مکند لوگ رہتے ہوں کیونکہ ایک مس پنتھ نے مکند کے ساتھ بیاہ کیا تھا اور ان کے دو لڑکیاں تھیں۔ شانتی اور پنیل۔ مکان کا نام شاید ''پائن ویو'' تھا۔ اب یقیناً ہم Bore ہو گئے ہوں گے۔

تمھارا دعا گو

محمد علی عفی عنہ

۵

ہما بیگم کے نام

قربانت شوم ۱۹۳۴ء

سن رہا ہوں کہ تمھارے دشمنوں کو حرارت آ گئی۔ تمھاری بیماری میں میری وہی کیفیت ہوتی ہے جو میر تقی میر کی برسات میں پرانے گھر کو دیکھ کر ہوتی تھی ۔

تر تنک ہو تو سو کھتے ہیں ہم

بی بی مجھ کو یقین ہے کہ نہ تم نے ڈاکٹر کو بلوایا ہو گا نہ دوا منگوائی ہو گی۔ کمزوری کا وہ عالم، کام کرنے کا یہ شوق۔ اگر کالزا نا ہی استعمال کرتی رہو تب بھی غنیمت ہے۔ میرے دل کی بات سوا تمھارے سمجھنے والا نہیں ہے۔ اسی وجہ سے یہ خود غرضی ہے کہ رب لاتذرنی فرداً و انت خیرالوارثین کی دعا مانگتا ہوں۔ نصیرا[28] کو فیض آباد سے بلوا کر بھیج رہا ہوں۔ بے وقوف ہے، بدسلیقہ ہے مگر تمھارے گھر کی لواحق میں سے ہے۔ کبھی کبھی چھوٹی موٹی چوری بھی کر لے تو برا نہ ماننا اور ہو سکے تو رکھے رہنا۔ چار روپے پر تھی، میں نے چھ روپے کہہ دیا ہے۔ کھانا تم دو گی ہی۔

معلوم نہیں کجن کی ساڑی ملی یا نہیں۔ اگر ملی تو اس کے دام دیے گئے یا نہیں؟ اخلاق[29] کو میں اچھی طرح موس آیا تھا۔ میں نے لڑکیوں کی شادی کیا کی ہے، نیلم کی انگوٹھیاں راس آئی ہیں۔ اگر موٹر والا روپیہ کاظم[30] نے ابھی نہ لیا ہو تو اسی میں سے اخلاق کو بھی ان کا قرضہ دے دو اور کجن کی ساڑی کے دام بھی دے دو ورنہ مجھ کو مطلع کرو۔ میں اخلاق اور ساڑی وغیرہ کا روپیہ لے کر آؤں۔ خدا تم کو زندہ و تندرست رکھے۔

خادم

محمد علی عفی عنہ

۶

ہما بیگم کے نام

لکھنؤ ۳۱/مارچ ۱۹۳۵ء

میری پیاری ہما دعائیں!

تمھارا خط پرسوں شام کو ملا، میں نے پہلے سنا تھا کہ محرم تم رودولی میں کروگی۔ اس کے بعد چھبن سے معلوم ہوا کہ جولائی تک آؤگی۔ تمھارے خط سے یہ بھی نہ کھلا کہ اگر تم ابھی آئیں تو کتنے دن رہ سکوگی اور اگر تم بعد محرم آئیں تو کتنے دن رہوگی۔ بہرحال تمھارے دیکھنے کو دل بہت چاہتا ہے۔ تم جب آؤ تب غنیمت جانوں گا لیکن جس قدر زیادہ رہو، اسی قدر اللہ کا شکر بھیجوں گا۔ آؤ تو تمھاری عنایت ہے۔

شمار شوق نہ دانستہ ام کہ تا چند است
جز ایں قدر کہ دلم سخت آرزو مند است

بچوں کو دعائیں!

راقم، دعاگو

محمد علی عفی عنہ

۷

کاظم رضا کے نام

مائی ڈیئر کاظم، دعا!

نزہت (31) کے منھ سے میں نے ''متوارے نینوا'' سنی تھی اور مجھ کو بہت پسند آئی تھی۔ تمھارا نام اس میں موجود تھا مگر لے کی خوبصورتی کے آگے الفاظ پر غور نہیں کیا تھا۔ اسی وجہ سے یہ نہ جانا کہ یہ تمھاری چیز ہے۔ تم نے بھی ظلم کیا کہ بتایا نہیں۔ ورنہ میرا مزا دگنا ہوجاتا۔ اس وجہ سے بھی کہ تمھارے دل سے نکلی تھی اور اس وجہ سے بھی کہ منھ پر تعریفیں کرکے میرا دل اور خوش ہوتا۔ بزرگوں نے انکسار، تعلی اور منھ پر تعریفیں کرنے کے اصول کچھ ایسے غلط قائم کردیے ہیں کہ کچھ انتہا نہیں۔ تعلی اور انکسار دونوں دھوکا دینے کی کوششیں ہیں مگر ایک بُری سمجھی جاتی ہے اور دوسری اچھی۔ منھ پر تعریفیں کرنے کی قیمت نادانی سے اتنی کم کردی ہے جیسے بازار میں حضرت یوسفؑ کے دام لگے تھے۔ ہائے تصنع وائے تصنع، بھاڑ میں جائے تصنع۔ یہ سب اسی وجہ سے ہوا ہوگا کہ شاید اگلے زمانے والے ہم لوگوں کے اتنے Sincere نہ رہے ہوں گے۔ ایران کی تہذیب یہاں کیا عرب میں چھائی تھی۔ جہاں امراء القیس کی تعریفیں تو تھیں مگر متنبّی کا بھی رنگ جما ہوا تھا۔ میری ناچیز رائے میں سچی تعریف منھ پر ہی ہونا چاہیے۔ البتہ جھوٹی تعریف ہمیشہ پیٹھ پیچھے کی جائے یا اتنے بڑے مجمع میں کی جائے جہاں دو شخصیتیں اتنی قریب نہیں ہوتیں کہ ان کے دل کی کسوٹیوں پر سونا کسا جاسکے۔ سچی تعریف میں کھرا مال ہوتا ہے جس کی کھنک میں دل کو دھوکا ہو ہی نہیں سکتا۔ اس دارالمحن میں اگر دو آدمی کسی ذریعے سے اپنے اپنے دل کی کلی کھلاسکیں تو کیوں نہ کھلائیں۔ اچھا اب تمہید ختم تقریظ شروع۔

تمھاری چیز سن کر میری آنکھوں میں کئی بار آنسو امنڈ آئے اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں۔

تناسب، مصرعوں کی چستی کی تعریف کر کے کاغذ کیوں سیاہ کروں۔ اصل بات کیوں نہ کہہ دوں کہ جو تم کہنا چاہتے تھے اس میں کامیاب ہوگئے۔ اس سے زیادہ شاعر کے بس میں ہے ہی کیا۔

واقعی تمھارے دل میں درد ہے۔ ''متوارے نینوا'' بھی ابھی بادشاہ سے سن رہا تھا۔

دعا گو

محمد علی عفی عنہ

۱۴ر جنوری ۱۹۴۱ء

ردولی

مکرر، ہائے رے ثاقب

وہی الفت ہے جس کو نشتروں کا کام آتا ہے
لہو دیتی ہے دل کی رگ جو تیرا نام آتا ہے

تم بھی اسی طرح ''متوارے نینوا'' میں کامیاب ہوگئے ہو۔ اے لو پھر دل بھر آیا۔ گو میں پلک مُتنا ہوں۔ مگر چیز بھی غضب کی ہے۔ اس بار میں سن رہا تھا بلکہ آخری مصرع دل میں آیا تھا۔

محمد علی عفی عنہ

۸

ہما بیگم کے نام

۲۵ر اکتوبر ۱۹۴۱ء

میری جان، دعائیں قبول کرو!

واقعی تمھارے کئی خط آئے، مگر میں نے جواب کسی کا نہیں دیا۔ آثار قیامت میں لکھا ہے، جب بیٹی بر مانگے اور گائے گو کھائے تو قیامت قریب ہے۔ ان اثروں میں ایک اور جوڑ دو۔ جب میاں جان ہما کے خط کا جواب نہ دیں تب بھی کچھ ہونی معلوم ہوتی ہے۔ جب تمھارا پہلا خط آیا تھا تو میں چار راتوں سے نہیں سویا تھا۔ خط لکھنے بیٹھا اور تھوڑا سا لکھا بھی، اس کے بعد رہ گیا۔ آج تین راتوں سے پھر نہیں سویا ہوں۔ کل لکھنؤ آرہا تھا، اس لیے خط لکھنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوئی، پھر رک گیا۔ رات کو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ دن کو ظاہراً اچھا رہتا ہوں۔ اگر آج بھی نیند نہ آئی تو کل لکھنؤ آؤں گا۔ اختلاجی کیفیت دن کو نہیں رہتی اور خوب ہنستا بولتا ہوں۔ رات البتہ مٹھو اور قیصر [32] کے لیے آفت کی رات ہوتی ہے۔ انگریزی مثل ہے۔ چیسے دوسروں کے لاتیں ہماری، یہی حال قیصر اور مٹھو کا ہے۔ رات لیٹے لیٹے خیال ہوا کہ ریاح اور قبض کی وجہ سے یہ آفت ہے۔ آج رینڈی کا تیل پیا ہے۔ دیکھیے اگر میں کل نہ آؤں اور کوئی خبر بھی نہ آئے تو سمجھ لینا کہ اچھا ہوں۔ اگر میں لکھنؤ آیا تو اُن کے گھر میں رہنے کا ارادہ ہے۔ تم کو بھی اپنے افسر اعلیٰ سے اتفاقیہ رخصت لینا پڑے گی۔ اگر نہ آیا تب بھی کوشش کرنا کہ رخصت اتفاقیہ لے کر مجھ کو دکھا جاؤ۔ بیماری ہو، حیرانی ہو، تمھارے دیکھنے کا سامان بندھ جائے۔ علی کاظم [33] کا پیغام پہنچا۔ ان سے کہنا آپ کا حکم بجا لاؤں گا۔ اخلاق اور بچوں کو دعا، سنا ہے کہ اخلاق اب بالکل اچھے ہیں۔ خدا کرے سچ ہو، سبط کے کھانسی ہے، سانس بھی پھولتی ہے۔ احتیاط کرنا اپنی کسر شان سمجھتے ہیں۔ میری تیر بہدف دوا بھی رسوا ہوئی۔ بدرل [34] کی طرف سے دعاء۔

راقم، تمھارا باپ

۹

ہما بیگم کے نام

۶؍جنوری ۱۹۴۲ء

ہما پیاری، دعائیں قبول کرو۔

مجھ کو اپنی خط نویسی پر گھمنڈ تھا اور اردو پر بھی ناز تھا۔ (یہ باتیں تم سے بصیغہ راز رکھتا ہوں) مگر تمھارا خط پا کر معلوم ہوتا ہے اردو بھول گیا اور خط لکھنا سیکھا ہی نہ تھا۔ جب لکھنے بیٹھتا ہوں تو بجائے لکھنے کے تمھارا خط پڑھنے لگتا ہوں اور مزا ختم ہی نہیں ہوتا ہے۔ بی بی عابدہ[1] نے تو غضب ہی کر دیا۔ ایسے مزے کا میٹھا درد ہوا کہ واہ واہ۔ نیگ[2] کے معاملے میں خود سوچ رہا تھا اور تم سے مشورہ کرنے کو طے کر لیا تھا کہ تمھارا خط آ گیا اور رائے قائم ہوگئی۔ خدا تم لوگوں کی عمروں میں برکت دے اور بہت نیگ پانا نصیب ہو۔ مگر وہ نیگ پھوپھیوں کو بھائی کے ہاتھ سے ملیں گے۔ میرے ہاتھ والا باب بند ہوگا۔ اس لیے جو مانگو سو پاؤ، اگر یکبارگی نہ دے سکا تو قسطیں کروالینا۔ دستاویز لکھوا لینا، جس طرح سے چاہے لے لینا۔

قیصر بہت خوش ہے اور سلمان کے لڑکے کے ساتھ تم کو بھی بہت دعائیں دیتی ہے۔ قریب قریب ہر شخص نے اس کا دل رکھا۔ ''مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔'' تمھارا انداز ہی دوسرا ہے۔ کہتی ہے ''بٹیا جان و مال سے حاضر ہوں۔''

ہما! تم سے ملنے کی بہت ضرورت ہے۔ بغیر تمھاری رہنمائی کے میں کیا کر سکتا ہوں۔

محمد علی عفی عنہ

تمھارا خادم

---

1. ہما کی والدہ
2. لڑکیاں بھائی کی شادی اور بھتیجے کے پیدا ہونے پر باپ بھائی سے نیگ مانگتی ہیں۔ باپ بھائی کچھ نقدی یا زیور وغیرہ دیتے ہیں۔

(۱۰)

حسن عباس کے نام

17/مئی 1943

عزیزی حسن عباس سلمہ، دعا

تمھارا محبت نامہ کئی دن ہوئے آیا تھا۔ جواب میں تساہلی معاف کرو۔ ہم لوگ اس وقت تک بخیریت ہیں اور گرانی کی شکایت ایک دوسرے سے کر کے زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں۔ سعید سلمہ (36) بظاہر اچھے ہیں مگر ناک میں پڑی اب بھی پڑتی ہے۔ میری اختلاجی کیفیت کبھی کبھی عود کر آتی ہے ورنہ اچھا ہوں۔ قیصر تم کو بہت بہت دعائیں کہہ رہی ہیں چھبن کو اسقاط ہوا تھا۔ فیض آباد گئی ہیں۔ میرے خیال میں اچھی ہیں مگر مجھ کو کچھ زیادہ معلوم نہیں، سبط (37) ساتھ گئے ہیں۔ بدرل تم کو بہت بہت دعا کہتے ہیں۔ تمھارے گھر میں خیریت ہے۔ بھاوج صاحبہ آئی تھیں مگر وہ بھی گرانی کو رو رہی تھیں۔ ہم لوگ عنقریب انشاء اللہ شملے جائیں گے۔ رودولی کے خاص واقعات میں ایک مشاعرہ ہے بصدارت مولوی جعفر مہدی (38) صاحب کل ہوا تھا۔ پیچوان معہ حقہ بدری و چنبر نقرئی گھر سے لے گئے تھے۔ وہ برابر پیتے رہے اور صدارت کی۔ آن برقرار رکھنے کے لیے کسی کو نہیں دیا۔ شاہ مصطفیٰ احمد صاحب کی اہلیہ نے انتقال کیا۔ انھوں نے جرأت کر کے سب سے کہلا بھیجا کہ سیوم وغیرہ نہ ہوگا۔ برادری تکلیف نہ کرے۔ مرزا منے مرحوم کی اہلیہ نے کہار بلوائے کہ جائیں کہاروں نے کہا ہم کو تو کہاری ملے گی مُل بی بی تو پھیجت (بے عزت) ہوئی ہو کہو تو لے چلیں۔

میاں نظیر سید پوری کا ایک نہ سالہ پوتا اور مرحوم ریاض الحسن کا لڑکا بھی گزر گیا۔ تربز اور خربوزے بہت ہیں مگر بدمزہ اور بے انتہا گراں۔ گیہوں کل یہاں تین سیر کا بکا۔ خراب قسم کا سوا تین سیر ملتا ہے۔ قیصر آج بارہ بنکی گئی ہیں شام کو انشاء اللہ تعالیٰ واپس آئیں گی۔ میاں حفیظ کی طبیعت گرتی جاتی ہے۔

دعا گو   محمد علی عفی عنہ

(غیر مطبوعہ)

۱۱

ہما بیگم کے نام

۲۷ر مئی ۱۹۴۳ء

ہما پیاری! دعائیں قبول کرو! اور کیا عرض کروں کہ شملہ ماشاء اللہ میرے بچوں سے بھرا پڑا ہے۔ مگر آنکھیں ایک اور ہی کو ڈھونڈھ رہی ہیں ؎

در چمن بود زلیخا و بہ حسرت می گفت
یاد زنداں کہ در و انجمن آرائے ہست

خیر جی ہوگا۔ یہ آرا میں کب تک اور یہ تکلیفیں کب تک۔ میرا دل چاہتا ہے کہ کوئی نہ کوئی عیب نکال کر تمھارے استخارے سے لڑ جاؤں۔ مگر پھر بھی دل میں اس کی ویسی ہی قدر بھی ہوتی ہے۔ جیسی طیب کے باپ کی ہے۔ خیر ہوگا تم قرآن پڑھے جاؤ۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ تمھارے بچے اور اخلاق اور سب لوگ اچھے ہیں۔ الّن دوسرے مُلک میں رہتی ہیں، تمھارے بچے دوسرے ملک میں ہیں۔ ہم دونوں کے بیچ میں بفراسٹیٹ قائم کیے ہوئے ہیں۔ کنگ ایڈورڈ کے مرنے کا حال انگلستان کے ایک مشہور نامہ نگار نے اخباروں کے لیے لکھا تھا۔ اس میں اس نے جنازے کی دھوم خوب دکھائی تھی۔ درمیان میں ایک جگہ اس نے کنگ ایڈورڈ کے کتّے کا بھی ذکر کیا تھا۔ لوگوں نے اعتراض کیا تھا کہ ایسے موقع پر کتّے کا ذکر Pathos ہوگیا۔ Pathos بے موقع غم اور ہنسی کے میل جول کو کہتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں تم لغت میں دیکھ لینا، اچھا۔ اچھا اب اسٹرابری کا Bathos سنو۔ غلطی سے بہت سے اسٹرابریز لے لی گئیں۔ شوکت کے انتظام میں کریم آئی۔ اور سب کو تقسیم ہوئیں۔ ہاں اتنا کہنا بھول گیا کہ ''رئیس'' حیدرآباد والی اور ان کے دو بچے بھی سلمان کے مہمان ہیں۔ وہ اسٹرابری تھوڑی تھوڑی سب کو تقسیم ہوئی۔ اتنے میں طیبہ رئیس کی چھوٹی سی لڑکی قیصر کے پاس دوڑی آئی اور کہنے لگی، ''اماں باجی، آپ نے اسٹرابری

نہیں کھائیں؟ ہم نے کہا تھا مگر کہا بچی ہی نہیں''۔ قیصر کچھ ہما تو تھیں نہیں۔ ان کو اس کے بعد بڑی تکلیف ہوئی۔ جوان بی بی، بوڑھا میاں، اگر سٹھیا نا نہ ہو تو سٹھیا جائے۔ بس ایسے ہی وقت میں ہما یاد آجاتی ہیں۔

مردم بہ ہزار آرزویت
باز آ کہ شوم فدائے رویت!

ایک بات دھیان میں اور آئی۔ جب ہم اور قیصر گھر میں یا کہیں باہر ہوتے ہیں تو تمام وہ باتیں پیش نظر رہتی ہیں جن کو دل ڈھونڈھتا ہے، مگر نہیں پاتا۔اس کے بعد جب کوئی ایسا موقع آجاتا ہے جیسے اسٹرابری والا تو میں جناب امیر بیچارے کی طرح تلوار کھینچ کر مٹی کے گھوڑے پر چڑھ بیٹھتا ہوں۔ گھبراؤ نہیں، کوئی لڑائی نہیں کیونکہ ہارون امت جناب امیر کی طرح میں نے بھی نہ چاہا کہ قوم میں فساد ہو لیکن

یہی تو میں کہتا ہوں کہ ہما ہو تو دنیا ہو اور اگر ہما نہ ہو تو دنیا بھی نہ ہو۔

مست است یار و یاد حریفاں نمی کند
یادش بخیر ساقی مسکیں نواز من!

اور سنو چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے اور میں یہ خط لکھ رہا ہوں۔ نہ معلوم میرے چہرے پر قیصر نے کیا دیکھ لیا ہے کہ دور ہی سے بولیں ''یہ خط تم ہما کو لکھت ہو ہم سمجھ گئین۔''

اگر آسکو تو چھاتی پر پتھر رکھ کر چلی آؤ
اگر تم اتفاق سے آجاؤ تو دیوان حافظ لیتی آنا۔

خادم

محمد علی عفی عنہ

۲۷رمئی ۱۹۴۳ء

قیصر نے یہ خط اصرار کر کے سنا اور کہنے لگیں۔ ذرا سی بات لکھنؤ تک پہنچ گئی۔ میں نے کہا تم گھبراؤ نہیں۔ قیصر تم کو دعا کہتی ہوں اور سعید تسلیم!

۱۲

حسن عباس کے نام

۲۷ مارچ ۱۹۴۳ء

عزیزی سلمہ، دعا۔ تمھارا محبت کا کارڈ مجھ کو فیض آباد میں ملا تھا۔ جواب میں تاخیر ہوئی۔ معاف کرنا، میں بالکل تندرست اور اچھا ہوں۔ رات کو نیند بھی آتی ہے۔ خون کا دوران وغیرہ بھی زیادہ نہیں ہے نہ کوئی اور علامت ہے۔ ظاہراً ابھی ان معاملات میں تاخیر ہوتی ہے جن کی خبر کرنل کلائڈ المتخلص بہ ناعی نے دی ہے۔ تم میرے لیے پریشان نہ ہو کیونکہ دوسرے ڈاکٹر لوگ اطمینان دلاتے ہیں اور پھر یوں تو ساٹھ برس سے متجاوز آدمی بے ٹکٹ کا مسافر تو ہو ہی جاتا ہے۔ خالی ٹکٹ چیکر سے مڈبھیڑ ہونے کی دیر رہتی ہے۔ خدا کرے تمھارا دل وہاں لگ جائے اور آمدنی بڑھنے کا سامان ہو۔ وہ چورن وغیرہ کا مشورہ جو میرا تھا اس پر کچھ غور کیا؟ یہاں پر سب خیریت ہے۔ تمھارے یہاں بھی اور محل میں اور اس گھر میں۔

قیصر اور سعید اچھے ہیں، قیصر تم کو بہت بہت دعا کہتی ہیں۔

دعا گو

محمد علی عفی عنہ

(غیر مطبوعہ)

---

(۱۴)

حسن عباس کے نام

۲۱ر ستمبر ۱۹۴۳ء از رودولی

عزیزی سلمکم اللہ، دعا!

تمھارے خط کا جواب اتنے دنوں بعد دے رہا ہوں اور وہ بھی لفافے کے بدلے میں پوسٹ کارڈ۔ برا نہ ماننا۔ برسات کی زیادتی عالم گیر بنی۔ تین دن کی امس، خدا کرے بے عالم گیر نہ رہی ہو۔ رات سے پھر ابر آیا اور اس وقت بند ہوا ہے۔ میاں حسن احمد کے حلق سے سنتا ہوں کہ خون آیا۔ اس کی بی بی کے اوپر لقوے کا اثر ہوا۔ سبط کی سانس پھر پھولنے لگی۔ کچھ دلی رشتے ہیں جن کو ظاہر سے تعلق نہیں ہے۔ انھیں رشتوں سے متاثر ہوں۔ نہال سنگھ (39) کے انتقال سے میرے اوپر بڑا اثر پڑا...... مگر زمانہ...... ہے رفتہ رفتہ ٹھیک ہو رہا ہوں۔

خدا تم کو صحیح و سالم رکھے اور اقبال مند کرے۔ آمین۔

تمھارے یہاں خیریت ہے میاں بدرل اچھے ہیں اور کوئی تازہ کیفیت قابل ذکر یاد نہیں پڑتی۔ قیصر تم کو دعا کہتی ہیں اور میاں بدرالحسن صاحب بھی۔ سعید تسلیم کہتے ہیں۔

محمد علی عفی عنہ

حاضر الوقت حکیم رشید صاحب تسلیم کہتے ہیں۔ میاں اتصاف نے مجھ سے وعدہ کرلیا ہے اور رمضان میں انشاء اللہ سب کچھ بخیر و خوبی انجام پائے گا۔

محمد علی

(غیر مطبوعہ)

---

(۱۴)

ہما بیگم کے نام

۱۴ رفروری ۱۹۴۴ء

ہما پیاری دعائیں!

تمھارا دستی خط آج پانچ بجے شام کو ملا۔ مجھ کو افسوس ہوا کہ اب رساول وغیرہ کا سر انجام نہیں ہوسکتا۔ اندر جو گیا تو معلوم ہوا کہ رساول پک رہی ہے۔ لڈو بھی مل گئے۔ امیر علی کی کتاب میرے پاس اب نہیں ہے۔ ایک صاحب لے گئے اور واپس نہیں کی۔ اخلاق سے میں نے Hitti کی کتاب کا ذکر کیا تھا وہ حاضر ہے۔ امیر علی والی کتاب کا دوسرا رنگ ہے اور اس کا دوسرا رنگ ہے۔ وہ مسلمان کی لکھی ہوی ہے جس میں خالی دوست ہی درکار نہیں ہے دشمن کی بھی جگہ دل میں ہے۔ یعنی مسلمانوں کے ہر فرقے کا دلی منشا سمجھ کر لکھا۔ اس کتاب میں خلافت کا سنّی نقطہ نظر اور اہل بیت کا شیعہ نقطہ نظر دونوں موجود ہیں۔ Hitti نے بڑے تدین سے لکھا ہے مگر شیعہ سنّی کسی کا بھی درد نہیں دکھائی دیتا۔ البتہ تاریخ پڑھ کر غیر پر جو اثر مرتب ہوسکتا تھا وہ ہے۔

یہ کتاب میری بڑی ضرورت کی ہے۔ روز ہی کام رہتا ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ ڈیرک (Derek) (40) ہضم نہ کرلیں گے۔ اس لیے بھیج دیتا ہوں۔ میرا خود دل چاہتا ہے کہ ڈیرک پڑھ لیں۔ لیکن چونکہ ان کو مسلمانوں سے واسطہ ہے، اس وجہ سے امیر علی کی دونوں کتابیں پڑھنے کی ضرورت پھر رہ جائے گی۔ شارٹ ہسٹری اور اسپرٹ آف اسلام، ڈیرک سے میرا سلام کہنا۔ بدرل سے بھی سلام شوق اور اخلاق کو اور بچوں کو دعا۔ تم کو آنکھیں ڈھونڈتی ہیں۔ سلمان کا خط کل آیا تھا۔ ان کا دلی آنا ابھی طے نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ ان کو دوسری نوکری بھی ملنے کی امید ہے۔ اگر انشاء اللہ تعالیٰ مل گئی تو آئندہ انشاء اللہ العزیز ان کو اونچی بنا ہوا دیکھیں گے۔ ہاتھ ڈھل تر دریا یا کمر بیچ کھونسے کٹریا۔ ہاتھ بلھچی چملت آوے پڑ گئی موری نجریا۔ ارے یہ کون چلا آتا ہے۔ یہ اسٹاف کپتان سلمان احمد علی صاحب ہیں۔ جی اور نہیں تو کیا۔

تمھارا، محمد علی عفی عنہ

۱۵

حسن عباس صاحب کے نام

۱۴رمئی ۱۹۴۴ء

سلمکم اللہ، دعائیں مکرر۔

خدا کی عنایت سے تا ایندم زندہ ہوں اور تمھاری سعادت اور محبت سے ڈھارس ہے۔ ملاقات نہ ہونے کا افسوس ہے۔ اِدھر اتفاق سے تمھارے وہی کھنکڑ تھوڑی دیر کے لیے رودولی آگئے تھے کچھ کیا یا نہیں مگر دو روپے کے لڈوؤں کی ہانڈی گھوس میں کردی گئی۔ کہا ہے کہ اپریل میں انتظام ہوں گے۔ آخر مارچ میں یاد دہانی کرنا۔ جو مقامات حسب دلخواہ ہوں ان کی فہرست بھیج دو۔ دنیا بامید قائم۔ کوشش کرنے میں کیا نقصان ہے۔ اگر کوئی بھیک نہ دے گا تو کشکول تھوڑی پھوڑ ڈالے گا۔ قیصر دعا کہتی ہیں۔

ڈاکٹر کہتے ہیں ابھی مرنے کی نوبت نہیں آئی ہے مگر فراق کی وجہ سے بقول ایک شاعر کے۔ زندہ ام مگر مردہ، مردہ ام مگر زندہ

اگر مردِ باصفا دوستِ بے ریا میاں خورشید صاحب سے ملاقات ہو تو ان کے دل میں ایک نیازمند کی یاد تازہ کردینا اور سلام کہنا۔

محمد علی عفی عنہ

9 بٹلر روڈ، لکھنؤ

(غیر مطبوعہ)

---

(۱۶)

ہما بیگم کے نام

(علی گڑھ میں ملا) ۲/اپریل ۱۹۴۷ء

ہما پیاری، دعائیں قبول کرو!

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم
چنانکہ لفظ عصا گفت موسیٰ اندر طور

چھبّن کا خط تم کو پہنچ چکا ہوگا۔ ہم لوگ زندہ ہیں، مگر کیا زندہ ہیں۔

زندگی ہے یا کوئی جنجال ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

مگر باوجود اس کے اس دنیا کی ذلت، خواری، ٹھوکریں سب منظور ہیں۔ مگر اپنے ساتھ جانے کا نام نہ لیں گے۔ یہاں نوٹیفائڈ ایریا کا الیکشن تھا۔ بڑی دھوم دھام تھی۔ ممبر ہوگئے، پریزیڈنسی کے لیے اب دیکھیے کیا ہوتا ہے۔

برخوردار بنایا ہے ابلیس کو غرور کی جو سزا ملی وہ تو تم کو معلوم ہے مگر خلا کی طرف عالم بالا کے لوگ نہیں دیکھتے۔ یہ کیا معاملہ ہے۔ خلا کی بی بی کو کہا جاتا ہے کہ الیکشن کی ہڑبونگ میں قصائیوں اور کنجڑوں نے مارا۔ معلوم نہیں سچ یا جھوٹ ان کو معلوم ہوا کہ یہ خبر آفاق کی لڑکی تحسین نے مشہور کی۔ انھوں نے ڈگی پٹوائی کہ تحسین ماری گئیں کسی نے یقین نہیں کیا۔ مگر ڈگی پٹوانے والوں کی حرمزدگی سب پر آئینہ ہوگئی۔

میں جانتا ہوں ان باتوں سے تم کو دلچسپی کم ہوگی۔ مجھ کو بھی کوئی خاص دلچسپی سوا مسلم لیگ کے اور کسی چیز سے نہیں۔ مگر کاغذ کا پیٹ کیوں کر بھرا جائے۔ میں اب اچھا ہوں اور تندرست ہوں۔ مگر دل نہ معلوم کیوں آرام میں نہیں ہے۔

اچھا چھوڑو اس راگ کو کچھ اپنا حال لکھو کچھ عابد کا حال لکھو۔ تم دونوں آدمی میرے دل کی تسکین ہو۔ اس لیے سکون بھیجو۔ اور میری عاقبت بخیر ہونے کی دعا مانگو۔ نہ خدا میں یقین پورا نہ رسولؐ میں نہ اعمال نیک میں نہ جزا میں نہ سزا میں نہ کتاب میں نہ میزان میں نہ حشر ونشر میں مگر ہر وقت ہر چیز کے لیے اللہ میاں سے دعا ہی مانگا کرتا ہوں۔

بادشہ رابندۂ کم خدمت و پُرخور ہست

لو اتنا سب کچھ لکھنے کے بعد پھر وہی میرے اللہ میاں ہما اور عابد دونوں کو امتحان میں سرخرو کرو۔ آمین ثم آمین!

دعاً •

محمد علی عفی عنہ

چودھری صاحب محمد علی ''قوم شیخ صدیقی، ساکن رُدولی، آبائی پیشہ تعلقداری، نام تعلقہ امیر پور ضلع بارہ بنکی صوبہ اودھ ..... مرزا عبد القادر بیدلؔ اور مرزا غالبؔ کے تتبع میں قلم کاری کا آغاز کیا اور نثر میں صاحب اسلوب ہوئے۔''

''...... نوجوانی میں سید کرامت حسین صاحب کے عقیدت مند اور آخر میں مجتہد ناصر حسین صاحب کے حلقۂ ارادت میں رہے۔ زندگی بھر لٹریچر کو بطور مشغلہ اور فلسفے کو اوڑھنا بچھونا کیا۔ جس زمانے میں ان کا تعلقہ کورٹ کے زیر اہتمام رہا تو چند دن بینک میں ملازمت کا شوق پورا کیا۔ چھے برس تک صوبائی کاؤنسل میں اودھ کی نمائندگی کی۔ بہت اچھے شاعر تھے۔ تاریخ گوئی میں کمال حاصل تھا .....''

(مرزا حامد بیگ۔ ''سوغات'' 9 بنگلور)

(۱۷)

ہما بیگم کے نام

ایبٹ آباد   نومبر ۱۹۴۷ء

ہما پیاری۔ دعائیں قبول کرو۔ تمھارا بڑا عمدہ خط آیا۔ ہم کو تو یہ خوشی ہے کہ اس تہلکے میں ہم موجود ہیں۔ جو لوگ ہمارے پہلے مر گئے، وہ تموج 'طوفان' جوار اور بھاٹے سے بے خبر رہے۔ ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق۔ اگر صرف بَیل کی ایسی زندگی ہوئی جس نے ہل چلایا۔ بھس کھائی، جگالی کی اور مر گئے تو عقل و دماغ کا مصرف کیا ٹھہرا۔ وہاں[1] کا حال سن کر چھاتی پہاڑ ہوئی۔ وہاں کی مشکلات سن کر کلیجہ پانی ہوا۔ تمھاری دعائیں سن کر دل سے آمین نکلی۔ اس سے زیادہ اور کر ہی کیا سکتے تھے۔ نئ نادن بانس کی نہنی۔ یہاں کے حضرت آدم ہی نرالے ہیں۔ سمجھ دار لوگ جواہر لال نہرو سے لے کر ردولی کے میاں لطیف الرحمٰن (41) تک حالت سنبھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر ڈیماکریسی شخصی حکومت تو ہے نہیں، یہاں تو جو زیادہ آدمیوں کا نمائندہ ہو وہی لیڈر ہے۔ لیڈر ہزار ہزار آکسفورڈ ساربان، ہارورڈ اور بان کا پڑھا ہو کام وہی کرنا پڑے گا جو خلق بھیڑیا، دَھسان کہے گی۔ ڈیماکریسی کا عجیب کھیل ہے اس میں سب سے زیادہ سمجھ دار آدمی کی بات نہیں چلتی اور نہ سب سے زیادہ بے وقوف کی بات چلتی ہے بلکہ سب کی عقلوں کا مجموعہ کر کے اوسط نکالو جیسا اوسط ہوگا ویسا کام ہوگا۔ ڈیماکریسی میں ہر شخص کا معیارِ علم اونچا ہونا چاہیے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو وہی چین یا ہندستان کی ایسی ڈیماکریسی بنے گی۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی غیر مہذب ملک خالی ڈیماکریسی کا نام لینے سے اول درجے کا ملک نہیں ہوسکتا ہے۔ تمھارے لاہور میں ایک تانگے والا تھا۔ وہ یقیناً اکثر نیشنلسٹ لوگوں کی سواری میں رہا کرتا تھا۔ ان سے سنا کرتا رہا ہوگا کہ سب خرابی ''چرچل'' کی وجہ سے ہے۔ جس دن انگلستان میں کنزرویٹو گورنمنٹ نے استعفیٰ دیا اس نے سنتے ہی چورا ہے کے کانسٹبل کی پیٹھ پر دو کوڑے سڑکائے۔ ''ہات تیری کی'' چرچل گیا۔ اب ہم آزاد

ہو گئے۔ بہت ظلم کر چکے، اب ہمارا داؤں ہے۔ آج کل یہاں بقرعید تھی۔ اب عید کے پیچھے 'تز' کا جماؤ دیکھیے۔ جعفر مہدی کے گاؤں میں ایک خون ہو گیا۔ خیر بقرعید کی لڑائی تو پرانی خبر ہے۔ رات وزیر گنج میں ہندو بہت خفا تھے کہ گاؤں میں مسلمانوں نے بکرے کی قربانی کیوں کی۔ سیدن پور میں ہندوؤں کا بڑا جماؤ تھا کہ گائے چھوڑ تین دن بکرے کی بھی قربانی نہ کرو۔ اس کے بعد تم بکرا کر سکتے ہو۔ بنارس اور چند اور ضلعوں میں گائے حلال ہونا بالکل سال بھر کے لیے بند کر دیا گیا۔ زراعتی ملک جہاں آبادی دن دونی رات چوگنی بڑھ رہی ہے جہاں غلّے کی کمی، چارہ کی کمی، زمین کی کمی، بیکار جانوروں کو بھس باندھ کر دیا جائے گا تو کام کرنے والے جانوروں کا پیٹ کیونکر بھرے گا۔ ہندستان کے ایسے ذلیل جانور شاید ہی کہیں نکلیں۔ ہزاروں گائیں، بکری سے کم دودھ دیتی ہیں، ہزاروں بیل گدھے کے قد کے ہیں مگر اس طرح کی اندھیر نگری چوپٹ راج نہ ہو تو ڈیماکریسی کا مزا ہی کیا کہ ریل، ڈاک خانہ، ہر جگہ ڈیماکریسی کا جلوہ رونما ہے۔ کوئی چیز ایسی نہیں جہاں ڈیماکریسی کی چکاچوند لوگوں کو اندھا نہ کیے ہو۔ انگریزوں کو لوگ جان بُل کہتے ہیں یعنی دماغ سے بہت کام نہ لے سکیں مگر ہاتھ پیر ہلانے میں کسی سے ہیٹے نہ ہوں۔ یہی دماغ کی کمی تھی جس نے ڈیماکریسی کی آفت بہت پر ڈھائی۔ انگریز غریب کی نو برس کی ڈیماکریسی بھلا ہندوؤں کی ہزاروں برس کی تہذیب کا کیا لگا کھا سکتی ہے۔ کیمیا میں بعض دوائیں ہیں جو بعض دواؤں سے تال میل نہیں کھاتیں۔ اگر ایسی دوائیں ملا دی جاتی ہیں تو بھک سے اڑ جاتی ہیں یا سوڈا ایسڈ کی طرح بلبلانے لگتی ہیں۔ یہ دوائیں اگر موافق دواؤں سے ملائی جائیں تو فائدہ مند ہوتی ہیں۔ خود مفرد بھی بے ضرر ہیں۔ مگر غلط دواؤں سے مل کر یہی نتیجہ ہوتا ہے جو ہندوئیت کا ہو رہا ہے۔ ہندو بذات خود نرم مزاج، شائستہ، خون بہانے سے متنفر، خیرات کرنے والا مگر ڈیماکریسی سے متوالا ہو گیا ہے۔ اس غریب کی ایسی حالت ہو گئی ہے جیسے کسی شائستہ معلم کے کتے کی دم میں پیپا باندھ دو۔ اب تم ہزار پکارو ٹیپو، ٹیپو۔ میاں ٹیپو ہیں کھڑبڑ کھڑبڑ کرتے چلے جاتے ہیں۔ کیسی تعلیم، کیسی تربیت، میاں ٹیپو اپنے آپے سے باہر ہو چکے ہیں۔ یہاں کا پالی ٹیشین عذر خواہ ہے کہ نواکھالی میں مسلمانوں نے ایسا کیا کہ ہندو کو ہر جگہ کرنا پڑا۔ پنجاب میں سکھ مسلمانوں کو اور مسلمان

ہندو کو ذمہ دار ٹھیراتے ہیں۔ پہلے اور پیچھے کی بحث بالکل وہی بحث ہوگئی جو انڈے اور مرغی کی ہے کہ پہلے انڈا پیدا ہوا کہ مرغی۔ اصل بات جو غور کرنے کے قابل ہے وہ یہ کہ آیا ہم لوگوں میں یہ کتے بلی والی بات پہلے سے موجود تھی یا اکبارگی نواکھالی اور کلکتہ نے ماہیت بدل کر ہم کو آدمی سے جانور کر دیا۔ ہم کو تاریخ اور خود ذاتی تجربہ بتاتا ہے کہ جب مسلمانوں کا راج گیا اور ڈیما کریسی کا نام ہندوؤں نے سنا اسی دن سے اس فساد کی بنیاد پڑی۔ ہندو ذہنیت ہی دوسری ہے۔ ہندو ہزار برس سے مسلسل غلامی میں مبتلا ہیں۔ اس کے پہلے بھی کم و بیش یہی حال رہا۔ ان میں یقیناً کوئی فطری خامی ہے کہ یہ ایمپائر یا شہنشاہی نہیں کر سکتے۔ خیال پڑتا ہے کہ وہ خامی خودغرضی ہوگی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ خدا سب کے لیے اور بندہ اپنے لیے۔ اس مسئلہ کو جیسا ہندستانی سمجھتا ہے دوسرا نہیں سمجھ سکتا۔ اس معاملے میں ہندستان کے ہندو مسلمان سب ایک ہیں کیونکہ ہم دونوں کی رگوں میں بھی وہی خون ہے لیکن ہم لوگ عرب کے قدیم تعلق کی وجہ سے لفظ مساوات سے بالکل غیر مانوس نہیں رہے ہیں۔ گو اسلام میں ڈیما کریسی کبھی رہی بھی ہے تو صرف تیس سال یا اس سے بھی کم (حضرت عثمان کا زمانہ نکال ڈالو) مگر مسلمانوں کو کسی نہ کسی طرح یہ معلوم ہمیشہ سے تھا اور ہے کہ انسان کا مطمح نظر مساوات ہونا چاہیے۔ تم نے ہندستان بھی دیکھا، پاکستان بھی دیکھا، تم مجھ سے بہتر فیصلہ کر سکتی ہو۔ خود لفظ قائداعظم میں وہ بات موجود ہے جو نماز میں ہوتی ہے۔ یعنی ؎

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز

مگر امام نماز پڑھا رہا ہے۔ تو میں اس طرح نہیں بنتی ہیں کہ خون، گوشت، پوست کہاں سے آیا۔ بلکہ اسطرح بنتی ہیں کہ ہم کس طرح جینا چاہتے ہیں، اور مرنا چاہتے ہیں۔ اور دوسرا کس طرح۔ صاف بات ہے کہ اس معاملے میں ہمارے اور ہندوؤں کے خیال میں اختلاف ہر جگہ دکھائی دیتا ہے۔ خود مجھ کو اگر کسی چیز سے دھڑکا ہے تو خون، پوست، گوشت ہونے کی وجہ سے کیونکہ جو مادّہ ہم میں بھی ہے وہ پھوٹ کا مادّہ ہے۔ اگر خدانخواستہ نصیب دشمناں لاکھ کوس دور سات قرآن درمیان، شیطان کے کان بہرے اگر کبھی پاکستان میں کوئی اعلیٰ درجے کا شیرازہ بند نہ رہ گیا تو کہیں یہی پھوٹ اوراق کو

پریشان نہ کردے، کیونکہ کچھ ہو پھر بھی خون گوشت پوست تو وہی ہے۔ اب اس جگہ بی بی عقیدت کو چھوڑ کر عقیدت کی آڑ پکڑو اور دعا مانگو کہ اس جواں ہمت، جواں عقل و گراں سال بڈھے کو خدا ہم لوگوں کی تھوڑی تھوڑی عمر عطا کر کے تادیر قائم رکھے۔ آمین ثم آمین۔ اور اس کے بعد اس کا روحانی تصرف ہم پر چھایا رہے۔ آمین، ثم آمین! یارب العالمین۔ اچھا خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ باتیں تو تھیں ہندو اور ڈیما کریسی کی۔ ہندو ڈیما کریسی سے غیر سہی مگر حکومت اس کو بھی کر آتی ہے۔ اس کے یہاں ایک چیز ہے جسکو راج نیت کہتے ہیں۔ اگر بیٹی مجھ سے پوچھو تو سچا ہندو اور اس کی راج نیت کو میں تمھاری ڈیما کریسی سے بھی بہتر سمجھتا ہوں۔ آج بھی اگر ہندو پر سے انگریزی شراب کا نشہ اتر جائے تو ہندو کا کیا کہنا۔ اپنے مولوی اور ہندو فقیر کا مقابلہ کرلو۔ تمھارا مولوی اپنے کو بے دلیل نائب رسولؐ کہتا ہے۔ اس کا فقیر اپنے کو خدا کا جزو سمجھتا ہے۔ یہ رسالت کا انداز چھوڑ کر فرعونیت کی شان سے کفر کا فتویٰ دیتا ہے۔ وہ اپنے دل کی وسعت میں سب کی جگہ پاتا ہے۔

ادیم زمین سفرۂ عام اوست
بریں خوان یغما چہ دشمن چہ دوست

سنو، ایک قصہ سنو! ریل پر میرا اور ایک ہندو سوامی کا ساتھ ہوا۔ اس کا صاف بے کینہ چہرہ مجھ کو اچھا لگا، بکنے کی تو عادت ہے ہی میں اس سے کہنے لگا کہ دل کا آئینہ شفاف کرنے کی حسرت مجھ کو بھی ہے مگر مایا نہیں چھوڑتی۔ اس نے کہا میں تم کو بتاؤں عورت کو ترک کر دو۔ میں نے کہا واہ سوامی جی واہ آپ یہ کہتے ہیں اور ہمارے آقائے ولی نعمت یہ حکم دیتے ہیں کہ بیاہ کرو، نسل بڑھاؤ، تعداد زیادہ کرو تاکہ تمھاری وجہ سے میں دوسری امتوں پر مباہات کروں۔ بھلا یہ مجھ سے کیسے ہوسکتا ہے۔ اس نے پھر اسی نفس پاک سے، بے لوث مسکراہٹ سے جواب دیا ''اچھا خیر ایسے ہی چلے چلو، اس کے یہاں سب کی جگہ ہے۔''

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم
چنانکہ لفظ عصا گفت موسیٰ اندر طور

تم سے باتیں کرنے کا مزا بڑھتا جاتا ہے۔ اور سنو ناگے فقیروں کا ایک بہت بڑا

غول رودولی آیا۔ان کے ساتھ گھوڑے، اونٹ، رتھ، بیل تھے، یہ لوگ برخلاف اُس سوامی کے لڑاکا قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ دوسرے دن وزیر گنج سے ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا کہ ناگے لوگ آئے ہیں اور بھوسا، پیال، لکڑی تحصیل کر رہے ہیں۔ میں نے فوراً تھانے پر اطلاع کروائی۔ تھوڑی دیر بعد کیا دیکھتا ہوں کہ ایک جوان شاندار ناگا چلا آرہا ہے۔اس نے کہا "بابا ہم کو پوجا کے لیے پھول چاہئیں۔ میں جھنجھلایا تو بیٹھا ہی تھا میں نے کہا ہم نے پھول اپنی خوشی کے لیے لگائے ہیں کہ تمھارے پوجا کے واسطے ہم پھول ووں نہیں دیں گے۔ جس آن کے ساتھ وہ آدمی پھرا ہے اس وقت تک میری آنکھوں کے سامنے ہے، نہ غصہ، نہ کینہ، نہ خوف، نہ جھنجھلاہٹ، نہ مایوسی۔ کسی چیز کا شائبہ بھی نہ تھا۔ وہی نفس کی شرکت سے پاک انداز

نہ دل میں بدی ہو نہ کینہ نہ بیر
یہ گھر صاف ہو ہو کے دکھلائے سیر

کوئی تعجب نہیں کہ یہ ناگا برخلاف اس سوامی کے لڑاکا رہا ہوگا۔ مگر باوجود اس کے اس تعلیم کا پتہ ضرور چلتا ہے جو ان لوگوں کی ہوتی ہے۔ ہاں راج نیت تو ٹھیک ہے مگر سماج نیت کا نیا ڈھونگ غضب ہی تو ہے۔ ہندو بے چارہ انگریزوں کے ڈرانے سے Theocracy یعنی مذہبی طرزِ حکومت سے ڈر گیا ہے۔ جیسے تم! خیالی کہانی نہیں مگر خیالی بی بی سے ڈرتی تھیں۔ وہ تھیوکریسی برتتا تو ہے مگر منھ سے تھیوکریسی کا نام نہیں لیتا۔ ابھی عید کے پہلے جواہر لال نہرو نے لکھنؤ آکر ایک لمبی چوڑی تقریر کی تھی۔ تقریر کیا تھی دیوانی ہانڈی تھی۔ اس میں یہ بھی تھا کہ یہ Theocratic اسٹیٹ نہیں ہے بلکہ جمہوری ملک ہے اس کو تھیوکریٹک اسٹیٹ مت کہو۔ انھوں نے ووٹ لینے کی خوشامد میں پھر کہا "چونکہ ہندو زیادہ ہیں اس لیے ہندوؤں کی بات چلے گی، مگر تھیاکریسی نہیں ہے۔ کوئی صاحب آگ لائے تھے اور کہتے تھے اس کو آگ مت کہو یہ تو بھندر ہے۔ تمھارے یہاں بھی کیا جاتا ہے۔ اگر پاکستان تھیوکریٹک اسٹیٹ نہیں ہے تو پھر کیا ہے۔ اسی تھیوکریسی کی بنا پر جناح کانگریس سے علیحدہ ہوئے۔ اسی تھیوکریسی کی وجہ سے مسلمانوں کا سب سے بڑا اور دنیا میں پانچواں بڑا ملک بنا۔ خدا اس کو برقرار اور برِاقتدار رکھے۔ آمین!

مذہب نے دنیا کو بہت سنوارا ہے اور اس کا مصرف اب بھی ہے۔ نام بدلنے سے ماہیت کیونکر بدل جائے گی۔ پھر تھیوکریٹک اسٹیٹ کیوں نہ کہا جائے اور مذہب کے بڑے لوگوں کے واسطے توفیق کیوں نہ مانگی جائے۔ ہندو مذہب اور معاشرت کوئی الگ الگ چیز نہیں۔ مذہب، معاشرت، سیاست سب کچھ ہندستان کا پیدا ہوا ہے اور الگ نہیں کیا جاسکتا۔ جو مذہب باہر سے آیا ہو وہ بدل سکتا ہے جو یہیں کی زمین، آسمان، آب و ہوا، دریا، پہاڑ، پھل، ترکاریوں کے تقاضے سے تیار ہوا جس کا نشوونما ارتقائی ہے اس کے بدلنے میں لوہے لگیں گے۔ جمہور کے معنی یہ ہیں کہ ہر شخص اس میں اپنا حق اور اپنا فرض پہچانتا ہو اور سب کام کریں۔ اگر کسی کو اس کا حق نہ دو تو وہ کیسے کام کرسکتا ہے۔ وہاں اور یہاں تقریباً پانچ لاکھ آدمیوں کا کام اس وقت یہی ٹھیرا ہے کہ وہ مار ڈالے جائیں اور ان کی کھاد تیار ہو۔ 25 لاکھ کا یہ ٹھیرا ہے کہ وہ اپنی کمائی لٹا کر چلے جائیں اور مالی اقتصاد تباہ ہوجائے۔ یہ یہاں کی مساوات ہے اور یہ ڈیماکریسی۔ سر گنے جانے کو ڈیماکریسی کیسے کہوگی۔ مگر ہندو اس پر خوش ہیں کہ ہم لوگ ڈیموکریٹک ہوگئے۔ اپنی جہالت یا دوسرے کو دھوکا دینے کو یا خود اپنے کو دھوکا دینے کو کہتے ہیں کہ ہم لوگ تو بہت ڈیموکریٹس ہیں۔ ہمارے یہاں گاؤں میں پنچایت تو ہمیشہ تھی ممکن ہے ایسا کسی زمانے میں کسی خاص حصے میں رہا ہو۔ مگر ہندستان کے ہزاروں حصے ہزاروں برس کی تاریخ اگر کسی جگہ کسی زمانے میں رہا بھی ہو تو وہ پورے ہندستان کی ذہنیت کیسے کہی جاسکتی ہے۔ معمولی پڑھا لکھا تو یہ دیکھتا ہے کہ یہاں جو پنچایت تھی وہ ''ورن'' کی بنا پر تھی یعنی جو جس خاندان میں پیدا ہوا ہے وہی کام کیے جائے۔ اگر کوئی بڑھئی کے ہاں پیدا ہوا ہے تو وہ چاہے پڑھ لکھ لے مگر کام بڑھئی کا کرے۔ بڑھئی، لوہار، دھوبی، برہمن گاؤں کی پنچایت میں سب ہی ہیں اس کو ڈیماکریسی کہنا معلوم نہیں ٹھیک ہے یا نہیں۔ مگر میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ وہ اسی طرح کی ڈیموکریسی تھی جس نے تمھارے قائد اعظم مدظلہ کو کانگریس سے بھگایا۔ شاید 1916 تھا کہ گاندھی کی اسپیچ پر قائداعظم نے کہا تھا:

''آج پہلا موقع ہے کہ کانگریس میں فرقہ وارانہ پہلو داخل ہوا ہے۔'' اگر مہاتما گاندھی نے یہ نہ کیا ہوتا تو پاکستان آج علم الٰہی میں ہوتا۔ خط لکھتے لکھتے سر میں چکر کا سا

شک ہوا۔ کھانے کے بعد دل بھی دھڑکا، پینسٹھ برس چھ مہینے کا خیال آیا۔ پھر یہ خیال آیا کہ نہ معلوم دور افتادگان کو دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی کہ ہم ہی ٹھنڈے ہوں گے۔ خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اتنے اتلاف جان میں خدا نے ہم کو اور ہمارے پیاروں کو باقی رکھا۔ الحمدللہ رب العالمین

چھمن اچھی ہیں۔ ہولو (42) ابھی یہیں تھیں۔ دو دن ہوئے الہ آباد گئی ہیں۔ سبط بھی آج کل یہیں ہیں۔ علاقہ ابھی باقی ہے مگر نہال اقبال کی جڑ میں دیمک لگ گئی ہے۔ زمینداری جائے۔ اگر زیادہ لوگ اس سے خوش ہوں تو کیا ہرج ہے۔ مگر تعجب تو یہ ہے کہ مہاجن کی توند، بلیک مارکیٹیر کا پیٹ، رشوت خوار کی جیب برابر پھولتی جاتی ہے اور ؎

برق گرتی ہے تو بیچارے زمینداروں پر

بدرل چچا تمھارے اچھے ہیں۔ بچوں کو پیار۔

تمھارا خادم

تمھارا باپ

۱۸

ہما بیگم کے نام

۷رفروری ۱۹۴۸ء

ہما پیاری۔ دعائیں

گاندھی کا پُرسہ قبول کرو۔ ایک شخص نے کہا ہے سقراط کو دنیا نے زہر کا پیالا دیا۔ عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب دی اور گاندھی کو سیسے کی گولیاں دیں۔ دنیا نے کچھ ترقی نہیں کی۔ جہاں تھی وہیں ہے۔ یہ تو ضرور ہوا، مگر سقراط کو زہر دینے والے دنیا سے ناپید ہو گئے۔ عیسیٰ علیہ السلام کو مارنے والے انیس سو پندرہ برس سے نکھرے پھر رہے ہیں۔ کیسے کہوں کہ ''راشٹر یہ سویم سیوک سنگھ اور ہندو سبھا دنیا میں پھلے پھولیں گے اور آباد ہوں گے اور پھر گو دنیا کی حالت ہزار نہ بدلے لیکن سوا ہندستان یا کسی بالکل وحشی ملک کے گاندھی مرحوم مغفور کے ساتھ یہ برتاؤ کہیں نہ ہوتا۔

جن لوگوں نے نہتوں کو مارا، بے بس عورتوں کو بے آبرو کیا وہی یہ بھی کر سکتے تھے۔ ممکن ہے پاکستان میں بھی کوئی کم بخت ایسا ہی نکل آتا۔ مگر جب تک کوئی کر نہ گزرے تب تک کسی آدم کی اولاد پر بہیمیت کا اتنا بڑا شک کرنا آدمی کی ذلت کرنا ہے۔ اس اعلیٰ اللہ مقامہ کا صرف یہ قصور تھا کہ اس نے ہندوؤں کی دوستی میں انسانیت کو برقرار رکھا۔ اس نے کہا میں بت کو پوجتا ہوں۔ گو صرف پتھر کو نہیں پوجتا میں سناتن دھرمی ہوں۔ میں نے تمام مذاہب کو جانچ کر سناتن دھرمی مذہب اختیار کیا ہے۔ اگر مسلمانوں سے لڑو گے تو دونوں خاک میں مل جائیں گے۔ پھر بھی اسلام تو ہندستان کے باہر رہ جائے گا۔ ہاں ہندویت ختم ہو جائے گی کیونکہ ہندویت سوا ہندستان کے کہاں ہے۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا۔ ایک پڑھے لکھے آدمی نے اس کو شہید کیا۔

ان الذین امنوا و الذین ھادوا و النصاری والصائبین من آمن باللہ

والیوم الآخر و عمل صالحا فلھم اجرٌ عند ربھم ولاخوف علیھم و لاھم یحزنون۔ صائبین میں گاندھی کا شمار ضرور بالضرور ہے۔ لاریب فیہ (عبداللہ یوسف علی کا قرآن دیکھو)

ممکن ہے یہ خط سنسر والے پکڑ لیں۔ مگر ہما بیگم مجھ کو اس مقبول قربانی کی وہ تکلیف ہے کہ عرض نہیں کرسکتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی بے حس اور بے مس پتھر نے وہ چینی کا برتن توڑ ڈالا جس کا قوام ہزار برس میں تیار ہوتا ہے ؎

گویند پس از ہزار سال از عالم روشن جانے ز آسماں زیر آید
خاقانی ازاں جنس دریں دہر مجو بردہ منشیں کہ کارواں دیر آید

چینی کی مثال مبتذل ہے۔ مگر کیا کروں اتنے بڑے عظیم حادثے پر غم چھایا ہوا ہے اور جودت مفلوج ہے اور سنو لوگ کہتے ہیں کہ جب گولیاں پڑ چکیں تو منکا ڈھل گیا۔ آنکھیں بند ہوگئیں اور ہاتھ اٹھ کر پوجا کے انداز میں جوڑے گئے۔ رام کا لفظ نکلا اور گاندھی اعلیٰ علیین مقامہ اپنے بنانے والے کے سامنے پہنچ گئے۔ خدا جس کی آبرو رکھتا ہے جس کی نماز قبول کرتا ہے یوں ہی کرتا ہے۔ چھوٹے ماموں مرحوم کی دو خصوصیات تھیں۔ ایک خیرات کرنا، دوسری عبادت، عصر کا فریضہ ادا کر کے نکلے، دو ہندو مسافر جارہے تھے، انھوں نے راستہ پوچھا، ماموں مرحوم ان سے کہنے لگے کہ دیر ہوگئی ہے آج ہمارے مہمان ہوجاؤ، صبح جانا۔ وہ رک گئے۔ ان کے پاس پیسہ کہاں تھے۔ بنئے کی دکان پر ان کو سیدھے (جنس وغیرہ) دلوا دیے۔ "گھی ضرور دینا، اچھی طرح سے دینا۔" اس کے بعد گھر چلے، طبیعت خراب ہوئی۔ شمن مرحومہ کے گھر میں چلے گئے۔ پان مانگا اور قبلہ رخ گر پڑے اور ختم ہوگئے۔ پلنگ اس طرح بچھے تھے کہ قبلہ رخ گرنا سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ مگر اللہ نے ان کو قبلہ رخ گرایا۔ یوں خاتمہ بخیر ہوا۔ جیسے ان لوگوں کے دن پھرے کہتے سنتے کے دن پھریں۔ آمین ثم آمین۔

ہما! میرا دل تو کہتا ہے کہ تم انشاء اللہ تعالیٰ جنت میں جاؤ گی۔ ہمارا البتہ تھل بیڑا معلوم نہیں ہوتا۔ مشہور ہے کہ نیک بندے ہم لوگوں کو بخشوائیں گے۔ یہ بات کچھ سمجھ میں

نہیں آتی۔ کیونکہ ہر شخص خود اپنا بوجھ اٹھائے گا لیکن اگر ایسا ہوا تو ہمارا خیال رکھنا، ہم کو
واقعی شکایت ہوگی۔

شنیدم کہ در روز امید و بیم
بداں را بہ نیکاں بہ بخشد کریم

سلمان کا تو کوئی خط بہت دنوں سے نہیں آیا۔ مگر الٰہن کا جی بھرا آیا۔ خدا تم لوگوں کو
خوش رکھے اور کیا عرض کروں۔ قیصر آج کل بہت آرام پہنچاتی ہیں۔ کل شام سے ذرا پارہ
چڑھ گیا ہے۔ اعصابی تکلیف سے میرا پارہ تو ہمیشہ ہی چڑھا رہتا ہے۔

پر ہوں یوں غصے سے میں راگ سے جیسا باجا
اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو۔ بچوں کو دعا، بدرل تم کو دعا کہتے ہیں۔

محمد علی عفی عنہ

---

(۱۹)

ہما بیگم کے نام

۱۴ر فروری ۱۹۴۸ء

ہما پیاری! دعائیں قبول فرماؤ۔ تمھارے بڑے اچھے خطوط آتے ہیں جن سے آنکھیں ٹھنڈی اور دل سکون پذیر ہوتا ہے اور میں پوسٹ کارڈ پر لکھ کر سمجھتا ہوں کہ کوئی بڑا پالا مار لیا۔ وجہ بی بی کیا ہے سنو۔

بہار پیشہ جوانے کہ عالمش نام اند
کنوں بہ بیں کہ چہ خوں می چکد ز گفتارش

میں زندہ ہوں اور تقریباً ویسا ہی ہوں جیسا تم دیکھ گئی تھیں۔ مگر اعصاب جواب دے گئے ہیں۔ یہ عارضہ بہت پرانا ہے۔ خالی ناطاقتی نے طاقت پائی ہے۔ کام سے ہمیشہ جی چراتا تھا۔ اب تو چور سزا یافتہ ہوگیا ہوں۔ کوئی کام سوا تم لوگوں کو خط لکھنے یا اس کا خواب دیکھنے کے اور نہیں رہتا۔ اُن کے خط کے بعد پاکستان سے کوئی خط نہیں آیا۔ ہم بھی تن بہ تقدیر بیٹھے ہیں۔ افرض امری الی اللہ یعنی گر پڑے کی ہر گنگا اچھا اب سنو۔ میں نے مہاتما گاندھی کی تاریخ کہی ہے۔ یہ نظرِ اصلاح پیش ہے۔

ہاو دال و طا الف سی جنوری ‏ ‏ ‏ بد کہ خلق از مرگِ او آمد بدرد
"ہادیہ آمد سرائے مدعیٰ" ‏ ‏ ‏ تخرجہ زد پیر رومی ز آہ سرد
تا دل صاحبدلے نہ آمد بد رو ‏ ‏ ‏ ہیچ قومے را خدا رسوا نہ کرد

آخری شعر مولانا کا ہے اس کے اعداد ہوئے 2416 منفی 468=1948 اس میں سے "ہادیہ آمد سرائے مدعیٰ" کے اعداد نکال ڈالو تو سنہ نکلتا ہے۔

۱۴ر فروری اس وقت سات بجنے میں تین منٹ ہیں۔ قیصر والی کوٹھری میں چھمن، قیصر، حسن عباس بیٹھے ہیں۔ یہ کارڈ لکھ رہا ہوں۔ تم لوگوں کا ذکر خیر ہو چکتا ہے تو پولیٹیکل

باتیں ہوتی ہیں۔

ہما بیگم جیو تم خط لکھا کرو تو جو حال الّن، ٹکّن، کاظم، سلمان وغیرہ کا تم کو معلوم ہوا کرے لکھ دیا کرو۔

اے صبا گر بہ جوانانِ چمن باز رسی
خدمت ما برساں سرو وگل وریحاں را

خادم دیرینہ

تمھارا باپ

"......میرے دل میں اہل بیت کی محبت ہمیشہ جاگزیں رہی اور آج بھی عقل کی بناء پر بہت ہے گو عقیدت کی بناء پر اُس درجہ کی نہ ہو۔ تب بھی میں ان حضرات کی دماغی، دلی، وجدانی، نسلی اور روحانی فضیلتوں کا خیال کر کے خوش ہوتا ہوں اور دل کے اندر بحمد اللہ ایک کشادگی پاتا ہوں......"

("میرا مذہب")

۲۰

ہما بیگم کے نام

ردولی، ۲۷ر فروری ۱۹۴۸ء

میری جان، دعائیں لو! تمھارے خطوط آتے ہیں ان کو پڑھ کر ایسا جی خوش ہوتا ہے جیسے دلائل الخیرات۔ یا عید کا قوط پڑھ لیا۔ یا جیسے صبح کی ٹھنڈی ہوا کھالی۔ آج صبح موسم اچھا تھا۔ گرمیوں کی سی رت تھی ؎

سردی ہوا میں پر نہ زیادہ بہت نہ کم

چاند کی روشنی پھیکی پڑ گئی تھی مگر آفتاب نہیں نکلا تھا۔ لا یرونٌ فیھا شمساً و لا زمھریرا۔ (خدا کرے املا ٹھیک ہو)۔

باغ میں گلاب کھلے ہوئے تھے مجھ کو تم لوگ یاد آ گئے۔

بنفشہ طرۂ مفتول خود گرہ می زد

صبا حکایت زلف تو درمیاں انداخت

یکبارگی لاہور کراچی کی سیر حاصل ہوگئی۔ اگر صلاح الدین صاحب (ایڈیٹر، ادبی دنیا لاہور) سے ملاقات کی نوبت آئے تو ان سے میری طرف سے سلام شوق اور اشتیاق دیدار عرض کرنا اور کہنا کہ میرے پاس ایک کتاب بھر کا مواد موجود ہے۔ اکثر وہ کہانیاں ہیں جو آپ کے رسالے میں چھپ چکی ہیں۔ بعض دوسرے رسالوں میں شائع ہوئی ہیں۔ شاید کچھ ہوں جو کہیں نہ چھپی ہوں مگر ایسی کم اور غیر اہم ہیں۔ اگر مسودے وہاں تک پہنچ سکیں اور ان کی پامردی سے چھپ بھی جائیں تو واہ واہ۔

کراچی سے بہت دنوں سے کوئی خط نہیں آیا مجھ کو شکایت نہیں ہے۔ No News is good news اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر شخص اپنے مکروہات میں گرفتار ہے۔ مگر ایک پوسٹ کارڈ بھر کا وقت ضرور نکل سکتا ہے۔ خیر ہوگا۔

نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال
مدت ہوئی کہ آشتی چشم و گوش ہے

آج کل ہما ہم اندر رہتے ہیں۔ جب سے تم لوگ سات سات آٹھ آٹھ برس کی ہوئیں تب سے اندر رہنے کو خیرباد کہا تھا۔ اب تم کہوگی یہ باسی کڑھی میں ابال کیسا، سنو "دلبر" بڑھیا جان بحق تسلیم ہوئی۔ اندر بن پاؤں کی لڑکی گوہری[43] اور قیصر کی بہن صوفیہ[44] ہے۔ نجبن[45] رات کو کوٹھے پر رہتی ہے۔ قیصر اکیلی ڈرتی تھیں۔ گھر بھائیں بھائیں کرتا تھا۔ اس لیے میں سہ دری میں رہنے لگا۔ قیصر اور سعید دالان میں رہتے ہیں۔ جب سے پیدا ہوا اس وقت کے پہلے نوکروں کا توڑا نہیں ہوا تھا اب نوکر دوا کے لیے نصیب نہیں۔ باہر نوکر چاکر ضرورت سے زیادہ موجود ہیں۔ مگر حرمدور نہیں ملتے۔

ان نینوں کا یہی بسیکھ
وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھ

تم اپنا سب حال لکھو مگر ماشاء اللہ تم یہ اوچھاپن تو کبھی کرتی ہی نہیں۔ اخفاء الشدت من المروۃ کی قائل ہو۔ حالانکہ تم عورت ہو لیکن ہم سے بہتر ہو۔

نالہ بہ لب شکستہ ایم، آہ بدل نہفتہ ایم
دولتیان ممسک ایم زر بہ خزانہ کردہ ایم

چھبن، بالو، رقی[46] سب بخیریت ہیں۔ جابر اچھے ہیں۔ قیصر سعید بھی خوش ہیں۔ بدرل چچا دعا کہتے ہیں اور سب دعا کہتے ہیں۔ زیادہ خدا حافظ۔ اگر موقع ہوا تو تمھارے خط کا انتظار کیے بغیر دوسرا خط لکھوں گا۔

محمد علی عفی عنہ

ہما بیگم کے نام

۶ / مارچ ۱۹۴۸ء

ہما پیاری! ہماری بے اثر دعائیں قبول فرماؤ۔ گزشتہ خط تم کو لکھ رہا تھا تو دل میں خیال گزرا کہ اپنی دلی تکلیفیں تم کو بتاؤں۔ پھر دل میں کسی نے کہا کہ محمد علی اس کے کرنے سے فائدہ۔ اول تو ہما کو تکلیف ہوگی۔ دوسرے اگر اس نے بھی لکھ دیا تو کیا ہوگا۔ عورتوں کی طرح بیٹھ کر آنسو بہاؤ گے اور کیا کرو گے۔ آخر وہی ہوا۔ تم نے لکھ دیا ''میاں جان کب آپ کو دیکھنا نصیب ہوگا۔'' ہم تمھارا خط آفاق کو سنا رہے تھے آواز گرفتہ ہوگئی۔ آنسو ٹپک پڑے۔ خود اپنی نظر میں ذلیل ہوئے اور دوسرے نے نہ معلوم کیا جانا ہوگا۔ خیریت اتنی ہوئی کہ آفاق اہل دل قسم کا آدمی ہے، موقع کی نزاکت سمجھ گیا ہوگا۔ ہما! تم نے اس کو غور کیا کہ جو بات تم لکھنے والی تھیں وہی میرے دل میں بھی آئی تھی۔ اسی وجہ سے میں نے تم کو لکھا تھا کہ

نالہ بہ لب شکستہ ایم آہ بدل نہفتہ ایم
دولتیاں ممسک ایم زر بہ خزانہ کردہ ایم

نہ معلوم یہی لکھا تھا یا کچھ اور مگر دل میں اسی قسم کے خیالات تھے جو تمھارے دل میں تھے۔ تمھاری جان سے دور، تمھاری بوبو مرحومہ کے بعد جہاں میں نے کوئی نظم اپنے حال کے موافق دیکھی لکھ لی۔ اب انھیں میں سے ایک نظم تمھارے واسطے لکھتا ہوں:

Absence hear thou my protestation
Against thy strength
Distance and length
Do what thou canst for alteration
For hearts of truest mettle

Absence doth join, and time doth settle

Who loves a mistress of such quality

He soon hath found

Affections around

Beyond time and place and all mortality

By absence this goodigain

That I can catch her

Where none can watch her

In some close corner of my brain

There I embrace and kiss her

And so I both enjoy and miss her

صلاح الدین صاحب کو میں الگ خط لکھوں گا۔ مضامین کی نقل کروا رہا ہوں۔ اگر کامیاب ہو اتو بھیج دوں گا۔ میرا اب سوا خدا کے گھر اور کہیں جانا مشکل ہی معلوم ہوتا ہے۔ آئندہ کا علم خدا کو ہے۔

دعا گو

محمد علی عفی عنہ

ہما بیگم کے نام

ردولی

جون ۱۹۴۸ء

ہما پیاری۔ دعائیں قبول فرماؤ۔ حالانکہ باوجود لا تقنطوا کے پھر بھی یقین نہیں آتا کہ ہماری دعائیں قبول ہوں گی۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہماری زبان پر جھوٹ کا چٹخارہ، منھ میں حرام کا مزا، دعا میں اثر کیسے ہو، دوسرے عقیدہ کمزور۔ اگر یہ باتیں نہ ہوتیں تو تم دیکھتیں میری دعاؤں کا اثر۔ ایک ایک تم میں کا دنیا میں سر پر تاج دھرے بیٹھا ہوتا اور اس کے بعد جنت میں کوئی میری گود میں بیٹھا ہوتا، کوئی کاندھے پر چڑھا ہوتا، کوئی پیٹھ پر لدا ہوتا۔ ہم جنت میں ماکیان چوزہ دار ہوجاتے۔ لوگ دیکھ دیکھ کر کہتے یہ آدمی اپنے بچوں پر فدا ہے۔ دوسرے کہتے بچے بھی تو کتنے سعادت مند ہیں۔ اچھا خیر، دیکھا جائے گا۔ ممکن ہے دعا کسی دن در اجابت پر پہنچ ہی جائے۔ میری رام کہانی سنو!

ردولی میں ایک اسکول ہندوسبھا والوں نے قائم کیا ہے۔ اس میں ایک بڑا بگھد ہر ہیڈ ماسٹر ہے۔ وہ عربی جانتا ہے، فارسی جانتا ہے، سنسکرت میں ایم اے وغیرہ ہے۔ اس سے ہم سے دوستی ہے۔ ایک دن شام کو وہ ہمارے یہاں بیٹھا تھا۔ چاند کی پہلی تاریخ تھی۔ تیج کا چاند دکھائی پڑا۔ میں نے کہا پنڈت جی چاند دیکھ کر میں نے آپ کا منھ دیکھا ہے۔ اس مہینے میں جو کچھ اچھا برا ہوگا اس کی ذمہ داری آپ کے سر۔ بی بی دوسرے دن سے اللہ دے اور بندہ لے۔ دنیا بھر کی بدقسمتیوں، سوء اتفاقیوں، نکبتوں، ادباروں نے یلغار کر دی۔ سب سے پہلے تو غلے کی وصولی کے سلسلے میں میرے اوپر خدا کے واسطے کو وارنٹ آ گیا۔ حالانکہ میں غلہ دے چکا تھا اور آخرکار گورنمنٹ کو وہ آرڈر واپس لینا پڑا۔ اس کے بعد معلوم ہوا کہ ہم سے پوچھا جائے کہ تمھارا علاقہ کورٹ کیوں نہ کرلیا جائے۔ زمینداریاں یوں ہی جارہی ہیں۔ کورٹ کا سوال ایسا کہ جیسے کسی تیسرے درجے کے مدقوق سے پوچھا جائے کہ تم کو حوالات میں کیوں نہ رکھا جائے۔ خیر اس کے اوپر نہ میں نے اعتنا کی نہ زیادہ فکرمند

ہوا اور گو کہ وہ مقدمہ ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ لیکن خیال ہوتا ہے کہ یہ خالی شرارۃً کیا گیا تھا یا کچھ اصلیت بھی ہو، بہرحال اس کی اہمیت کچھ نہیں۔ کوڑھ میں کھاج۔ راستے میں ایک لڑکا موٹر سے دب گیا۔ اسی دن ایک گواہ میری رعایا جو اناج کے مقدمے میں گواہی دینے جا رہا تھا اس کا ہاتھ ٹوٹ گیا۔ لوگ کہتے ہیں چڑھت حاکم اترت گرہ سخت ہوتے ہیں۔ چنانچہ اسی دن سے بحمدللہ کچھ امان ہوگیا۔ مقدمے سے چھٹی ملی۔ موٹر والا لڑکا بھی بچ گیا۔ اسی زمانے میں میرا بلڈ پریشر بھی 190 ہوگیا تھا۔ اب پھر سب باتیں بدستور ہوگئیں۔ فالحمدلله رب العالمین۔ بلڈ پریشر بھی کم ہوگیا۔ کام بھی چلا جاتا ہے اللہ کا شکر ہے۔

غرض اتنی ہے اس کہانی سے

ہم رہے جیتے سخت جانی سے

گو پریشانیوں کی وجہ سے تمھارے ہر خط کا جواب نہیں دیا۔ مگر درمیان درمیان تم کو اطلاع دیتا رہا۔ مگر خطوط کو اکثر راستے میں ہیضہ ہوجاتا ہے۔ معلوم نہیں غربت کی گور ملتی بھی ہے یا نہیں۔ تمھارے دو جوابی تار آئے۔ دونوں کے جواب دیے۔ ایک تو سلہٹ پیسے کی طرح واپس آگیا دوسرے کا انتظار ہے۔ تیسرا جوابی تار کجن کا بدرل کے نام آیا۔ اس کا بھی جواب دے دیا گیا۔ دیکھو تم کو ملتا ہے کہ ہم کو یا کسی اور کو جو محکمہ تار میں نوکر ہو۔ سب بچوں کو دعائیں، ہم سب کی طرف سے اور سوا دعا کے کیا لکھوں۔

راقم، دعا گو

تمھارا باپ

My dear censor! Evil to him who evil thinks you can see that all. This is about our private lives and no more. Please do not try to read what there is not.

ہما بیگم کے نام

ردولی ۲۳ر جولائی ۱۹۴۸ء

ہما پیاری! دعائیں اور شکریہ۔ نہ معلوم کیا ہے کہ کراچی سے کوئی صاحب خط لکھنے کی تکلیف نہیں کرتے۔ عاجز ہوکر میں نے بھی لکھنا کم کردیا تھا۔ مگر مجبور ہوکر ایک خط پھر کاظم کو لکھا ہے۔ تمھارے خطوط البتہ ریگستان کے بیچ میں نخلستان کا لطف پیدا کرتے ہیں۔ حالانکہ ان میں بھی مذہبیت اتنی غالب ہوتی ہے کہ خوشی کے ساتھ اپنی کمتری محسوس کرکے دل کانپ جاتا ہے۔ روزے کے اوپر جو عملی واقعات تم نے لکھے ہیں وہ تو کچھ میرے دل پر بیٹھے نہیں۔ جب بہت سی باتیں شرع کے خلاف جائز ہوں تو روزہ خور پر یہ سختیاں کہاں تک حق، انصاف اور شرع کا پہلو لیے ہیں۔ خیر ہوگا۔ تمھارے احکام القرآن پر دیباچہ لکھنا اس وقت تک تو ہوا نہیں ہے لیکن روز کوشش میں رہتا ہوں۔ خدا میرے منھ میں تمھاری طرف سے صندل لگائے آمین۔ میں ابھی تک مایوس نہیں ہوں۔ کیونکہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ جب لکھنے بیٹھ جاتا ہوں تو بہت جلد ختم کرلیتا ہوں۔ خود میری کتاب تیار ہے۔ مگر تم سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔ میری کتاب یقیناً یہاں بھی چھپ جائے گی مگر صلاح الدین صاحب کا ایسا دیباچہ کہاں پاؤں گا۔ صلاح الدین صاحب کو انشاء اللہ تعالیٰ الگ خط لکھوں گا۔ مگر کاہلی کا برا ہو وہ وقت نہ معلوم کب آوے۔ فی الحال تم یہ دریافت کردو کہ اگر اس نئی کتاب کے ساتھ میری ''صلاح کار'' اور ''گناہ کا خوف'' بھی چھپے تو کیسا ہو۔ میں نے یہ کتاب یعنی ''گناہ کا خوف'' ڈاکٹر حسین ظہیر(47) کو دی تھی۔ انھوں نے چھپوائی، ڈھائی سو کتابیں گورنمنٹ نے خرید لیں اور کا روپیہ آگیا۔ نفع کمانے کی ضرورت نہیں۔ وہ کتابیں حیدرآباد میں یونہی پڑی ہیں۔ ''صلاح کار'' میں نے خود چھپوائی ''اتالیق بی بی'' یونہیں بے دام عبدالحلیم شرر مرحوم کو دی تھی۔ تیس سال سے زائد ہوئے ہوں گے یا اس کے

لگ بھگ۔

اس وقت صبح کے آٹھ بجنے والے ہیں۔ ابر گھرا ہے، بوندیں پڑ رہی ہیں، باغ میں ہر طرف ہریالی ہے۔ بیس دن اُدھر ہر سبزی میں زردی، ہر پتی مرجھائی اور اب ماشاء اللہ ہر چیز ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے لڑکی میکے پہنچ گئی۔ ٹھنڈی ہوا پہاڑ سے بہتر چل رہی ہے، وہاں تو گرم کپڑے نہ پہنو تو چل لگ جائے۔ یہاں کھلے بندوں بیٹھے رہو۔ برسات کی جھڑی لگی ہے۔ درخت جھوم رہے ہیں، جب ہوا زور سے گدگداتی ہے تو ہنسی کے مارے ایسا لوٹتے ہیں کہ ہنستے ہنستے گر پڑیں گے۔ آج کل گلاب کی کلیاں توڑ ڈالی جاتی ہیں کہ آئندہ بہار میں درخت کمزور نہ ہوں۔ مگر آنکھیں رنگ کو ترس گئی تھیں۔ اس لیے میں نے کلیاں نہیں چنوائیں۔ پھول اچھے نہ سہی مگر رنگ تو ہے۔ گلاب کے علاوہ ساونی، چاندنی، انار خوب پھلے ہیں۔ کامنی کا کیا کہنا! بار الہا شکراً شکراً شکراً عفواً عفواً عفواً۔

راقم

تمھارا دعا گو

---

(۲۴)

حسن عباس کے نام

عزیزم سلمہ، دعا! تمھارا طویل طویل خط شکریہ کا آیا۔ بات بننے والی نہ تھی۔ خدا کا فضل ہوا بن گئی۔ ڈاکٹر کے دل میں اللہ میاں صاحب نے نیکی ڈال دی۔ اسباب جمع ہوگئے۔ اتو[1] کی محنت ٹھکانے لگی۔ ایمان کی پوچھو تو کام تو ڈاکٹر نے کیا ہم حملے کے وقت ملنے میں شریک ہوگئے۔ اگر تم شکریہ نہ بھی لکھتے تب بھی مجھ کو معلوم تھا۔

"شکر از تو بہانہ می جوید" تعجب تو یہ ہے کہ اظہار مشکوری میں خود نہیں چلے آئے جس سے میرا دل خوش ہوتا۔ اچھا خیر انشاء اللہ تعالیٰ عید میں آنا۔

یا رب اماں دہ تا باز بیند
چشم محباں روئے حبیباں

خیریت معلوم ہوگئی۔ دل خوش ہوا۔ چھ پیسے تمھارے اور تین پیسے میرے نہ سہی۔ دن بات کی بات پر پوسٹ کارڈ بھر دیا اگر اب میری یاوہ نویسی کے قائل نہ ہو تو غضب ہے۔

حاضر الوقت میر حلو صاحب[2] تسلیم کہتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ وہ تو آج آرہے ہیں تم کارڈ کیوں لکھ رہے ہو۔ یہ دیکھیے:

منع کرتا ہے مجھے یار کو لکھوانے کو
ناصحا آگ لگے اس ترے سمجھانے کو

محمد علی عفی عنہ

(غیر مطبوعہ) ردولی، ۸؍اکتوبر ۱۹۴۸ء

---

1. عطا حسنین ابن حکیم حسن عباس
2. حکیم حسن عباس کے دوست

(۲۵)

ہما بیگم کے نام

ردولی ۱۱ردسمبر ۱۹۴۸ء

ہما پیاری! دعائیں قبول کرو!

ادھر تمھارے دو خطوط آئے۔ میں نے اکھڑے اکھڑے جواب دیے۔ تم پریشان ہوگی یہ کیا ہوا۔ وجہ یہ ہے کہ آج کل میرا دل پریشان سا ہے۔ تم اپنی خیریت لکھو۔ جن کہانیوں کی نقل میں نے تم کو بھیجی تھی ان کی ایک نقل یہاں رکھ لی تھی۔ اطمینان تھا کہ اگر وہ نہ بھی آئیں تو نقل تو موجود ہے۔ اب جو ڈھونڈھتا ہوں تو بعض ان میں سے بھی غائب ہیں۔ ایک آدھی ایسی تھی جو تم کو بھی نہ بھیجی تھی۔ وہ تو ہمیشہ کے لیے گئی۔ خیر ہوگا اتنی تکلیف کرو کہ صلاح الدین صاحب سے تقاضا کرکے وہ بھجوا دو۔ ان کے چھپنے سے صرف میری انانیت اور اوچھے پن کو داد ملے گی۔ کتابیں بھی اولاد کی طرح ہوتی ہیں۔ اگر وہ پروان چڑھیں تو دل خوش ہوا۔ اگر یہ کہانیوں کا مجموعہ نہ بھی چھپ سکا تو سوا اتنے نقصان کے اور کیا ہوگا۔ سلمان کا خط نہ لکھنا بھی اسی ضمن میں آتا ہے کیونکہ باوجود ان کی خاموشی کے زندہ ہوں، کھاتا ہوں، پیتا ہوں، ہنستا ہوں، دوائیں بانٹتا ہوں، شعر پڑھتا ہوں، برج کھیلتا ہوں ؎

یوں ہی صبح ہوگی یونہی شام ہوگی ۔۔۔ یہی رات دن کا تماشا رہے گا
یہ دنیا ہے اے شاد ہرگز نہ الجھو ۔۔۔ ہر اک کچھ تو اپنی سی آخر کہے گا

ایک شعر میر حسن کا بھی سن لو ؎

دنیا ہے سمجھ کے دل لگانا ۔۔۔ یاں لوگ عجب عجب ملیں گے

ہاں بی بی تمھارا قرآن شریف کا ترجمہ کب تک چھپے گا۔ بچوں کو دعا قیصر دعا کہتی ہیں۔ سعید تسلیم کہتے ہیں۔ جابر اچھے ہیں۔ بی بی نہیں بچے نہیں، عقل نہیں، دل کی

آرزوئیں بالکل ہماری تمھاری ایسی، ظاہر میں تو بہلے رہتے ہیں۔ سینے کے اندر دل چھلنی ہوگیا ہو تو تعجب نہیں۔ اس وقت صبح کے سات بجے ہیں۔ سنیچر کا دن ہے، ۱۱ دسمبر ہے۔ جابر ابھی اٹھے نہیں ورنہ کہتے ہما اپیا کو ہماری تسلیم لکھ دیجیے۔ چھمن کو چائے بھیجی تھی مگر ان کے یہاں ابھی صبح نہیں ہوئی تھی۔ سب خیریت ہے۔

تتمہ۔ یہاں اسکول کی ایک استانی ہیں خورشید بیگم، ان کے میاں ہیں تمن صاحب، معمولی سی اردو فارسی پڑھے ہیں مگر اشعار ہزاروں یاد ہیں اور اشعار کے فلسفے سے انھوں نے پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ کبھی کوئی برا شعر ان کے منھ سے نہیں سنا اور مختلف اشعار کی حکمت کا پتہ ان کی زندگی سے چلتا ہے۔ خوددار، منکسر، لکھنؤ کی نرمی مزاج میں، خود اپنا ذکر کبھی نہیں کرتے۔ متوازن، مقتصد، بقول جناب امیر علیہ السلام کے "جلیس خیر نعمة" آج کل آئے ہوئے ہیں۔ میرا دل ان سے بہل جاتا ہے۔

ہاں بی بی مسودے کا پارسل بھیجنا تو رجسٹری شدہ۔ سو روپے کا بیمہ کرا کر بھیجنا، دیباچہ علیحدہ دوسرے پارسل میں بھیجنا۔ کہانیاں الگ اس میں تمھارے تین چار روپے صرف ہوں گے۔ اتنی قیمت کا قرض دار رہوں گا۔ تاکید جانو۔

خادم

محمد علی عفی عنہ

ہما بیگم کے نام

رودولی ۱۶؍دسمبر ۱۹۴۸ء

ہما بیگم! سنو آج کل میں بہت پریشان رہا اور پریشان ہوں۔ مگر میری پریشانی موٹاپے پن کی ہے۔ سکھ روگ لگا ہے بعض وقت خیال ہوتا ہے کہ کفران نعمت کر رہا ہوں پھر عقل کہتی ہے۔

ہوجائے گا چھوٹی چھوٹی باتوں میں خفا
کیا تونے خدا کو آدمی سمجھا ہے!

اب مولوی لوگ ان کے کان بھردیں تو اور بات ہے۔ جیسا کھانا کھاتا تھا ویسے ہی کھانا کھاتا ہوں بلکہ شاید اس سے بہتر اللہ دے دیتا ہو کیونکہ قیصر آج کل ہمیشہ سے بھی زیادہ خیال کرتی ہیں۔ نیا ریشمی لحاف اوڑھتا ہوں، پھر اور کیا چاہیے، مگر دل نہیں مانتا

غم کھانے میں بودا دل ناکام بہت ہے
یہ رنج کہ کم ہے مئے گلفام بہت ہے

دکھڑا رونے کو اور کچھ نہ سہی تو یہی ہے کہ سلمان کا خط نہیں آتا۔

تمھارا باپ
محمد علی عفی عنہ

حسن عباس کے نام

عزیزی حسن عباس سلمہ، دعا

رضا حسنین غریب علیحدہ کر دیا گیا۔ تم خود ادب میں آ گئے۔ خدا تم سب کے لیے خیریت رکھے آمین۔

دشمن اگر قوی است نگہباں قوی تر است

دعا گو

محمد علی عفی عنہ

۳۰ر اپریل ۱۹۴۹

(غیر مطبوعہ)

"...... ایک بڑے بدصورت ادھیڑ میاں اور ایک خوبصورت کم سن بی بی راستے میں چلے جاتے تھے۔ بی بی نے ایک مٹنے کی جوڑی دیکھی، جو دونوں ایک ہی طرح کے تھے۔ میاں سے کہنے لگیں ایسا جوڑ ملتے بھی کم دیکھا ہوگا۔ انھوں نے جواب دیا ساتھ رہتے رہتے پہلے خیالات اور پھر صورت ملنے جلنے لگتی ہے۔ بی بی کا جی دھک سے ہو گیا کہنے لگیں۔ میری جان کیا ہمیشہ یہی ہوتا ہے......"

(''دھوکا'')

(۲۸)

ہما بیگم کے نام

ردولی

یکم مئی ۱۹۴۹ء

میری جان سنو! راضی برضا رہنا تو ٹھیک ہے مگر اس کے معنی اتنے سہل نہیں ہیں جتنے بادی النظر میں معلوم ہوتے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آدمی اپنے کو اور بلند کرتا جائے اور بلند کرتا جائے۔ امتحانِ خدا کا شائبہ ہر گھڑی زیادہ ہوتا جائے۔ قدیم اصول مصوری کا تھا کہ فطرت کی نقل جہاں تک ہو سکے اتارتے چلے جاؤ۔ اسی کے ساتھ یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ ہزار نقل کرو گے پھر بھی فطرت کی پوری نقل نہ اتار سکو گے۔ لہٰذا انسان صرف یہی کر سکتا ہے کہ برابر بہتر سے بہتر نقل اتارتا جائے اور پھر بھی یہی سمجھتا رہے کہ ابھی منزل مقصود بہت دور ہے۔ یہی حال کسی کی ننھی منی آزمائش کا ہے۔ ایک درویش نے کسی دوسرے درویش سے پوچھا کہ تمھارے شہر میں درویشوں کا کیا رویہ ہے۔ اس نے کہا کہ ان کو جب ملتا ہے تو شکرا ادا کرتے ہیں اور جب نہیں ملتا تو صبر کرتے ہیں۔ اس بزرگ نے کہا۔ ہاں ہمارے بغداد کے کتوں کا بھی ایسا ہی حال ہے۔ دیکھا تم نے کہ جب آدمی سمجھتا ہے کہ میں کسی بلندی پر پہنچ گیا ہوں اس وقت بھی وہ صرف معمولی سطح پر ہے۔

نہ ہو قناعت شعار گلچیں اسی سے قائم ہے شان تیری
وفورِ گل ہے اگر چمن میں تو اور دامن دراز ہو جا

دعا گو

تمھارا باپ

---

(۴۹)

ہما بیگم کے نام

ردولی　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　۱۹رنومبر ۱۹۴۹ء

میری جان، دعا! تمھارا محبت نامہ آیا۔ خدا تم کو خوش رکھے اور تمھاری مرادیں پوری کرے۔ جو پند و نصائح تم کرتی ہو وہ میرے دل میں بھی آتے ہیں مگر دل پر اللہ میاں قفل چڑھائے ہیں۔ وہ کسی طرح نہیں کھولتے اگر وہ قفل کھل جائے تو پھر کیا کہنا، اب نماز بھی زیادہ جی لگا کر پڑھتا ہوں اور دعا بھی بہت جی سے مانگتا ہوں۔ اس کے رحم و کرم کا خیال جی میں جماتا ہوں مگر ؎

مرا دل ایست بہ کفر آشنا کہ چندیں بار
بہ کعبہ بردم و بازش برہمن آوردم

اور اوقات میں بھی غور و فکر کر کے ایمان کے عقیدے دل میں مضبوط کرتا ہوں۔ مگر صبح کے وقت جس کو حضوری کا وقت کہو اس وقت دل میں وہی خیالات یلغار بولتے رہتے ہیں جن سے ایمان متنفر ہے۔

عالم بخروش لا الہ الا اوست
غافل بگماں کہ دشمن است ایں یا دوست
دریا بہ جود خویش خطے دارد
خس پندارد کہ ایں کشاکش با اوست

یہاں جی چاہتا ہے کہ خاص تعلق ہوتا جس کو Personal God کہتے ہیں مگر وہاں قاعدہ ہی اور دکھائی دیتا ہے۔ نماز کے بعد بارگاہ خدا میں عرض کرتا ہوں کہ بار الٰہا ایمان دے۔ اللہ میاں فرماتے ہیں ہمارا کام ہی ہے ایمان بخشنا۔ مگر تم خود اپنے دل میں ڈھونڈھو۔ یہ طلب تمھاری صادق ہے؟ میں عرض کرتا ہوں میرے مالک میری تمنا ایمان کی

روشنی سے سینہ جگ مگ جگ مگ کرنے لگے جی سے معلوم ہوتی ہے وہاں سے ارشاد ہوتا ہے کہ ہاں ہاں یہ تو ٹھیک ہے مگر غور کرو تم نے جوانی میں بہت سی عورتوں کو جانا ہے۔ بھلا ایمان سے کہو اس بے تابی، تڑپ، شوق کا کچھ بھی شائبہ ہماری تلاش میں پاتے ہو۔ میں عرض کرتا ہوں جی نہیں اُس طرح کی تڑپ، بے چینی تو نہیں پاتا۔ ایک دوسری طرح کی خواہش ضرور ہے۔ وہ فرماتے ہیں ہم تمھارے دل کا حال تم سے بہتر سمجھتے ہیں۔ یہ خواہش جو تم محسوس کرتے ہو تو یہ ہماری محبت کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ بوڑھے ہو گئے ہو، عورت منہ نہیں لگاتی۔ طاقت جواب دے رہی ہے، موت کھڑی گھور رہی ہے اس لیے اس طرح کے خیالات دل میں پاتے ہو۔ میں عرض کرتا ہوں بار الہا اب تیرے سمجھانے سے سمجھ میں آتا ہے۔ واقعی تیری خواہش انھی مجبوریوں سے ہوگی۔ مگر ہے تو۔ جوانی میں نہ سہی بڑھاپے میں سہی مگر اب تو ہے۔ اسی کا خیال فرما کر رحم کر اور دے دے دولت ایمان جواب ملتا ہے کہ ہاں ہاں چلے چلو۔

چرو وظیفۂ تو دعا کردن است و بس
در فکر آں مباش کہ نشنید یا شنید

اس میں بھی تمھارا فائدہ کچھ نہ کچھ تو ہے ہی۔ میں عرض کرتا ہوں ارے میرے رب میں تو اس سے زیادہ کی آس لگائے ہوں۔ تو رحیم ہے، کریم ہے، غفار ہے، تیرا کیا نقصان ہے اگر اس سے زیادہ دے دے میرے قلب کو تسکین ہو جائے۔ حکم ہوتا ہے زیادہ بک بک مت کرو۔ کہہ تو دیا ہے کہ چلے چلو اور کچھ نہیں تو جھوٹ سچ تمھاری عبودیت تو مضبوط ہوتی جائے گی۔ مگر مانتے ہی نہیں۔ قفل کھولو قفل کھولو کی رٹ لگا دی ہے۔ ابے ہم تیرے رگ پٹھے سے واقف ہیں۔ بہروپیا جھپ جھالیا دنیا بھر کا۔ آیا ہے وہاں سے ہوا باندھنے۔ میں عرض کرتا ہوں اب حضور مالک ہیں جو جی چاہیں کہیں۔ چھوٹا منہ بڑی بات۔ حضرت ابراہیمؑ نے یہی کہا تھا کہ قائل تو تو نے کر دیا مگر دل کو تسکین تو نہیں ہوئی۔ وہ بڑے آدمی تھے۔ تیرے مقرب تھے۔ ان کو کچھ نہیں کہا اور ہمارے اوپر خفا ہوتے ہیں۔ پھر آپ سے نہ کہیں تو کس سے کہیں۔ آخر کہاں جائیں کس سے عرض حال کریں۔ میں ساڑھے تین برس کا تھا۔ آپ نے باپ کا سایہ میرے سر سے اٹھا لیا۔ کہیے ہاں۔ اس کے بعد بے

دقوف چاہنے والی ماں نے لاڈ پیار کی انتہا کردی۔ اگر میں نے کسی کو مارنا چاہا تو اس نے ازار بند سے چونی کھول کر اس کو دی اور کہنے لگی کہ میرا بچہ یتیم ہے یہ لو چونی لو اور اس کو مار لینے دو۔ اس کا جی چھوٹا نہ کرو۔ گھر میں پھوپھا دادا رہتے تھے۔ وہ والد کے قصے سنایا کرتے تھے کہ تمھارے باپ نے یہ کیا وہ کیا۔ میرے دل میں بھی شوق پیدا ہوتا تھا کہ ہم بھی بڑے ہوں گے تو یہی کریں گے۔ اس کے بعد ہم کالون اسکول بھیج دیے گئے۔ وہاں سب طرح کے خیالات دل میں ڈالے گئے۔ جب جوانی قریب آئی تو تو ہی نے خیالات میں آزادی دی۔ خود رائے قائم کرنے کی قوت بخشی۔ ہربرٹ اسپنسر، مِل کے خیالات دل میں جمنے لگے۔ کفر و الحاد کی بنا پڑ گئی۔ جس طرح سے تو نے خسرہ[1] مقرر کیا ہے کہ سب کو نکلے اسی طرح سے شروع جوانی میں تیرے ہی حکم سے خیالات میں آزادی آتی ہے جیسے بعضوں کو اسی خسرہ سے سینہ کی بیماری ہوجاتی ہے۔ جو جان لے کر جاتی ہے۔ اسی طرح شروع جوانی کے خیالات بھی ہیں کہ بعضوں پر ان کا اثر نہیں رہتا اور بعض بے چارے ایسے بدقسمت ہوتے ہیں جن کو خیالات کی دق ہوجاتی ہے۔ جیسے دق کی دوا کرنے میں دوڑ دھوپ کرتے ہیں۔ اسی طرح ان خیالات کو بھی دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بہت سے خوش قسمت بچ جاتے ہیں۔ بہت سارے ہمارے ایسے جوانا مرگ پاتے ہیں۔ اب اس میں ہمارا کیا بس تھا اور کون بس ہے۔ حضور جان بخشی ہو تو ایک بات عرض کروں۔ ہاتف غیب، کہو کہو، کہے جاؤ ہم سنتے ہیں...... میں...... نیاؤ نہ کہن، کہن ٹھکرائی۔ ہاتف غیب کی آواز میں ایک ذری سی ہنسی اور خوش دلی کا انداز پایا جاتا ہے بڑے منطقی ہو۔ خوب زبان چلتی ہے۔ گھبراؤ نہیں چلے چلو، ہم وعدہ نہیں کرتے مگر اتنا کہے دیتے ہیں کہ بے آس مت ہو۔ جاؤ۔ اسی طرح سجدے میں پڑا رہتا ہوں حکم ہوتا ہے ہم سب کچھ جانتے ہیں۔ مگر تم اپنے دل کی بھڑاس نکال لو۔ کہو کہو...... کوئی ہرج نہیں۔ ہم اپنے بندوں کے عرض حال کو برا نہیں مانتے کہہ چلو...... میں...... بار الٰہا تیرے مذہب کی تعلیم دینے والے کہا کرتے تھے بس خدا میں یقین رکھو۔ ہم یقین کے معنی واعنی تو سمجھتے نہیں تھے مگر سن لیتے تھے۔ اس دن ایک امریکن کی ایک کتاب میں نکلا۔

---

1. چھوٹی چیچک

To believe in God is to desire his existence and what is more to act as if life existed.

لے بھلا حضور ہی فرمائیں ایک طرف تو منطق نے عقل کو باؤلا کر رکھا ہے دوسرے مولوی بے ایمان دنیا بھر کے خرافات بچپن سے دماغ میں ٹھونس رہے ہیں۔ اگر آپ کے بندے گڑبڑا جائیں تو کیا تعجب ہے۔ ہاتف۔ سنو محمد علی تم یوں ہی چلے چلو۔ ہم اپنا قاعدہ تو تمھارے لیے بدلیں گے نہیں مگر اتنا جان رکھو کہ ہم قہار جبار بھی ہیں اور رحیم و کریم بھی۔ ہم جانتے ہیں کہ تم کو ابھی اپنی بک بک سے سیری نہیں ہوئی ہے مگر تمھارا بکنا بالکل تحصیل حاصل ہے کیونکہ ہم سب کچھ سمجھتے ہیں۔ ہم تمھارے اوپر مشیت کے راز اپنے کھولنا نہیں چاہتے مگر اتنا بتائے دیتے ہیں کہ الایمان بین الخوف والرجا۔بس اٹھو سجدے سے، اپنا کام دیکھو۔ ہما پیاری! دنیاوی مصائب جو میں نے بیان کیے ہیں ان میں ممکن ہو کچھ مبالغہ ہو مگر ہیں اور بہت شدید ہیں۔ تمھاری پیٹھ کا درد بھی بے چین کیے ہے۔ کوئی اچھا خیال آتا ہی نہیں۔ لیکن میں ہر بات کے لیے تیار ہوں۔ اپنی موت سب سے سخت ہے۔ جب میں اس پر بھی راضی ہوگیا ہوں تو پھر کچھ اور کہنے کی حاجت نہیں۔

سنو ہما! تم کو تمھاری بہنیں لتری کہتی تھیں۔ اب نہ معلوم کہتی ہیں یا نہیں۔ مگر تمھاری خیراندیشی میں، تمھاری نیک نیتی میں کبھی کسی نے شک نہیں کیا اور مجھ کو تو دل و جان سے یقین تھا اور ہے کہ تمھاری بوبو مرحومہ اپنی سب خوبیاں تم کو دے گئیں۔ مگر ایک بات کہنا چاہتا ہوں تم سے کیسے تاب ہوگی کہ اس معاملے میں لتراپن نہ کرو۔ مگر میں مجبور ہوں کہنے پر۔ یہ سلمان مجھ کو خط کیوں نہیں لکھتے کوئی شکایت ان کو مجھ سے ہے؟ میں نے تو اپنے خیال میں کوئی تکلیف ان کو نہیں پہنچائی۔

رہ گئی بات کٹ گئی شب ہجر
تم نہ آئے تو کیا سحر نہ ہوئی

میں اسی طرح زندہ ہوں۔ ہنستا بھی ہوں، مضامین بھی لکھتا ہوں۔ برج بھی کھیلتا ہوں مگر سلمان والی کھٹک برابر رہتی ہے۔ تبرا کہنے کی وجہ سے میرے نانہال والے سخت بات کہنے کے عادی تھے۔ یہ ورثہ مجھ کو بھی ملا ہے مگر میں طبیعت کو روکتا ہوں۔ اپنی ہی

مثال لے لو۔ تمھارا خط آتا ہے اس سے مالی مصائب کم نہیں ہوتے۔ معدے کی تکلیفیں ویسی ہی رہتی ہیں۔ مگر ذری سی خوشی ہوجاتی ہے۔ جیسے کسی کو پھانسی کا حکم ہو چکا ہو اور جیل کے احاطے میں کہیں کامنی پھولی ہو، کال کوٹھری سے نہ درخت دکھائی دیتا ہو نہ پھول مگر اس کی خوشبو کمبخت قیدی کی ناک تک آجائے اور ایک لمحے کے لیے جی خوش ہوجائے، بس تم لوگوں کے خط سے کچھ ایسا ہی ہوتا ہے تمھارا دل چاہے خط بھیجو جی چاہے نہ بھیجو۔ کچھ زیادہ فرق تھوڑی ہوتا ہے۔ سلمان نے خود تو نہیں لکھا، مگر منن(50) سے دو تین خط خیریت کے لکھوا کر بھیجے، خدا منن کو خوش و آباد رکھے، اس کے بچے اقبال مند ہوں۔ میں اس کا ممنون ہوں مگر مجھ کو کچھ ایسی تکلیف ہوئی کہ میں نے جواب نہ دیا۔ کیوں جواب نہ دے سکا اس کو تم سمجھ سکتی ہو دوسرا جس نے مفارقت کی مصیبت نہیں جھیلی ہے کیا سمجھے گا۔ میرا دلی منشا تو یہ تھا کہ سلمان کو میرے خط کی خبر نہ ہوتی اور ان کا دلی خیال اس معاملے میں مجھ پر کھل جاتا۔ مگر تمھاری نیک نیتی اور اس جنتی لترے پن سے جو تم میں ہے یہ امید رکھنا فضول ہے۔ اگر ان کو مجھ سے کچھ شکایت ہوگئی ہے تو وہ معلوم ہوجاتی تو اس کھٹک سے تو نجات ملتی۔ بجائے اس کے یقیناً تم شیخ سعدی کی طرح مجھ کو اخلاق، محبت، صلہ رحمی، درگذر، آتما کی آنچ۔ والدین کے حقوق پر لیکچر دینے لگو گی اور میں اللہ کا شکر بھیجوں گا کہ ہما اس جگہ موجود نہیں ہیں۔ نہیں تو سارا غصہ ہما ہی پر اترتا۔ ایک خط ولایت سے آیا تھا جب وہ گئے تھے۔ انھوں نے لکھا تھا کہ آپ کی تکلیفوں، اختلاج وغیرہ کا حال سن کر مجھ کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرا ولایت آنا ہی رائیگاں گیا۔ کتابیں بھیجنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ پمفلیٹس بھیجنے کو کہا تھا مگر پھر صدائے برنخاست۔ خیر کتابیں نہ بھیجو نہ بھیجو۔ روپیہ یہاں سے جانے میں بڑی دقتیں ہیں۔ ان کے اخراجات میں اس کی گنجائش نہ ہو یہ صحیح مگر ویسے خط تو آتے جیسے وہ ہمیشہ لکھا کرتے تھے۔

ہما بیگم! اب دنیا کی ہر ہوس کم ہوگئی ہے مگر کتابوں کا شوق ویسا ہی ہے مگر جانے دو اس ذکر کو۔ ہاں ہما ایک بات کہہ دوں اگر تم نے اپنا پیٹ کاٹ کر یا بغیر پیٹ کاٹے ہی سہی تم نے کوئی کتاب بھیجی تو خدا و رسول کی قسم مجھ کو بڑی اذیت ہوگی۔ میں اپنے اللہ کو گواہ کرکے کہتا ہوں کہ میرا دل چاہے گا کہ دیوار سے سر پھوڑوں اس لیے بیٹی میرے اوپر رحم

کر کے ایسی بات نہ کرنا جس میں تمھارا باپ کم بخت بڑی شدید تکلیف میں مبتلا ہوجائے۔ اچھا سنو ایک کہانی سنو۔ اپنے باپ کی چھپی تعریف سنو۔ چھ ہزار میل پر بیٹھی بیٹھی ایک بڑے مومن، خداشناس، سخی، عابد، زاہد کی غیبت کے مزے اٹھاؤ اور گناہ بے لذت کا پشتارہ باندھ کر میدان حشر میں لے جانے کا سامان کرو۔

ایک تھے لاڈلے نواب، رہتے تھے پٹنہ شہر میں، نانہال دادھیال کے بڑے امیر، مگر کچھ ایسا بجوگ پڑا کہ ان کے ماں باپ کو نہ دادا کا ترکہ ملا نہ نانا کا مگر پالے گئے ناز ونعم میں۔ آخر تھے نہ لاڈلے۔ چھٹے ساتویں سال تک اسکول میں پڑھے اس کے بعد ڈنڈے بجانے لگے۔ ماں کے پاس پشتینی زیور وغیرہ کافی تھا کسی چوہے کو ایک گرہ ہلدی کی مل گئی تھی۔ وہ پنساری بن بیٹھا تھا۔ اسی طرح نواب لاڈلے صاحب نے ایک بات سوچی کہنے لگے۔ اماں ایک ترکیب ہے لاؤ اپنا زیور ہم کو دو ہم جواہرات کی سوداگری کریں تم کو موتیوں میں گوندھ دیں سونے کا گھر بنالیں۔ مُن نہ برسنے لگے تب ہی کہنا۔ اماں نے کہا بیٹا سچ مچ؟ کہنے لگے اور نہیں تو کیا دے دو، آج کل مانک کے دام بہت چڑھ گئے ہیں۔ وہ تمھارا چندن ہار ہزاروں کا بکے گا۔ کلکتہ کا ایک جوہری آج کل یہاں آیا ہوا ہے۔ بڑا دوست ہے ہمارا۔ ہم سے کہتا تھا کہ برما میں یاقوت کی تھیلیاں نیلام میں بکتی ہیں۔ ان میں بڑی چھوٹی چنیاں ہر طرح کی ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی اس میں کوئی بڑی کھڑ نکل آتی ہے۔ اگر نکل آئی تو اماں یہ جانیے کہ دن پھر گئے۔ نانا دادا والی ثروت پھر لوٹ آئی۔ نہیں تو نقصان کا ڈر تو ہے ہی نہیں۔ یہ دلی کے سادے کار جو چیزیں لاتے ہیں جیسی آپ کی مانک والی موتیوں کی چوڑیاں ہیں۔ ان چنیوں کے بازار میں یوں کوئی دام نہیں مگر جڑاؤ میں انھی کی قیمت دس گنی بیس گنی ہوجاتی ہے۔

تو بیٹا تم جواہرات کا حال جانتے بھی ہو اور جو دھوکا ہوا؟

جی نہیں دھوکا کیسے ہوسکتا ہے بھلا مجال ہے کہ کوئی تجپتا گاب پتی کر کے بیچ جائے۔ وہ پلکے کو پرب بتا دے۔ کارمندب کو یاقوت کہہ جائے۔ پولکی کو کمل کہہ دے اور ہم مان لیں۔

تو بیٹا تم تو بہت جانتے ہو یہ سب کہاں سیکھا؟ جی مجھ کو جواہرات کا شوق پیدائشی

ہے اور گھوم پھر کر بہت سی باتیں جانیں۔ یہی کلکتہ والا جوہری جو ہمارا دوست ہے۔ اس سے روز باتیں ہوا کرتی ہیں۔ بیٹا گھر میں جو کچھ ہے تمھارا ہے۔ خوب سوچ سمجھ لو، جی میں خوب سمجھے ہوں۔ آپ اطمینان رکھیں۔ محبت کا پاؤں جہاں درمیان میں آیا عقل نے استعفیٰ داخل کیا۔ ماں غریب کو یقین دلانا کتنی بڑی بات تھی۔ لاڈلے نواب صاحب جوہری ہو ہی بیٹھے جتنے دن کرسکے جواہرات کا بیوپار کیا، مگر اتنی دلچسپیاں تھیں کہ وہی ہوا جس کا ڈر ان کی ماں کو تھا پھر بھی دس پندرہ برس تو کٹ ہی گئے۔ اس درمیان میں بہت سے دل بستگیوں کا سامان ہوگیا۔ موسیقی، ستارنوازی، خوش خطی، شاعری، یکے بعد دیگرے دو شادیاں ہوئیں مگر ان کی زندگی بنی نہیں۔ دوسری بی بی ایک امیر خاندان کی تھیں۔ انھوں نے منھ نہیں لگایا۔ پہلی بی بی سے دو لڑکے بھی ہیں۔ مگر آج بی بی بچوں کا ذکر اس طرح کرتے ہیں جیسے کوئی کہے کہ "فلاں شخص سے ریل پر کئی بار ملاقات ہوئی تھی مگر اب بہت دن ہوئے شاید ہی پہچانیں۔ ہمارے حافظے میں بھی جو صورت ان کی ہے اس سے تو اب بدل ہی گئی ہوگی۔" ہما بیگم! مجھ کو لاڈلے صاحب کی کہانی بہت پسند تھی۔ مگر اب مختصر کیے دیتا ہوں۔ وہی شروع کی دوراندیشی سے دور زندگی میں چانڈو پینے کی بھی عادت ہوگئی تھی۔ یہ واقعات بیس برس کے ہیں۔

دوسرا دور

محرم کی پانچ تاریخ میاں محمد علی باغ کی طرف برآمدے میں بیٹھے دوا بانٹ رہے ہیں کہ ایک صاحب آتے ہیں۔ گورا رنگ، لانبا قد، دانت گر چکے ہیں منھ پر دو انگل کی داڑھی جیسے خط بڑھ گیا ہو۔ ایک نہایت پھٹی سی میلی اچکن پہنے پاجامہ دونوں گھٹنوں پر پھٹا، جوتوں کی یہ حالت کہ پاؤں گھسیٹ کر رکھتے ہیں۔ کرتہ ندارد، اچکن میں بھی صرف .. تین بٹن۔ ہاتھ کی مدد سے سینہ چھپائے ہوئے۔ بسم اللہ بیٹھیے۔ لاڈلے صاحب کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں۔ اپنا حال کہنا شروع کرتے ہیں۔ میں سوز پڑھتا ہوں شعر بھی کہتا ہوں۔ چودھری ارشاد حسین صاحب (51) کے یہاں کے محرم کی بڑی تعریفیں سنی تھیں۔ آیا تھا کہ شاید کسی مجلس میں پڑھنے کا موقع مل جائے۔ مگر بدقسمتی سے ملاقات نہ ہوسکی۔ دن بھر دروازے پر بیٹھے رہنے کے بعد اور عرضی لکھ کر دینے کے بعد پانچ روپے بھجوا دیے۔ اور

کہلا بھیجا کہ جب تک لوگ کسی کا خط لے کر نہیں آتے یہاں داخلہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ ایک صاحب اسی طرح ٹھیرا لیے گئے تھے وہ صبح کو پلنگ پر کی دری اٹھا لے گئے تھے۔ اس لیے یہ قاعدہ مقرر ہوگیا ہے۔

محمد علی: کوئی سوز پڑھیے۔ جنگلا پیلو میں سوز شروع ہوتا ہے۔

قدیم سوز: ایسا خوبصورت بندھا ہوا کہ میر علی، شیخ عطا، مہدی بخش یاد آگئے۔ صحت کی راگنی، بلمپت کی گائکی، گلے کا نام نہیں، گانے سے ایسا علیحدہ جیسے رذیل سے شریف۔ ایسے خوبصورت کھٹکے، سر کا سوت، استادی کی چھوٹی چھوٹی مرکیاں، خوش مذاقی کی ترکیبیں کہ واہ واہ۔ ہم آنسوؤں کے تر سے خوب روئے۔ ہوری دھرپت بھی اسی ٹھاٹ کے گاتے ہیں، پھولتے پھلتے نہیں مگر واقف کار کہتے ہیں صحت ضرور ہے۔ شعر سے بھی مشق اور تلاش کا پتہ چلتا ہے۔ نہ مسطر نہ پرکار۔ قلم نہ روشنائی، خالی پنسل اور کاغذ سے وصلیاں اچھی بنا لیتے ہیں۔ اتنے ہنر ہیں اور یہ فلاکت۔ یہ بھی صفت ہے کہ اپنی مصیبت بیان کرنے میں مبالغہ بھی نہیں کرتے۔ بارہ دری میں ٹھہرا دیا۔ دوسرے دن لوگوں نے کہا کہ بارہ دری بھر میں چیلر ہی چیلر رینگتے ہیں۔ ان سے کہا گیا نہا ڈالیے۔ نہائے کپڑے بدلے، قیصر نے اوڑھنا بچھونا دیا۔ دوسرے دن کہنے لگے دو برس کے بعد آج آرام سے رات کو سویا ہوں۔ کھجلی کے مارے دو برس سے سو نہ سکتا تھا۔ ہما بیگم! جی ڈرتا ہے کہ کہیں اللہ میاں یہ نمونے اس واسطے تو نہ دکھاتے ہوں کہ دیکھ رکھو کل تمھاری بھی یہی گت ہوگی۔

چھبن زیارت کے لیے جا رہی ہیں۔ کہتی تھیں ہما کو خط نہ لکھا۔ ان کو لکھ دینا کہ معاف کریں۔ اب چھبن بھی چلی جائیں تو تمھاری بوبو مرحومہ کی نشانی ہماری کمائی کے جابر رہ جائیں گے۔ اللہ میاں شکر ہے تیرا یہی غنیمت ہے۔ قیصر بہت بہت دعا کہتی ہیں۔

ہاں وہ لاڈلے نواب والا سوز تو لکھ دیں:

عید کا دن عشرۂ ذی الحجہ مقرر کیوں ہوا
ایک شہزادہ نبی زادہ چھری سے بچ گیا
کرتے ہیں اس کے عوض میں مومنیں دنبے فدا
عشرۂ ماہ محرم کیا قیامت روز تھا

رحمت اللعالمیں کا قتل دل جانی ہوا
بھوکا پیاسا فاطمہؓ کا لال قربانی ہوا

بس بی بی خط ختم کرتا ہوں۔

راقم

تمھارا خادم دیرینہ تمھارا باپ

چودھری محمد علی پر کوئی پچاس سال قبل قرۃ العین حیدر نے ایک مضمون ''داستان طراز'' کے عنوان سے لکھا تھا۔ ''داستان طراز'' کی اشاعت کے چار پانچ سال کے اندر محمد علی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ''سوغات'' کے تیسرے شمارے میں (دور اول) میں ایک مختصر نوٹ نکلا۔ دوسرے کچھ رسائل اور اخبارات میں بھی شاید چند سطریں آئی ہوں گی اور اردو والوں کو پتہ بھی نہ چلا کہ کیسا زبردست انشا پرداز، ایک طرز اور اسلوب کا موجد اور خاتم، تحریر میں باتوں کے پھول کھلانے والا ان کے درمیان سے اٹھ گیا۔ ''

(محمود ایاز: سوغات بنگلور)

حسن عباس کے نام

عزیزی سلمہ، دعا! تمھارے دو کارڈ آئے۔ دونوں سے دلی تعلق ٹپکتا تھا۔ خدا تم کو تمھاری سعادت اور محنت کا اجر دے۔ میرے مرنے کی کوئی صورت ابھی تک نہیں بندھی۔ البتہ پھوڑوں کی تکلیفیں برقرار ہیں۔ باہر جانے کا موقع نہیں آتا۔ چلتا پھرتا ہوں۔ بخار نہیں ہے مگر دل کو چین نہیں ہے۔ مالی تکالیف روز بروز بڑھتی جاتی ہیں۔

ابتدائے جور ہے روتا ہے کیا　　آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

سب دعا اور تسلیم کہتے ہیں۔ کُجن ایک ہفتہ میں جائیں گی۔ خدا خیریت سے پہنچا دے۔ آمین

دعا گو

محمد علی عفی عنہ

۳۱ر جنوری ۱۹۵۰ء

(غیر مطبوعہ)

"چودھری محمد علی کے 'فسانوں' نے عموماً اور 'انگارے' نے خصوصاً ترقی پسند ادب کی تحریک اور نئے ادب کے لیے وہی کچھ کیا جو بوکا چیو اور پرارک کی تحریروں خصوصاً بوکا چیو کی "ڈی کیمرون" نے یوری نشاۃ ثانیہ کے لیے کیا تھا......"

(خلیق ابراہیم خلیق۔ 'منزلیں گرد کے مانند......' صفحہ 147)

ہما بیگم کے نام

ردولی　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　مارچ ۱۹۵۰ء

ہما پیاری! تمھارے تین خطوط آئے۔ میں اسپتال میں تھا۔ گو اچھا تھا اور اچھا ہوں مگر طبیعت کو بہانہ ہاتھ آگیا تھا۔ اس لیے جواب نہیں لکھا تھا۔ دوسرا خط بڑی بے چینی کا آیا تھا۔ اس لیے اس کا جواب لکھ دیا تھا۔ تمھارے تیسرے خط کے روانہ ہونے کے بعد پہنچا ہوگا۔ میں اسپتال میں ایک مہینہ کچھ دن رہ کر چلا آیا تھا۔ پھوڑوں کے زخم اب بھی باقی ہیں۔ مگر نہ ایک دن چلنا چھوٹا نہ ہنسنا بولنا کم ہوا۔ صورت سے بیمار نہ تب کوئی کہہ سکتا تھا نہ اب۔ ڈاکٹر لوگ کہتے ہیں زخم کے اندمال میں بڑھاپے کی وجہ سے دیر ہورہی ہے۔ جسم کا حال روح کے معاملے میں پھر بھی غنیمت ہے۔ روحی تکالیف کی برداشت صرف اس وجہ سے قبول ہے کہ جانتا ہوں آگے اور زیادہ ہونے والی ہیں۔ کہاں تک دکھڑا روؤں، جانے دو جب انگلستان میں فاتحین کا یہ حال ہو جو تم نے لکھا ہے تو ہم لوگ کس گنتی شمار میں ہیں۔ دنیا کی حالت اس بیمار کی ایسی ہے جو بیمار پڑا ہو اور بدپرہیزی نہ چھوٹے۔ اصغر علی محمد علی[48] کا نام جانتی ہو۔ محمد علی مرحوم کو شراب کی لت تھی۔ بیمار ہوئے ڈاکٹروں نے کہا پیوگے تو مرجاؤگے۔ مگر نہ چھوٹی۔ آخر وقت میں جب صاحب فراش ہوگئے۔ گھر والوں نے حکم ماننا چھوڑ دیا۔ کوٹھے پر رہتے تھے۔ کھڑکی گلی میں تھی۔ چھت یقیناً نیچی رہی ہوگی۔ یا نیچے تہہ خانہ رہا ہوگا۔ کیونکہ کھڑکی قدآدم سے کچھ ہی اونچی رہی ہوگی۔ کسی کو اشارے سے بلایا۔ دوگنی قیمت دی کہ ایک بوتل لادو اور ہاتھ بڑھا کر ادھر ہی سے دے دو۔ صبح کو دیکھا گیا کہ بوتل بغل میں پڑی ہے۔ شراب جو پیٹ میں نہ پہنچ سکی تھی بستر پر بہہ چکی ہے اور وہ جاں بحق تسلیم کرچکے ہیں۔ یہی حالت دنیا کی ہونے والی ہے جس چیز نے انسان کو اس قدر نقصان پہنچایا ہے وہ مشین ہے۔ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں جتنا غور کروگی اتنا ہی نقصان مشین کا کھلتا جائے گا۔ مگر بدپرہیزی میں وہ مزا ہے کہ بیماری اور

موت اس کے اوپر سے صدقے اتاری ہیں۔ ہما بیگم! یہ خط آج کئی روز ہوئے لکھا تھا مگر جی چاہتا تھا کہ ابھی اور لکھوں تب بھیجوں۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

چنانکہ لفظ عصا گفت موسیٰ اندر طور

مگر جی کی گھبراہٹ لکھنے سے روکتی رہی۔اس وقت صبح کے چھ بج کر کچھ منٹ آئے ہیں۔ آفتاب کی روشنی پھیل چکی ہے۔مگر چمک صرف اب دکھائی دیتی ہے ابھی ابھی کامنی کی خوشبو آئی تھی۔ سامنے گلاب، رنگین مٹر، وربنیاڈا ئنتھس، مینانٹ، ڈیلیا کھلے ہیں اور میں یہ لکھ رہا ہوں۔ اکثر نماز کے بعد اور سوتے وقت عموماً وہ دعا ضرور پڑھتا ہوں جو رسول اللہؐ نے بعد فتح مکہ پڑھی تھی۔ لا اله الا الله وحده انجز وعده الخ۔

ہر طرح کے مصائب اور آلام میں رکھ کر خداوند تعالیٰ آرام سے میری زندگی گزار رہا ہے۔ اس کا ہزار ہزار شکر ہے۔ بس بی بی خدا حافظ۔ پورا خط انانیت سے بھرا ہے۔ اس لیے ختم کرتا ہوں۔تم اپنا حال لکھ لکھ کر مجھ کو خوش کیا کرو۔ ہاں بی بی الم ترکیف اکثر نماز میں پڑھتا ہوں یوں بھی اس کی مزاولت رکھتا ہوں۔

راقم تمھارا خادم بے خدمت

محمد علی عفی عنہ، 16 مارچ 1950

حسن عباس کے نام

حسن عباس سلمہ، دعا! تمھارے خطوط سے تمھاری تشویش جو میری بیماری کی وجہ سے لاحق ہے، معلوم ہوتی تھی اور میں کمبخت تم کو نہ لکھتا تھا مگر میں جانتا تھا کہ مسیب نے مطلع کردیا ہوگا کہ زندہ ہوں اور اچھا ہوں۔ معلوم نہیں کہ جسم کی بیماری بڑی ہوتی ہے یا دل کی بیماری۔ آج کل نماز میں 'الم تر کیف' اکثر پڑھتا ہوں۔ سوتے وقت وہ دعا پڑھ کر دل کو مضبوط کرتا ہوں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد پڑھی تھی تاکہ دل کو ڈھارس ہوتی رہے۔

اس وقت بھی خط لکھنے پر دل تیار نہیں ہے۔ مگر فرض ادا کر رہا ہوں۔ کل طاہرہ[1] سے بہت دنوں کے بعد ملاقات ہوئی۔ قیصر سب کو دعا کہتی ہیں۔

دعا گو محمد علی عفی عنہ

۲۰ر مارچ ۱۹۵۰ء

(غیر مطبوعہ)

---

[1] حکیم حسن عباس کی چھوٹی بہن

ہما بیگم کے نام

ردولی ۳۱ر مارچ ۱۹۵۰ء

میری جان دعا! تم کیسی باتیں کرتی ہو۔ میں تم سے روٹھ کر کہاں رہوں گا۔ برابر جی میں دھڑکا تھا کہ ہما کے خط کا جواب نہیں دیا ہے۔ محبت میں برے ہی خیال آتے ہیں۔ وہ سوچ رہی ہوں گی کہ میاں جان کہیں مر تو نہیں گئے۔ گڑبڑ میں مجھ کو تار دینے والا کون ہوگا۔

نہیں بی بی ابھی میں بے حیا زندہ ہوں اور تم لوگوں کی دوری کے دن جھیل رہا ہوں۔ دیکھو کب تک یہ قید تنہائی نصیب میں ہے۔

زندگی تک ہجر کی حد ہوگئی
دے دیا صدقہ بلا رد ہوگئی

دل بہلاؤ کے صرف دو سامان ہیں۔ آفاق کے پاس بیٹھنے سے جی کو چین ملتا ہے۔ پرایا لڑکا اپنا عصائے پیری بن گیا ہے۔ دوسرے برج میں وقت کٹتا ہے۔ بدرل کی ہمدردی ویسی ہی ہے۔ دو بوڑھے ایک دوسرے کا سہارا ہیں۔ علاقہ راج روگ کا بیمار بن گیا ہے۔ اچھے ہونے کی آس نہیں مگر جب تک سانس ہے کوئی اپنے پیارے کو چھوڑ کر کیسے بھاگ جائے۔ روٹی کے سہارے کو آگ لگا کر کدھر نکل جائے۔ بھاڑ میں جائے یہ کھڑاگ۔ اب دو ایک اچھے اچھے شعر سنو۔ اکثر تم کو یاد ہوں گے مگر پھر بھی کچھ نہ کچھ مزا آ ہی جائے گا۔

جاتا ہے یار کچھ تو بیاں مونہہ سے بول لے
اے بدنصیب مانع گفتار کون ہے

سعدؔی، میرؔ سب کے شعر موجود ہیں پھر بھی یہ شعر نہ چوٹا پن ہے۔ نہ چوٹ سے خالی ہے۔

اے فغاںؔ دیکھنا سمجھ لینا
دے کے دل پھر لیا نہیں جاتا

تیرے خط کا جواب آیا ہے
ہوش کھول آنکھ نامہ بر کو دیکھ

آثارِ سحر مرغِ سحر کو نہیں معلوم
لپٹے رہو سینے سے ابھی رات پڑی ہے

تو پری شیشے سے نازک ہے نہ کر دعویٰ مہر
چھاتی پتھر ہے انھوں کی جو وفا کرتے ہیں

میر تقی میر

لوگ کہتے ہیں محبت میں اثر ہوتا ہے
کون سے شہر میں ہوتا ہے کدھر ہوتا ہے

گفتنی نیست کہ بر غالبِ ناکام چہ رفت
می تواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نداشت

یہ مضمون امام زین العابدین علیہ السلام سے لیا ہے۔ حافظ، سعدی وغیرہ سب نے یہی کہا ہے۔ اپنے آقائے ولی نعمت کے دسترخوان سے پیٹ بھرنا نہ چوری، نہ ذلت۔ حدیث، قرآن یا ان حضرات کے ارشاد سے فائدہ اٹھانا کس کا فخر نہیں۔ اب کچھ شعر بنوٹ کے ہیں سن لو، فغاںؔ۔

گل می درد قبا بہ چمن داد خواہ کیست
گلشن بہ خوں تپیدہ شہید نگاہ کیست

خال سیاہت از اثر دود آہ کیست
ایں نور دیدہ کوکب بخت سیاہ کیست
(ایران کے نئے شعرا میں سے کسی کا ہے)

رضا کی کاپی کہیں پڑی ہوگی۔ ڈھونڈھ کے انشاء اللہ تعالیٰ رکھ لوں گا۔ چھبن کے یہاں خیریت ہے سب کو دعا۔ آفاق میاں تسلیم کہتے ہیں۔

دعا گو

محمد علی عفی عنہ

ایک صفحہ رہ گیا۔ ڈاک کا وقت بھی نکل گیا۔ شاید کل تک وہ صفحہ بھی پورا ہو جائے۔

یکم اپریل۔

مجھ سے پوچھا ہے کہ اب کی گرمیوں میں کہاں جاؤ گے سنو۔ کل کا حال سوا خدا کے کسی کو نہیں معلوم۔ مگر کہیں قدم باہر نکالنے کی صورت بندھتی دکھائی نہیں دیتی۔ آنب اب کی پھر گیا۔ اس لیے ہم خود اب کی اپنی پال ڈالیں گے اور کہیں نہ جائیں گے۔ بچارے محبوب حسین خان قضا کر گئے۔ فالج پہلے بھی گر چکا تھا اب کی پھٹ پڑا اور بلا تکلف سے گزر گئے۔ تقریباً بغیر پڑھے لکھے۔ بے جائداد بڑی آن سے زندگی بسر کی اور مرنے کے ٹھاٹ ہمارے دل کو بھا گئے۔ خیر دیکھا جائے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

بدرل تم کو دعا کہتے ہیں۔ قیصر دعا اور جابر سعید تسلیم کہتے ہیں۔

محمد علی عفی عنہ

---

(۳۴)

ہما بیگم کے نام

اپریل ۱۹۵۰ء   ردولی

میری جان دعا! تمھارے خط کا جواب سر آنکھوں سے لکھوں۔ مگر بجن وغیرہ کو خط لکھتے نہیں بنتا۔ ان کا خط آٹھ دس دن ہوئے آیا تھا۔ جواب اسی وقت لکھا مگر ڈاک میں ڈالنے کی جرأت آج تک نہ ہوئی وجہ کیا کہ چھبن کا جانا ویسے ہی ہوا تھا اور دل بہت بھرا تھا۔ میں نے کہا ایسا خط بھیجوں گا تو بجن غریب کو خدا واسطے کو رلاؤں گا۔ اس لیے نہیں بھیجا۔ اب یہ ناتمام خط تم کو بھیجے دیتا ہوں۔ ان کو تار بھیج دیا ہے۔ تمھارا خط سلمان کی وکالت میں پہنچا۔ سلمان کے Sense of duty پر ہمیشہ مجھ کو فخر اور ناز رہا ہے اور ہے۔ اللہ میاں کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ مجھ کو ایسا لڑکا عطا ہوا۔ مگر پیاسا بغیر پانی کے تسکین نہیں پاتا۔ اس وقت تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہزار مصروفی ہوں۔ ایک پوسٹ کارڈ تو بس میں بیٹھے بیٹھے بھی لکھ سکتے تھے۔ اگر اس طرح کا سرسری لکھا ہوا پوسٹ کارڈ آتا تو الجھن ہوتی کہ آکسفورڈ کا ایسا خط کیوں نہیں آتا۔

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

خیر ہوگا بھئی جانے دو۔

اچھا اب اور سنو۔ آج پانچ دن ہوئے میں لکھنؤ گیا۔ وہاں سوچا سنگھ سے ملاقات ہوئی۔ ویڈا ان کی آئرش بی بی تو چلی گئیں (اگر کہیں لندن میں ملاقات ہوجائے تم سے یا سلمان سے تو میرا سلام کہہ دینا) اب سوچا سنگھ نے دوسری شادی کی ہے۔ قد اس کا بھی لنبا ہے، رنگ بھی صاف ہے۔ مزاج بھی اچھا معلوم ہوا ہے۔

Christian Native ہے۔ تم نے لکھا تھا کہ یہاں ہر شخص اچھا ہے اور دوسرے کی

امداد کرنے پر تیار ہے۔ بی بی یہ خصوصیت ماننا پڑتی ہے کہ Christianity کی برکت ہے۔ ان لوگوں کی رواداری، برداشت، خدمت کی تربیت مذہب کی بنا پر دی جاتی ہے اور چونکہ زندہ قوم ہے۔ اس لیے ان چیزوں کا اثر بھی قبول کرلیتی ہے۔ یہی حال سوچا سنگھ کی نئی بی بی کا معلوم ہوتا ہے۔ ہما بیگم تم بحیثیت مسلمان ان باتوں سے نادم نہ ہو۔ جب اللہ بخشے مسلمان زندہ تھا تو اس میں دوسرے قومی صفات تھے۔ بہادری، جوانمردی، ایمانداری، صداقت، خوش معاملگی، آج انگلستان، جرمنی، امریکہ، اسپین میں بھی ہو مگر وہ Honesty is the best policy کی بنا پر معلوم ہوتی ہے اور مسلمانوں میں Honesty is its own reward کی بنا پر تھا۔ ہمارے بچپن میں ایک مسیح نانا تھے۔ آپا مرحومہ کے قریبی رشتے سے ماموں ہوتے تھے۔ دکھن اور سنا ہوگا قائم ماموں کی بی بی تم کو یاد ہوں گی۔ وہ اسی گھر کی تھیں یہ جب مرض الموت میں گرفتار ہوئے تو ایک ڈولی پر چڑھ کر ردولی میں نکلے اور جس جس بنئے اور مہاجن سے ان سے بیوپار رہا تھا سب کے یہاں گئے اور معاملہ چکایا۔ ہر شخص سے معاملہ چکایا، ہر شخص سے کہا سنا معاف کروایا اور مر گئے۔ آج کل ایک مثل کبھی کبھی سنائی دے جاتی ہے۔ مگر شاذ و نادر ''ارے میاں مسلمان ہوکر جھوٹ بولتے ہو!'' جب ہم زندہ تھے اس وقت ہم میں بھی یہ صفات تھے۔ ہندو آج بدل گیا ہے مگر رواداری، دان پُن ہر مذہب میں خوبیاں دیکھ لینا، خونخواری کے دور کے پہلے دل میں اہمسا کی منزلت یہ ہندو کی قومی خصوصیتیں تھیں۔ انا خلقنا الانسان فی احسن تقویم۔ ثم رددنہ اسفل السافلین (اگر املا غلط ہو تو صحیح کر دینا) ہاں بھئی سلمان سے کہنا کہ کتابیں بھیجنے کی تکلیف نہ کریں۔ یہاں سے روپیہ بھیجنا بہت مشکل ہے اور وہاں یہ حال ہے کہ وہ گرجا کے چوہے ہو رہے ہیں کہ اللہ رزاق ہے ورنہ گرجا میں روٹی کا ٹکڑا بھی نہیں نصیب۔

درم و دام اپنے پاس کہاں
چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں

جو کچھ ملا کھا گئے۔ چیونٹی کی طرح ذخیرہ کرنا بلند پروازوں کا کام نہیں۔ اگر کتابیں آئیں گی تو میرا دل کڑھے گا کہ غریب نے تکلیف ہی اٹھا کر بھیجا ہوگا۔ اچھا اب ایک اور واقعہ سنو۔ ہم گئے سوچا سنگھ سے ملنے سلیم پور ہاؤس میں۔ وہاں ایک لڑکی دیکھی جس نے

مجھ کو پہچانا اور میں نے بھی اس کی صورت اچھی طرح پہچانی مگر اور کچھ یاد نہ آیا۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اس کے شوہر نے آکر کہا کہ بی بی کی طبیعت کچھ خراب ہوگئی ہے۔ میں سمجھا ہسٹریا ہوگا۔ دوسری صبح کو مع قیصر کے پھر سوچا سنگھ کے یہاں گیا پھر وہ لڑکی ملی۔ لڑکی کاہے کو تین بچوں کی ماں ہے۔ مگر صورت سے لڑکی ہی معلوم ہوتی ہے۔ اس نے کہا کل میں آپ کو دیکھ کر بیتاب ہوگئی کیونکہ آپ کو دیکھ کر مجھ کو میرے باپ یاد آ گئے۔ اس نے بیان کیا کہ ہم لوگ پہرسر کے رہنے والے ہیں۔ پہرسر اور دو اور گاؤں سادات صحیح النسب بھرتپور میں واقع ہیں اور واقع تھے۔ ان لوگوں میں بڑے بڑے لوگ ہوئے ہیں۔ سید آل نبی، سید ابو محمد، سید آل محمد وغیرہ وغیرہ۔ دو برس ادھر خونخواری کے دور میں یہ سب تباہ ہوگئے۔ نہ معلوم کتنے گھر کھُد گئے، کتنے لوگ ختم ہوگئے، کتنی عورتیں ادھر کی ادھر ہوگئیں۔ جو بچے وہ بھاگ گئے۔ تم سمجھتی ہو کہ میرا کیا حال تب سے ہے۔

بنقشہ طرۂ منقول خود گرہ میزد

صبا حکایت زلف تو درمیاں انداخت

گو میری مصیبت اس کے عشر عشیر بھی نہ تھی مگر مجھ کو تم لوگ یاد آ گئے۔ اب میں نے بھی اس کو لکھا ہے کہ بی بی میں جے دن بھی زندہ ہوں مجھ کو اپنا باپ تصور کرو اور میرے گھر کو اپنا میکہ بناؤ۔ تمھاری ایسی مصیبت خدا کسی پر نہ ڈالے۔ مگر میرے موتی بھی دنیا بھر میں بکھرے پڑے ہیں۔ میں بھی اپنے پیاروں کو دیکھنے کو ترستا ہوں۔ گو خدا کی ذات سے ناامید نہیں کہ شاید کبھی دن پھریں اور آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔ جب تک سانس تب تک آس۔

اتنا پیغام درد کا کہیو

گر صبا کوئے یار میں گزرے

کون سی رات آن ملئے گا

دن بہت انتظار میں گزرے

اچھا چھوڑو اس قصے کو بھی۔ آج چار پانچ دن ہوئے ایک صاحب سے میں اپنی سیاہی قلب اور باوجود لاتقنطوا کے اپنے اعمال کی وجہ اپنی مایوسی اور اللہ میاں سے دوری

کا حال کہہ رہا تھا۔ انھوں نے کہا والضحیٰ پڑھا کرو۔ واہ واہ وا، ہما بیگم۔

بیٹھے بیٹھے کچھ مزا ہم کو بھی اب آنے لگا
اب تو ہم بھی درد دل میں مبتلا ہونے لگے

اب ایک اور مصیبت آن پڑی۔ اللہ میاں سے ہر گھڑی دعا مانگا کرتا ہوں کہ اللہ میاں غرور گھمنڈ سے بچا۔ لاحول و لاقوۃ انجن چھوڑ کھسیٹن میں پڑ گئے۔

محمد علی عفی عنہ

"چودھری محمد علی کے بیش تر مضامین اور افسانے، جنسی تقاضوں اور موضوعات سے متعلق ہوتے تھے، ان کا مقصد محض تلذذ نہیں تھا بلکہ اس امر کی نشاندہی کرنا تھا کہ انسان کے فطری میلانات غیر فطری طور پر دبائے نہیں جاسکتے... جنسیات کے بارے میں، ان کا نقطۂ نظر سائنسی تھا...... حکیم عبد الوالی اور چودھری محمد علی ردولوی دونوں نے اردو ادب کے شجرِ ممنوعہ کا پھل چکھا اور اپنے قاریوں کو چکھایا۔ اپنے ادبی سفر میں یہ دونوں رومان کی بلندیوں سے نکل کر حقیقت کی شاہراہ پر آگئے اور اس ادب کی زرخیزی کے لیے زمین تیار کی جو سماجی حقیقت نگاری کی مضبوط اور توانا جڑوں سے پھوٹا۔"

(خلیق ابراہیم خلیق۔ "منزلیں گرد کے مانند....." صفحہ 126)

(۳۵)

ہما بیگم کے نام

ردولی　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　۵؍جون ۱۹۵۰ء

ہما پیاری، دعائیں قبول کرو۔ خدا کرے یہ دعائیں اللہ میاں بھی قبول کریں۔ میں زندہ ہوں اور اچھا ہوں۔ فی الحال کوئی مرنے کی امید بھی نہیں ہے۔ زمینداروں کی حالت روز بروز بد سے بدتر ہوتی جاتی ہے۔ اس لیے باوجود فلسفیانہ نظر رکھنے کے پھر بھی زندگی بدمزہ ہوجاتی ہے۔ آئندہ سے مایوسی، ہمت افزائی کیسے کرے۔ بہرحال چلے جاتے ہیں اور جب تک اللہ میاں کا حکم ہوگا چلے جائیں گے۔ گرمیاں بہت پڑنے لگی ہیں۔ صبح کو دوائیں بانٹ لیتا ہوں۔ اس کے بعد پھر کوئی کام نہیں ہوتا۔ کام میں کرتا ہی کیا تھا۔ ''جما گھر گھر گھما چرخہ کیسے کاتوں'' والی بات ہے۔ آفاق تسلیم کہتے ہیں۔ بدرل دعا کہتے ہیں۔ ابھی ابھی چھبن کا بھی خط آیا۔ سب خیریت سے ہیں۔ اب کوئی مضمون سمجھ میں نہیں آتا جو لکھوں سوا اس کے اگر تم کو دیکھ لوں گا تو معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ٹھنڈک سی پڑ جائے گی۔ اچھا سنو ایک واقعہ یاد آگیا جب میں ہسپتال میں تھا تو مولوی نصیر صاحب مجھ کو دیکھنے آئے۔ میں اس دن زخم کی تکلیف کی وجہ سے ان سے زیادہ باتیں نہ کرسکا۔ دو دن کے بعد میں ان کا شکریہ ادا کرنے گیا۔ بڑے تپاک سے ملے۔ ان کے چھوٹے بھائی مولوی بھی آگئے۔ تمھاری کتاب کی تعریفیں کرنے لگے۔ میرا دل خوش ہوا۔ اس کے بعد حال کھلا کہ وہ تعریف اس وجہ سے کی گئی تھی کہ میرے اوپر اعتراض کیا جائے۔ فرمانے لگے کہ اسی کے مقابلے میں آپ نے ''پردے کی بات'' لکھی ہے۔ میں نے کہا جی ہاں۔ اس کے بعد کہا کہ آپ کی صاحبزادی نے یہ کتاب آپ کی تربیت کے اثر سے تو نہیں لکھی ہوگی۔ میں نے کہا کہ میری تربیت ایسی کہاں تھی۔ قصہ مختصر جو جو وہ مجھ پر چوٹیں کرتے تھے میں بلا ارادہ انکسار و خاکساری برتتا تھا۔ یہاں تک کہ میں نے یہ بھی نہیں کہا کہ اس کتاب پر دیباچہ میرا ہی لکھا ہوا ہے۔ بہرحال امام حسن علیہ السلام نے میری مدد کی اور نرمی اور آشتی

میری بڑھتی گئی۔ اب خیال ہوتا ہے کہ آئندہ سختی سے جواب دوں گا، لیکن اگر خدا نے امداد کی تو آئندہ بھی یہی انکسار کا پہلو رکھوں گا۔ ان کے مقابلے میں مولوی نصیر انسان کی صورت، انسان کی سیرت، انسانی کمزوریوں کی رواداری۔

زن گفت کہ ہچومی نمایم ہستم
تو نیز چنانکہ می نمائی ہستی

مجھ کو یہ شخص خدا کا اچھا بندہ معلوم ہوتا ہے۔ حاضرالوقت میاں تفقد دعا کہتے ہیں۔ محلے میں بس ہم ہی دو آدمی رہ گئے یا میر نعمت ہیں۔ مگر وہ پکی بولی بولتے ہیں۔

دعا گو

محمد علی عفی عنہ

"..... چودھری صاحب کا انداز گفتگو بڑا دلکش تھا۔ بزرگوں میں بزرگ، جوانوں میں جوان، بچوں میں بچے تھے۔ ادبی مذاق بے حد بلند تھا۔ سوشل امور سے بے حد دل چسپی تھی، چنانچہ پہلی بیوی کے انتقال کے بعد مرحومہ کے نام سے رُدولی کے سرکاری اسپتال میں ایک 'عابدہ وارڈ' بنوایا تاکہ مریضوں کے رہنے میں سہولت ہو جائے۔ کافی عرصے تک آنریری اسٹیٹ کلکٹر' آنریری مجسٹریٹ رہے، تعلق داروں کی سیٹ سے دوبار کاؤنسل کے ممبر منتخب ہوئے....."

(سید علی محمد زیدی "اپنی یادیں" صفحات 61-260)

ہما بیگم کے نام

ردولی ۲۷؍جون ۱۹۵۰ء

میری جان، تمھارا بڑا عمدہ خط پرسوں ملا تھا۔ واقعی تم سچ کہتی ہو، تین تین بچے اس وقت بھی میرے پاس ہیں اور بچوں کی شکایت کرنا ناشکری ہے۔ تو وجہ کیا ہے۔ شروع جوانی میں غالبؔ کے خطوط پڑھے تھے۔ ان خطوں کے پڑھنے سے کس کے دل میں نقل کرنے کا خیال نہیں آتا ہوگا۔ ایک خط میں انھوں نے لکھا ہے کہ ہم نے جس کی تعریف میں قصیدہ لکھا وہ چل بسا۔ دلّی البتہ سخت جان تھی کہ برسوں ہم کو روٹیاں دے کر تباہ ہوئی ورنہ جس والی ملک کی تعریف میں نظم لکھ دی وہی ختم ہوگیا۔ ایسے طالع مربیؔ کش، محسن سوز کہیں پیدا ہوئے ہیں۔ ہم جو اپنی تکلیفیں لکھتے ہیں تو یہ سمجھو کہ غالب کی نقل کرتے ہیں ورنہ اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے۔ سو میں اسّی سے اب بھی اچھے ہیں۔ اس سن میں ہاتھ پاؤں چلتے ہیں۔ آج تک شکر اور مٹی کے تیل کا توڑا نہیں ہوا۔ ریشننگ کی مصیبت کس پر نہیں پڑی۔ ایک ہم ہی ہیں کہ پیٹ بھر کھایا کیے اور تن بھر پہنا کیے اور مونچھوں پر تاؤ دیا کیے۔ فالحمدللہ رب العالمین۔ تمھارے بابا بھیا مرتضٰی حسین خاں مرحوم نے مجھ سے کہا کہ محمد علی کسی سے یہ امید نہ لگانا کہ وہ احسان مانے گا۔ ہم اپنے زعم ناقص میں اس پر کاربند رہے اور بہت سی تکلیفوں سے بچ گئے۔ مگر دو ایک بار چوک گئے۔ حالانکہ بچوں کو پالنا پوسنا کوئی احسان نہیں ہے کیونکہ اس میں تو اپنا بس نہیں ہے۔ مگر پھر بھی حماقت سے اکثر اس طرح کی امیدیں لوگ لگائے رکھتے ہیں اور بعد کو پچھتاتے ہیں۔ مگر تم نے بات بڑی عمدہ طرح سمجھا دی اور ہماری سمجھ میں بھی آگئی۔ گو سمجھ موٹی ہوگئی ہے۔ ایک جولاہے تھے ان کے سر میں درد تھا۔ جاتے تھے حافظ جی سے پھونک ڈلوانے۔ راستے میں ایک دوسرے جولاہے مل گئے۔ پوچھنے لگے کہاں جاتے ہو۔ انھوں نے حال بیان کیا۔ وہ بولے لاؤ ہم

(۴۷)

ہما بیگم کے نام

ردولی ۱۴ر ستمبر ۱۹۵۰ء

میری جان دعائیں قبول کرو، کب سے تمھارے خط کی راہ دیکھا کیا۔ جو جو تمھارا خط لاہور سے اِدھر بڑھتا تھا میرا شوق اُدھر بڑھتا تھا۔ آخر کل شام کو دونوں مل گئے۔ خدا سب کے بچھڑوں کو اسی طرح ملائے۔ آمین۔ یہ خیال کر کے کہ تم فلاسفر آدمی ہو اس آرام طلب نے اطمینان کا بہانہ ڈھونڈھ لیا۔ اس جگہ ایک شعر میر کا یاد آگیا ؎

ہوگا کسی دیوار کے سائے کے تلے میر
کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

یہی حال بیٹی میرا ہے کہ گھڑیاں گنتا ہوں کہ ہما بیگم کے آنے کا وقت انشاء اللہ تعالیٰ قریب آتا جاتا ہے۔

انگریزی میں ایک ادبی سقم ہوتا ہے جس کو Bathos کہتے ہیں۔ تمھاری زبان میں اس کو شترگربہ کہتے ہیں۔ تم عربی فارسی انگریزی کی ماہر ماشاء اللہ ولایت کی پڑھی، تلمیذ الرحمٰن اوپر سے اور تم کو میرا ایسا جاہل حرف پڑھانے کی کوشش کرے۔ سوا اس کے اور کیا ہے کہ از بزرگان خطا اور از خرداں عطا۔ اچھا وہ Bathos والی بات سن لو، تم لوگ تو ہم سے چھوٹ ہی چکے تھے۔ اب باغ اور پھول اور سبزہ بھی جا رہے ہیں تم کو خیال ہوگا کہ گلابوں کے نام تم لوگوں کے ناموں پر رکھے تھے۔

باغ میں سبزہ و گل بزم میں پروانہ و شمع
مل ہی جاتے تھے تری یاد دلانے والے

اب وہ بھی گئے۔ آفاق تسلیم کہتے ہیں۔ دانوں نے ان کو پھر ستایا ہے۔ بدرل دعا کہتے ہیں، قیصر دعا، جابر تسلیم کہتے ہیں۔ ہم کو جو کچھ تمھارے لیے کہنا ہے وہ اللہ میاں سے کہیں گے۔

راقم، تمھارا باپ

پھونک چھوڑ دیں۔ان کو یقین نہیں پڑتا تھا۔مگر انھوں نے ماتھا پکڑ کر پڑھنا بھی شروع کردیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ الم دو۔ والدّوالین۔آمین چھو۔ انھوں نے سر ہلا کر دیکھا، درد غائب۔تعجب سے آنکھیں پھیل گئیں۔ کہنے لگے۔''ابے تو تو بالکل ہاکیم ہی ہوگیا۔ ہما بیگم تمھاری زبان میں اللہ میاں نے کچھ ایسی برکت دی ہے کہ ہماری تکلیفیں بھی مٹ گئیں۔ برساتیں کچھ نہ کچھ شروع ہوگئی ہیں۔ آنب خوب چل رہا ہے۔ مہنگا بہت ہے۔مگر پیسہ اتنا زیادہ ہے کہ دام کی پرواکس کو ہے۔ سبط نے ابھی ابھی ایک چھوٹی سی کہانی ''ادبی دنیا'' میں لکھی ہے۔ بڑی عمدہ ہے۔کراچی لاہور کی اطلاعات یہ ہیں کہ کجن کچھ اچھی ہیں۔ چھبن درازے میں ہیں۔ الن کراچی میں ہیں اوری(49) لاہور کے ہاسٹل میں ہیں۔ بادشاہ میراثی(50) کی بی بی مع بچوں کے کجن کے پاس گئی ہے۔نزہت ریڈیو پر گائے گی۔ بادشاہ کی بی بی ڈاہل کی ٹوٹی سیدانی ہوجائے گی اور سوزخوانی کرے گی۔ اس کی چھوٹی بہن نبن بڑی سیدانی پہلے ہی ہوچکی ہے۔ خدا ہم کو تم کو بھی سیدالسادات کے جھنڈے کے نیچے جگہ دے آمین۔

دعا گو

محمد علی عفی عنہ

بیگم صاحبہ لانس نائک اے ایچ قادری کے نام

ردولی ۸/ نومبر ۱۹۵۰ء

نور چشم عتیق (51)۔ دعا، تم نے لکھا تھا کہ خط کا جواب جلد دینا، میں نے جو سون کھینچی تو آج تک نہ چھپتا۔ بیٹی میری اس حرکت پر نہ خفا ہونا نہ تعجب کرنا۔ اگر دل کسی طرح نہ مانے تو افسوس کر لینا بلکہ بہتر تو یہ ہوگا کہ عبرت کر کے چپ ہو جانا۔ یعنی دل میں خیال نہ لانا کہ کہیں خدانخواستہ نصیب دشمناں یہی عارضہ مجھ کو بھی نہ ہو جائے۔

ہاں بیٹی، یہ عارضہ تو ہے ہی۔ پہلے میں بھی سمجھا کرتا تھا کہ اکثر جو میں لوگوں کو خط نہیں لکھتا تو یہ صرف میرا موٹا پن ہے یا کاہلی ہے یا یہ کہ میرے دل میں اس کی محبت نہیں ہے۔ اب پتہ چلا کہ یہ ایک چھوٹا موٹا عارضہ ہے جس کا علاج اگر ہو بھی تو ابھی ہمارے ممالک تک تو پہنچا نہیں۔ امریکہ وغیرہ میں معلوم ہوا کہ ہے۔ وہاں بہت سے پڑھے لکھوں نے ایک جلسہ قائم کیا ہے۔ اس کا نام شاید ہے ''انجمن امداد نفسیاتی'' مثلاً کوئی لڑکی ہے وہ بدمزاج ہے، خودغرض ہے، ہر وقت ناک چوٹی میں گرفتار رہتی ہے یا کوئی لڑکا ہے وہ ہر وقت کتاب ہی لیے پڑھا کرتا ہے، بھائی بہنوں سے زیادہ گھلتا ملتا نہیں، ان کی دلچسپیوں میں زیادہ حصہ نہیں لیتا، گھر والے کہتے ہیں کہ ان کی دنیا ہی علیحدہ ہے۔ ان بیماریوں کی خبر اکثر آدمی کو مشکل سے ہوتی ہے۔ بلکہ یہ ہوتا ہے کہ اکثر وہ اس قسم کی باتیں اپنی نسبت گھر والوں سے سنا کرتا ہے اور الجھ الجھ کر رہتا ہے کہ میں تو ایسا ہرگز نہیں ہوں۔ مگر جب بہت سنتا ہے روز روز سنتا ہے اور کوئی صریحی مثال بھی سامنے آجاتی ہے تو وہ اس انجمن والوں کے پاس جاتا ہے اور اپنا حال بیان کرتا ہے۔ وہ لوگ اسی آدمی سے سوالات کر کے پوچھتے ہیں اور جوابات سے نتیجے نکالتے ہیں اور اس مریض میں نفسیاتی پہلو سے کن کن چیزوں کی کمی ہے اور اس کی تدبیر بتاتے ہیں۔ اس کی اصطلاحیں مقرر ہیں۔ مثلاً ''ذو اضاف الیہ اقل اعظم شخصی'' یا ''مقسوم علیہ اعظم نفسی'' تم ریاضی سے خوب واقف ہو۔ اس لیے یہ

اصطلاح میں شاید سمجھ جاؤ گی۔ یعنی وہ انجمن والے لکھتے جاتے ہیں کہ مریض کا مزاج جھلا ہے یا گھنا۔ یہ مریض پیٹو ہے یا کم کھاتا ہے۔ کوئی اچھی چیز ہوئی تو یہ مریض بھائی بہنوں کا حصہ برابر لگا کر رکھ لیتا ہے یا اپنا بھی حصہ دوسروں کو دے دیتا ہے یا سب کا سب ہڑپ کر جاتا ہے۔ اپنی اوڑھنی یا ٹوپی صندوق میں مقفل رکھتا ہے یا بھائی بہنوں کے لیے اس کی چیز ہر وقت موجود رہتی ہے۔ یہ لڑکی یا لڑکا بچپن میں ماں باپ کا لاڈلا تھا یا ڈانٹ ڈپٹ کا عادی رہا ہے۔ غرض کہ وہ ان تمام باتوں کے نقشے بناتے ہیں اور پھر علاج بتاتے ہیں۔

مجھ کو اکثر گمان گزرتا تھا کہ یہی عارضہ مجھ کو تو نہیں ہوگیا ہے۔ مگر کہتا تھا کہ نہیں۔ ہم ایسے اچھے آدمی ہیں ہم کو ایسا خراب عارضہ کیا ہوگا۔ اب یہی عارضہ سلمان کو ہوگیا ہے۔ دو برس سے انھوں نے ہم کو خط نہیں لکھا ہے۔ یہی سلمان تھے کہ آکسفورڈ سے ہر ہفتہ خط لکھتے تھے اور اب دو دو برس نہیں لکھتے۔ حالانکہ تب بیس برس کے تھے۔ دلچسپیاں زیادہ رہی ہوں گی اور اب تو بقول غالب کے وہی زمردیں کاخ، وہی طوبیٰ کی ایک شاخ، چشم بددور وہی ایک حور تب بھی ہم کو یاد نہیں کرتے۔ تو یہ عارضہ نہیں تو اور کیا ہے۔ تم عتیقؒ کے پاکستان میں ہو جہاں تمھاری دیس والیاں ہیں۔ مگر تم ایسی جگہ ہو۔ ردولی کے دو ایک ہی آدمی ہوں گے۔ اگر لاہور یا کراچی میں ہوتیں تب بھی غنیمت تھا۔ خیر جی جو لوگ اپنے ہیں وہ اچھے ہیں اور اللہ میاں راضی رہیں پھر کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی۔ تم اپنا اور اپنے دولھا کا حال لکھو اور ان سے میری دعا کہنا۔

تمھارے خط سے معلوم ہوا تھا کہ میرا پہلا خط دلچسپ تھا۔ یہ خط مولوی صاحب کا سبق ہوگیا ہے۔ دلچسپی کیا ہوگی۔ اس لیے چند اشعار اپنی بیاض سے لکھ کر بھیجے دیتا ہوں ۔

کہاں ہیں آدمی دنیا میں پیدا
خدائی صدقے کی انسان پر سے

(میر تقی میر)

دی ہے واعظ نے کن آداب کی تکلیف نہ پوچھ
اس سے الجھاؤ تری کاکل پیچاں میں نہیں

(حالی)

سنگ جفا سے شیشۂ دل توڑ تاڑ کے
بس اٹھ چلے نہ کھیل کو پیارے بگاڑ کے

(قیس)

لڑنے کو اس سے رات میں غصّے میں لڑ لیا
پر جب وہ اٹھ چلا تو کلیجہ پکڑ لیا

(مرزا احمد علی ایرانی)

صورت بھی پیاری پیاری ہے باتیں بھی خوب ہیں
پھر بھی یہ ڈر لگا ہے کہ بیداد گر نہ ہو

(امیر مینائی)

لوگ کہتے ہیں محبت میں اثر ہوتا ہے
کون سے شہر میں ہوتا ہے کدھر ہوتا ہے

(مصحفی)

لیا ہم نے بوسۂ رخ تو نہ بدگماں ہوا ے جاں
کوئی پھول دیکھ لیتے تو اسے بھی پیار کرتے

(اکبر)

اے فغاں دیکھنا سمجھ لینا
دے کے دل پھر لیا نہیں جاتا

(فغاں)

آج در بند کیے جاتے ہیں زندانوں کے
اور بگڑیں گے مزاج آپ کے دیوانوں کے
سئے جاتے ہیں کفن آپ کے دیوانوں کے
تار داماں کے ہیں ٹکڑے ہیں گریبانوں کے
وحشیوں کا ترے اتنا تو پتہ چلتا ہے
استخواں ملتے ہیں گوشے میں بیابانوں کے

شام ہی سے وہ یہ کہتے ہیں ستانے کے لیے
موتی ٹھنڈے ہوئے جاتے ہیں مرے کانوں کے
شاعری کے لیے توہین کا باعث ہو رشید
تم نہ بیٹھا کرو مجمع میں سخن دانوں کے

(پیارے صاحب رشید)

لوٹ لے جی بھر کے حسرت لذت آزار عشق
اس ستمگر کا یہ رنگِ آشنائی پھر کہاں

(حسرت)

اے لو! اب کاغذ ہی ختم ہوگیا اب کیا کریں۔ خیر جی ہوگا۔ پھر لکھیں گے۔ خدا کرے تم لوگ زندہ رہو، خوش رہو، اس میں ہماری بھی خوشی ہے۔

دعا گو

محمد علی عفی عنہ

---

(۳۹)

محبّی خورشید حسن صاحب مختارِ عدالت کے نام

دوست باصفا تسلیم! آپ کا جواب موصول ہوا۔ مگر پیاس نہیں بجھی۔ خود اپنی تعریف سے جی خوش ہوا، مگر دل جو چیز ڈھونڈھتا تھا اس سے محروم رہا ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

آپ نے لکھا ہے کہ تیرے خیالات بہت اونچے ہیں۔ متاع نیک ہر دکان پر کہ باشد خریدی جاسکتی ہے۔ اس سے کام نہ چلے گا کہ جلیل القدر ذاتوں کی پیروی کرنے کا خیال بیکار ہے۔ بیشک ہم ویسے نہیں ہوسکتے۔ مگر تاسی کا خیال ہی فائدہ مند ہے۔ جب ہمارے ایسے گنہ گار کے دل میں اس طرح کے خیال آسکتے ہیں تو بہتر انسانوں کے دل میں کیوں نہ آئیں۔ ایاز قدر خود بشناس درست ہے۔ مگر پیروی نہ غرور ہے نہ گناہ۔ دوسرے آپ نے فرمایا کہ ''یہ بات علماء کرام کے بس کی ہے'' یعنی ریفارم ہم عوام الناس کا فرض نہیں۔ میرا دل یہ چاہتا تھا کہ بجائے اس کے آپ یہ کہتے کہ ہمارے عوام پڑھے لکھوں کی وردی پہنے ہیں اور جاہل ہیں۔ انھوں نے مذہب کو روزی کا ٹھیکرا بنایا ہے جیسے ہم نے آپ نے زمینداری اور وکالت کو بنایا ہے ان کی آنکھوں پر حدیثوں اور روایات کے ڈھوکے چڑھے ہیں۔ جیسے تیلی کے بیل کی آنکھوں پر چڑھے ہوتے ہیں۔ قرآن کی روشنی کولھو والی کوٹھری میں کم ہے۔ امام ابو یوسف نے کہا جس طرح فوج کی وردی ہے اسی طرح علماء کے گروہ کی بھی مابہ الامتیاز پوشاک ہونی چاہیے۔ چنانچہ سیاہ عمامہ اور طیلسان تجویز ہوگئی۔ علم نے کپڑوں کی عزت بڑھائی۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ کپڑے علم کی توقیر اونچی کر رہے ہیں۔ جب حضرت امام ابو یوسف کسی بات کو شروع کریں گے تو نتیجہ پہلے ہی معلوم ہے۔ ان لوگوں کے یہاں چھ سو برس سے ادھر کی کوئی کتاب درس میں نہیں ہے۔ عقل سلیم سے جس کو Common sense کہتے ہیں ان حضرات کو باپ مارے کا بیر ہے۔

جو باتیں میں عرض کر رہا ہوں ان میں مذاق کا ابتذال اور طنز یہ تذلیل جھلکتی ہے۔ یہ طرز تو صرف اس واسطے اختیار کیا ہے کہ میں اپنی افتادِ طبع سے مجبور ہوں اور جانتا ہوں کہ آپ ان لغویتوں پر نگاہ نہ کریں گے اور صرف نفس مطالب پر نظر کریں گے۔ یہ وجہ ہے کہ میں جلا ہوا ہوں۔ اسی وجہ سے یہ لغزشیں میری عبارت میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ جو نہ ہونی چاہئیں۔ ان حضرات کا روٹی کمانے کا شوق اور جہالت کا یہ حال ہے کہ منبر پر سے ہفوات تک بک جاتے ہیں۔ شیعہ اثناعشری کے عقائد کے حدود سے نکل کر قرامطہ اور دوسرے فرقوں کے دائرے میں پڑتے ہیں۔ میں جھوٹی مثال نہیں دیتا۔ مولوی مرحوم نے منبر پر سے فرمایا اور مجھ گناہ گار نے سنا کہ ہم کو ائمہ کے فضائل بیان کرنے کا حکم نہیں کیونکہ اگر وہ بیان ہو جائیں تو لوگ کافر ہو جائیں۔ اس قول کی گمراہی اور اغوا محتاج بیان نہیں۔ محتاج تشریح نہیں۔ کیونکہ اسلام کوئی خفیہ سازش نہیں۔ آئے دن روز اسی طرح کی باتیں واعظین سے سنا کرتے ہیں۔

بھائی خورشید صاحب اگر آخری بات میں آپ کو کچھ مجھ سے اختلاف ہو تو میرے لیے صرف ہدایت کی دعا کیجیے گا۔ سمجھانے کی کوشش نہ فرمائیے گا۔ خط میں اتنی گنجائش کہاں کہ اپنے دل کا پورا حال اس مسئلے پر لکھ سکوں۔ اکثر حضرات کا خیال ہے کہ حضرات علماء ہم کو فائدہ زیادہ اور نقصان کم پہنچاتے ہیں۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ میری ناقص رائے (جو ممکن ہے غلط ہو) یہ ہے کہ حضرات علماء ہمارے عقائد میں فرق ڈالتے ہیں۔ ہمارے مسائل فقیہہ میں مشکلیں پیدا کرتے ہیں اور وہ افراد مفضول ہیں جو اگر نہ ہوتے تو چنداں نقصان نہ ہوتا۔ چند مثالیں سن لیجیے۔ چونکہ خود آپ کا تجربہ نہیں اس لیے آپ کو پورا حق ہے کہ مجھ کو شاہد غیر عادل مان کر ان کو مسترد کر دیجیے لیکن یہ بدقسمت تو مجبوراً وہی رائے قائم کرے گا جو ان ارشادات سے پیدا ہوتی ہیں اور میرے تجربے میں آئی ہیں۔

ایک بڑے مجتہد العصر کو یوپی گورنمنٹ نے نجف اشرف کی گولہ باری دیکھنے بھیجا۔ وہاں سے آکر جو خفیہ رپورٹ انھوں نے گورنمنٹ کو دی وہ ایسی تھی کہ ہوم ممبر نے یہ کہہ کر واپس کر دی کہ گول گول رپورٹ جو سوالات کا جواب نہ ہوں بیکار ہے۔ بجائے اس کے صاف صاف رپورٹ لکھی جائے۔ پہلی لڑائی کے بعد فتویٰ ہوا کہ عراق میں انگریزوں سے

جن کا قبضہ ہو چکا ہے لڑنا نہ چاہیے۔ ایک بڑے مجتہد صاحب نے بقول ایک صاحب (جو ان کے بڑے عقیدت مندوں میں ہیں اور جنھوں نے مجتہد صاحب کا عذر معقول مان لیا) کے فرمایا کہ میں نے فلاں جلیل القدر حضرت کی مروت میں دستخط کر دیا۔ جو شخص ایسی رپورٹ لکھے وہ حضرت علیؓ کا پیرو کم اور حضرت معاویہ کا پیرو زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ میرے بھتیجے حکیم چندو مرحوم نے کہا کہ میں نے فیض آباد کی مسافت ردولی سے بیان کر کے استفتا کیا کہ نماز قصر ہے یا پوری ادا کی جائے۔ ارشاد ہوا کہ دونوں ادا کی جائیں۔ یہ شریعت سہلہ ٹھہری۔ بہت حضرات سے سنا کہ ارشاد ہوا کہ شکار میں جانور اس وقت حلال کیا جاسکتا ہے جب اس میں حیات مستقلہ باقی ہے۔ یعنی اگر یہ گمان نہ ہو کہ فوراً حلال نہ کر ڈالا گیا تو مر جائے گا۔ دنیا کی بری سے بری چیز میں بھی کچھ خوبیاں ہوتی ہیں۔ خالی نظر اس پر رکھی جائے کہ خرابیاں زیادہ ہیں یا اچھائیاں یہ رائے ہر شخص خود قائم کرے اور پیش خدا خود جواب دہ ہو۔ دوسرے سے مطلب نہیں۔ یہودی اور نصاریٰ نے اپنے علماء اور راہبوں کو شانِ ربوبیت سے متصف کیا۔ گو مسلمانوں میں اس کا خوف ہے مگر احتیاط لازم ہے۔ دل میں بھائی صاحب نہ معلوم کیا کیا بھرا ہے۔

بیاورید گر اینجا بود سخندانے
غریب شہر سخنہائے گفتنی دارد

دعا گو

محمد علی عفی عنہ

۱۱ر نومبر ۱۹۵۰ء

ہما بیگم کے نام

ردولی　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　۲۳؍نومبر ۱۹۵۰ء

میری جان، دعا! کل شام تمھارا خط ملا۔ کل صبح ہی کو میں چار گشتی پوسٹ کارڈ تم چاروں کو لکھ چکا تھا۔ آج چاہے نہ لکھتا، مگر بڑھاپا اور مفارقت۔ خط لکھنے کا مشغلہ دلچسپ ہوگیا ہے۔ کارڈ اور اخبار والی بات میں نے یوں ہی کہہ دی تھی۔ اگر نہ آویں تو اچھا ہی ہے۔ تم لوگوں کے خطوط آیا کریں۔ اس میں جو مزا ہے وہ نہ کارڈ میں نہ اخبار میں۔ کارڈ آویں گے، جوئے میں پیسے ہاروں گا۔ اخبار آوے گا، یہاں کے سی آئی ڈی کا آدمی کان کھڑے کرے گا کہ افوہ اتنا بڑا پڑھن[1] پھنسا ہے جانے بھی دو۔

تمھارے خط میں دو باتیں ہیں جن پر لکھنے کو دل چاہتا ہے ایک تو یہ کہ اوری چھوٹ گئے اور دوسرے یہ کہ میں تم لوگوں کو دیکھنے پاکستان کا ایک چکر لگاؤں۔ پاکستان کی سیر کو بہت جی چاہتا ہے۔ علاوہ تمھارے نہ معلوم کتنے بچھڑے یار ملیں گے۔ صلاح الدین ایسوں کی زیارت ہوگی۔

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

رہنے بھی دو۔ اوری چھوٹ گئے۔ لیکن خیالات کی جکڑ بند ویسی ہی رہے گی ؎

تو بھی چھوڑے تو تری زلف نہ چھوڑے ہم کو
کوئی ہم سے ستم ایجاد رہا ہوتے ہیں

جوانی میں خیالات کا گورکھ دھندا بھی خوب ہوتا ہے۔ ہمارے زمانہ میں کمیونزم کہاں تھی۔ مگر امنگ نہ معلوم کیسے کیسے خواب دکھایا کرتی تھی۔ نئی بات اچھی لگتی تھی۔ اسی چیز کو

1۔　ایک مچھلی ہوتی ہے۔

جی چاہتا تھا جس میں جوکھم ہو، جس میں تکلیف اٹھانا پڑے۔ جوانی کی یہ آن ایسی ہے جس پر سے ہزار بڑھاپے صدقے اتارے ہیں۔ اب یہ حال ہے کہ ؎

ہزار فصل گل آئے جنوں وہ جوش کہاں
گیا شباب کے ہمراہ ولولہ دل کا

چھوڑو، یہ راگ مالا۔ جوانی کی باتیں سنو۔ آدمی کی افتاد طبیعت نہ معلوم کیسے بنتی ہے۔ صرف ماحول سے تیار ہوتی ہے۔ یا توارث کا بھی اثر ہوتا ہے۔ ولی کے پیٹ میں شیطان اور شیطان کے پیٹ میں ولی۔ یہ علم الجنس ہے یعنی Biology کا وہ کھیل ہے جو سمجھ میں نہیں آتا۔ صورت کی شباہت اور جسم کی بناوٹ تو باپ دادا سے ارث میں آتی ہے۔ گھوڑا گھوڑی ایک رنگ کے اور بچے کے زیبرا ایسی لکیریں تمھارے باپوجی نہال سنگھ کے پاس ایک ایسی ہی گھوڑی تھی۔ تمھارے یہاں ڈیوڑھی کے پاس بوگن ویلیا کی ایک بیل لگی ہے جس میں دو رنگ کے پھول ہوتے ہیں۔ ان باتوں کی وجہ بیان کی جاتی ہے کہ یہ اس وقت کی نشانیاں ہیں جب گھوڑا اور زیبرا ایک تھے اور جب بوگن ویلیا میں بہت سی قسمیں نہیں ہوئی تھیں لیکن افتاد طبیعت کیسے بنتی ہے۔ اس کی وضاحت اس وقت ذہن میں نہیں ہے۔ میرے خیال میں وہی ''بھٹیارا باشد'' والی بات ہے یہ سب گڑبڑ جوانی ہی کی معلوم ہوتی ہے۔

مہندر سنگھ کیسے آدمی ہیں۔ میں نے ان کو اپنی کتابیں بھیجی ہیں مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ نہ معلوم اردو کے شائق بھی ہیں یا نہیں یا کتابیں ہی ضائع ہوئیں۔ آفاق آج کل گاؤں پر ہیں۔ ہم اور بدرل رہ گئے ہیں۔ خدا کرے تمھارا اسکول جلد چل نکلے۔ دیر ہونے سے گھبرانا نہیں۔ قیصر تم کو دعا کہتی ہیں۔ سعید تسلیم کہتے ہیں۔ جابر کو تمھارا خط پڑھ کر سنا دیا۔ بدرل دعا کہتے ہیں۔ لڈن کا مفصل حال دریافت کرکے لکھو اور جو پرسان حال ہیں ان سے سلام کہو۔ بچوں کو دعا۔

دعا گو

تمھارا باپ

---

(۴۱)

عابد میاں[52] کے نام

(بنام مولانا عابد الشمر صاحب مقیم لاہور، آخر نومبر)

لخت جگر، دعا۔ بابا فرید گنج شکر جب دنیا چھوڑ کر جنگل کو نکل گئے تو پیٹ پر کچھ اینٹیں باندھ لی تھیں کہ دل کو تسکین رہے کہ روٹیاں تو بندھی ہیں۔ جب جی چاہے گا کھالیں گے۔ اسی طرح جب تم علی گڑھ میں تھے تو دل کو تسکین تھی کہ عابد قریب ہی تو ہیں جب تار دیں گے چلے آئیں گے۔ اگر دیدار نہ دیکھیں گے تو نماز جنازہ تو پڑھا ہی دیں گے۔ اب اللہ میاں صاحب نے ہم کو نیک راہ لگانے کی یہ ترکیب نکالی ہے کہ تم کو یہاں سے دور پہنچا دیا۔ تاکہ ہمارا گنہ گار بندہ صرف ہمارے ہی اوپر بھروسہ کرنا سیکھ جائے۔

عاشق زار من بیا بر در ایں و آں مرد
بر درمن نشین کہ من از ہمہ وارہا نمت

ہم اس کے عاشق زار کب تھے یہ ترکیب تو اس نے ہم کو پھسلانے کی نکالی ہے۔ جیسے ماں کہتی ہے۔ ''بیٹا ہمارا بھوکا ہے ہم اپنے بیٹے کو ہپا کھلائیں گے۔ دیکھو پھر آنکھیں بند کیے لیتے ہیں'' دیکھیں یہ لقمہ یہ کون کھا جاتا ہے مگر لونڈا ایسا نٹ کھٹ ہے وہ اس پر بھی ٹھنک ٹھنک کر منھ پھیر لیتا ہے۔ مگر ماں کسی نہ کسی طرح اس کو کھلا ہی دیتی ہے۔ اسی طرح اللہ میاں کوئی نہ کوئی ترکیب سے ہم کو اپنا عاشق زار بنانے کی صورت پیدا کر ہی لیں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ اس وقت اگر تم لندن بھی چلے جاؤ گے تو ہم پرواہ نہ کریں گے۔ مگر جب تک یہ صورت نہیں ہے اس وقت تک تو ہم جن جن کو چاہتے ہیں ان کے لیے دل بے کل ہے ہی۔ تم ہوئے ہما ہوئیں، بجن، چھبن، الن ہوئیں اور اتر کر دو چار اور ہوئے ان سب کی یاد ستایا کرتی ہے۔ سلمان نے دوسری ترکیب نکالی۔ انھوں نے سوچا اگر ہم اس کو خط نہ لکھیں گے تو اس کو غصہ چڑھے گا اور جب اس کے دل میں شکایت پیدا ہوجائے گی تو یہ

کہے گا "اوہ جی اگر کوئی ہماری پرواہ نہیں کرتا تو ہم بھی اس سے فارغ ہیں اور اس طرح سے اس بڈھے خرف کی تکلیف کم ہی ہوجائے گی۔ جب یہ مرے گا تو بہنوں کو اور دوسروں کو تاسف کے خطوط لکھ دیں گے۔ ڈھونڈھ ڈھانڈھ کر کچھ صفات بیان کردیں گے کہ اردو اچھی لکھتے تھے۔ ہاہا بڑا افسوس ہے۔ قیصر کو لکھ دیں گے کہ تم گھبراؤ نہیں۔ میاں جان نہیں رہے تو کوئی بات نہیں ہم تو ہیں۔ اگر کسی بات کی تکلیف ہوگی تو ہم کو لندن میں خط بہت جلد مل جائے گا۔ صبر کرو صبر۔ صبر برنارڈ شا کیا کرتے تھے۔ دیکھو چورانوے برس جیئے۔ آخر خط میں انا للہ و انا الیہ راجعون لکھنے والے تھے مگر اس کے ہجے ہی نہیں یاد تھے۔ اس لیے چھوڑ گئے۔ قصہ مختصر یہ حال ہے.........

آج کل ہم ایک ڈرامہ لکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر یہ بیل منڈھے چڑھتی ہوئی معلوم نہیں ہوتی۔ اگر ختم بھی ہوا تو مکالمہ بن کر رہ جائے گا۔ ڈرامہ بڑی چیز ہے۔

آج کل موسم اچھا ہے۔ میں باغ کی طرف والے برآمدے میں بیٹھا ہوں۔ مریضوں کو دوا بھی دیتا جاتا ہوں تم سے باتیں بھی کیے جاتا ہوں۔ آج ضیغم(53) باہر پور سے آئے ہیں اس وجہ سے ذری جی خوش ہے۔

دعا گو

محمد علی عفی عنہ

۲۹رنومبر ۱۹۵۰

ہما بیگم کے نام

ردولی ۲۴؍دسمبر ۱۹۵۰ء

ہما پیاری۔ دعا!

یہ زندگی بھانگ کا نشہ ہے جس میں لہریں آتی ہیں۔ یکبارگی معلوم ہوا کہ آسمان پر جارہے ہیں۔ پھر معلوم ہوا کہ وہاں سے جو چلے تو تحت الثریٰ کو پہنچ گئے۔ وقت کا اندازہ نہیں۔ قرب اور بعد کا ٹھکانا نہیں۔ درد ٹیس اگر پہلے تھی بھی تو وہ غائب۔ فکر سے چھٹی ملی۔ مگر بے فکری بجائے خود ایک عارضہ ٹھہر گئی۔ خیال تو کرو۔ معلوم ہوا کہ کجن کے اتنا بڑا آپریشن ہوا اور کامیاب ہوا۔ الحمدللہ رب العالمین۔ اس کے پہلے کاظم کو قلب کا دورہ ہوا۔ ان کو بھی اللہ نے بچایا۔ لڈن کے پیٹ میں کچھ تھا۔ اس کا بھی آپریشن ہوا۔ کام میں ترقی ایسی ہوئی کہ جس پر اللہ کا جہاں تک شکر بھیجا جائے کم ہے۔ پیٹ والی شکایت کم ہوگئی۔ مگر پھر بھی باقی ہے، کام کیے جاتے ہیں۔ مگر شکایت ابھی ہے۔ ڈاکٹر لوگ کہتے ہیں یہ بھی دور ہوجائے گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ اوری جیل میں تھے۔ اب باہر آگئے۔ آدمی کمیونسٹ ہیں، مگر مل کی تیاری اور کاروبار کی بڑھوتی میں مصروف ہیں۔ سلمان کے کام کی تعریفیں ہیں۔ محنت اور مصروفیت کا پارہ اونچا ہے آئندہ کی امیدیں انشاء اللہ تعالیٰ ہیں۔

چھبن کا خط نہیں آیا۔ یقیناً سب خیریت ہوگی۔ کل شام کو چھبن کا خط آیا کہ بیس روز سے سبط کے تیز بخار ہے اور داہنے شانے میں درد تھا۔ خیر پور میں ایکس رے ہوا۔ شک ہے کہ پسلی کے نیچے مواد ہے۔ بقول جعفر زٹلی کے ''اب کہو کیسے بنے'' میاں محمد علی کا حال سنو۔ یہ سب کچھ ہوا اور وہ جہاں تھے وہیں ہیں۔ علاقوں کے جانے کی ۲۶؍جنوری تاریخ مقرر ہے۔ عمر قمری حساب سے ستر کے اوپر ہوچکی ہے۔ آئندہ کی امید موہوم۔ مستقبل بالکل اندھیرا ہے۔ مگر منصوبے برسوں آگے کے باندھے بیٹھے ہیں۔ حقہ ایسے پیتے ہیں کہ

لچھے دار دھواں سلطانہ عالم مرحوم مغفور کی یاد تازہ کراتا ہے۔ چائے پر مکھن، مربہ، بسکٹ ہیں، دسترخوان پر مزے کی چیزیں ہیں۔ کاہلی میں ایسے مگن ہیں کہ ٹھٹے کا کھٹکا بھی دبانا ہوا تو گھر میں ''یہاں آؤ'' کی فرعونی آواز گونج جاتی ہے۔ مگر خود ہاتھ بڑھا کر کھٹکا نہیں دبا دیتے۔ باوجود ان باتوں کے، بے بسی، بے اختیاری برابر زور پکڑ رہی ہے۔ مگر ہاتھ پاؤں نہیں ہلاتے۔ تمھارے گھر کے پاس منگل کی بازار میں ایک بہت بڑا املی کا درخت تھا اس شان کا درخت رودولی میں دوسرا نہیں تھا۔ آندھی جو آئی تو ٹوٹ پڑا۔ دیکھا گیا تو شاندار تنا اندر سے بالکل کھوکھلا ہوگیا تھا۔ لکڑی نہ سوختنی نہ فروختنی۔ اب پورے خط کی سب باتیں پیش نظر لاؤ اور دیکھ لو ہماری تصویر۔ تم لوگوں کی دوری، ہمارے غرور کی اونچائی، درخت کا کھوکھلا پن، ہواؤں کے مختلف جھونکے، روز روز کے تھپیڑے۔ بس اب اس آخری آندھی کا انتظار ہے۔ اس کے بعد نہ ہماسے مطلب نہ سبط سے واسطہ۔

عالم بخروش لا الہ الا ہوست
غافل بہ گماں کہ دشمن است ایں یا دوست
دریا بہ وجود خویش خطے دارد
خس پندارد کہ ایں کشاکش با اوست

ضیا[54] کا خط لکھنؤ کی مہر پڑا ہوا آیا ہے۔ اوری کا بڑا عمدہ خط آیا ہے۔ مگر چھٹن کا کارڈ ایسا آیا ہے کہ ان لوگوں کے جوابات لکھنے پر دل اس وقت تیار نہیں ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ کل لکھوں گا۔

ڈاکٹر صدیقی میو اسپتال والے سے میرا شکریہ ادا کرنا اور کہنا

سپردم بہ تو مایۂ خویش را
تو دانی حساب کم و بیش را

قیصر سب کو دعا کہتی ہیں۔ ہمارے پرسانِ حال جو جو ملیں سب سے دور افتادہ کا بہت بہت سلام!

دعا گو

تمھارا باپ

(۴۳)

عزیز صاحب وکیل کے نام

یار عزیز سلام شوق!

دوستوں کی ملاقات خوش آئند چیز ہمیشہ سے تھی۔ برادر مومن کی زیارت کا ثواب مذہب سے بھی ثابت ہے اب یقیناً بحکم ع رحمت حق بہانہ می جوید

اس میں خیرات کی بھی نیکی اضافہ ہوئی ہوگی۔ جن کو ہم چاہتے تھے اور جو ہمیں چاہتے تھے وہ بچھڑ گئے۔

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

دو چار جو رہ گئے ہیں وہ ایک دوسرے پر رحم کریں تو کون تعجب ہے۔ اور اگر اللہ میاں ان لوگوں کے نامۂ اعمال میں ملاقات کی نیکی لکھ لیں تو کون تعجب ہے۔ فلہٰذا آپ سے درخواست ہے کہ واپسی میں ہم لوگوں کو محروم نہ کیجیے گا۔ لوگ کہتے ہیں کہ جب ملنیم آئے گا، ہر کام ایسا ہوگا کہ دونوں کو فائدہ پہنچائے گا اور تکلیف سے بھی بچائے گا۔ اسی طرح ایک چیز جوانی میں تھی۔ وہ تو گئی۔ مگر اس کلجگ میں یہی بات شافی ہے کہ واپسی میں آپ ردولی آئیے ضرور آئیے۔ نہیں تو روز قیامت بھائی بدرل اور ہم آپ کا دامن پکڑ کر اللہ میاں سے داد چاہیں گے۔ آپ کے خطوط میں ہم کو ہمیشہ سلام ہوتا ہے۔ میاں بدرل جواب لکھ دیتے ہیں۔ میرا سلام لکھ دیتے ہیں۔ فرض کفایہ اس طرح ادا ہو جاتا ہے۔ آپ نے یہ خیال کیا ہے کہ میرے خیالات ماشاء اللہ بدیہی ہوتے جاتے ہیں۔ بڑھاپے میں یہ نہ ہوگا تو کیا ہوگا۔

کافر نہ توانائی شد ناچار مسلماں شو!

میاں بدرل کہہ رہے ہیں کہ میں نے آج ہی خط لکھا ہے اب دوبارہ سلام لکھوانا فضول خرچی ہے۔ اسراف اور اپنے کو ہلکا کرنا ہے۔

دعا گو دیرینہ، محمد علی عفی عنہ
۱۵ر جنوری ۱۹۵۱، ردولی

(۴۴)

مولانا عابد الشّبر کے نام

لختِ جگرم، دعا! چھبن کو خط دراز لکھا۔ کوئی کو کراچی لکھا، اوری کو لکھا۔ دو خطوط ہما کو لاہور لکھے۔ اب تجے کے خط سے معلوم ہوا کہ ہما ابھی کراچی ہی میں ہیں۔ لڈن کجن کی صحت کا شکریہ اللہ میاں سے عرض کیا۔ سبط کے لیے اللہ میاں سے درخواست بھی کی اور روبصحت ہونے کا شکریہ بھی ادا کیا۔ اوری کے چھٹنے پر بھی الحمدللہ رب العالمین کہا۔ مگر ادھر نہ معلوم کیا کہ صدائے بر نہ خاست اپنے لیے بھی اللہ کے دربار میں برابر عرضیاں گزران رہا ہوں۔ مگر وہاں سے بھی کوئی احکام ابھی تک جاری نہیں ہوئے۔ ادھر سے میں مایوس بالکل نہیں ہوں۔ مگر کسی طرح کچھ سن گن مل جاتی تو اطمینان ہوتا۔ چاہے وہ آخری حکم کی صورت میں ہوتا۔ یہاں زمینداری کی گھڑی ساعت لگی ہے۔ نئی ناون بانس کی نہتی۔ یہ بھی نہیں پتا چلتا کہ اس میت کو ٹھکانے لگا کر کیا انتظام کریں گے۔ ہم بھی بیٹھے ہیں کہ جو کچھ ہونا ہے ہو ہی ہوگا۔ کیا کریں پریشان ہوکر۔ روپیہ پیسے کا جو توڑ توڑا آئندہ ہونے والا ہے اس پر نظر کر کے میں نے کہا کہ یہ سنت جو شاہان دہلی کی ہم برقرار رکھے ہیں یعنی حقہ جو اتنا شاندار ہے اسی کی تخفیف بول دیں کہ دن بھر حقہ نہیں پیا۔ بری حالت ہوگئی۔ بلڈ پریشر بڑھ کر دو سو کے لگ بھگ پہنچ گیا۔ ناچار شام کو پی لیا۔ وہ تکلیف تو مٹ گئی مگر ارادے کی کمزوری، ہمت کی کمی، تہیہ کا بوداپن، مستقل مزاجی کی ڈھل مل یقینی، آئینہ ہوگئی۔ اس وقت صبح کے آٹھ بجا چاہتے ہیں اور حقہ منھ سے لگائے تم کو خط لکھ رہے ہیں۔ فاعتبرو یا اولی الابصار. سب کے لیے ہر وقت دعا کیا کرتے ہیں۔ تمھارے لیے بھی دعا کرتے ہیں مگر اورنگ زیب کی روح کان میں آ کر کہتی ہے۔

مپندار کاں کہنہ نخچیر گیر
بہ دام دعائے تو گردد اسیر

اللہ میاں فرماتے ہیں۔ ادعونی استجب لکم. اب تم ہی بتاؤ ہم اورنگ زیب کی بات پر کیسے کان دھر سکتے ہیں۔ گو اس میں کلام نہیں ہے کہ حضرت ایوب، حضرت یعقوب اور بہت بڑے بڑے آدمیوں کی حالتوں کا تجزیہ کر کے اورنگ زیب نے گُر کی بات بتائی ہے۔ مگر پھر بھی اللہ میاں صادق ہیں۔ اورنگ زیب کے ایسے دو ہزر بکا کریں تو ہم کب مانتے ہیں اور پھر یہ بات بھی ہے کہ اللہ میاں یہ تو دیکھیں گے کہ یہ گنہ گار بندہ ہمارا اورنگ زیب کی بات پر ہمارے قول کو ترجیح دے رہا ہے۔ اس میں اگر کام نہ بھی بنتا تب بھی فائدہ ہی ہے۔ لہٰذا عابد ہم دعا مانگتے ہیں تم بھی............

دعا گو

محمد علی عفی عنہ

۱۰؍فروری ۱۹۵۱ء

''......ایک درویش نے کسی دوسرے درویش سے پوچھا کہ تمھارے شہر میں درویشوں کا کیا رویّہ ہے۔ اس نے کہا ان کو جب ملتا ہے تو شکر ادا کرتے ہیں اور جب نہیں ملتا تو صبر کرتے ہیں۔ اس بزرگ نے کہا۔ ہمارے یہاں بغداد کے کُتّوں کا بھی ایسا ہی حال ہے...''

(گویا دبستان کھل گیا۔ صفحہ 150)

۴۵

مولانا حمایت الحسن[55] کے نام

مائی ڈیئر مولانا۔ ایک عورت تھی وہ بڑی ہنس مکھ تھی جس مرد کو دیکھتی تھی ہنس دیتی تھی۔ اس کے شوہر کو کچھ یہ بات پسند نہ تھی۔

عشق است و ہزار بدگمانی!

اس نے اپنے شوہر کو اطمینان دلایا ''ہنسنا میرا سبھاؤ بلم تم چنتا نہ مانیو'' یہی حال میری کوتاہ قلمی کا ہے۔ آپ اپنے خطوط محبت کا جواب دیر میں پاکر الجھا نہ کیجیے۔ اگر میں روز روز خطوط کا جواب دیا کروں تو اتنی تمہیدیں کہاں سے پاؤں اور میرے خطوط بجائے میری عقیدت کے ترجمان ہونے کے جمعرات کا آموختہ ہوکر رہ جائیں۔ اچھا اب سنئے میں بے حیا زندہ ہوں اور باوجود دنیاوی فکروں کے زندہ رہنے کا ویسا ہی آرزومند ہوں تاکہ اپنے چاہنے والوں کو خطوط لکھا کروں اور اللہ میاں سے دعائیں مانگا کروں۔

یارب اماں دہ تا باز بینند
چشم محباں روئے حسیناں

ارے بھئی یاد آیا میں ٹھاکر صاحب کا نام بھول گیا۔ جن کے یہاں چائے پی تھی اور برج کھیلا تھا۔ ارے بھئی وہی چھتریا کالج کے ہیڈ ماسٹر ان کو نہ معلوم ہو کہ میں ان کا نام بھول گیا ورنہ ان کو میری بات اوچھی معلوم ہوگی اور مجھ کو خفت ہوگی۔ مگر ان کو میرا پیغام دے دیجیے گا۔ انھوں نے تمھارے رشتے سے مجھے ماما کہنا شروع کیا تھا جس کی وجہ سے ان کی جگہ میرے دل میں اور زیادہ ہوگئی تھی۔ ان کی کتابیں دیکھ کر ان کے پڑھے لکھے خوش علم ہونے کا اثر ہوا تھا۔ اسی کے ساتھ یہ کی بھی محسوس ہوئی تھی کہ بجائے خود اپنے دماغ سے باتیں نکالنے کے شیکسپیئر اور ملٹن کا مال گُدڑی بازار میں لیے بیٹھے رہتے ہیں۔ اچھا خیر ان سے میری طرف سے کہہ دیجیے گا کہ اگر وہ مجھے چچا کہنا شروع کرتے تو مجھے

زیادہ فکر لاحق نہ ہوتی۔ مگر انھوں نے ماما کہنا شروع کیا تھا۔ بھائی لوگ تو لڑنے بھڑنے والے ہوتے ہیں ان کی میں زیادہ پروانہیں کرتا۔ بہنیں خالص محبت کی دیویاں ہوتی ہیں۔ ان کا رشتہ دل کو بے غرض ٹھنڈک پہنچاتا ہے۔ انھوں نے وعدہ کیا تھا کہ بڑے دن کی چھٹیوں میں میرے یہاں آئیں گے۔ میں برابر آس لگائے رہا مگر وہ نہ آئے۔ میں نے بدرل وغیرہ سے ان کی تعریفیں کر رکھی تھیں ''دوست آدمی ہیں پڑھے لکھے ہیں'' اپنی کتابوں سے کہہ رکھا تھا کہ ایک دن ان کا قدر دان ان آنے والا ہے'' مگر کچھ بھی نہ ہوا۔

یہ خط یہاں تک آٹھ نو روز ہوئے لکھا گیا تھا پھر میں بیمار پڑ گیا۔ بحمداللہ آج بالکل اچھا ہوں۔ ہمارے یہاں عرس اگلے جمعہ سنیچر کو ہے۔ آفاق میاں آپ کو لکھ چکے ہیں یا عنقریب لکھیں۔ میں بھی آپ کو لکھ رہا ہوں کہ آپ ہماری بھانجی سلمہا اور بچوں کو لے کر حاضر ہوئیے۔ میں خط لکھوں یا نہ لکھوں مگر دل سے ہمیشہ اپنے چاہنے والوں کو یاد کیا کرتا ہوں۔ رضیہ سلمہا اور حفاظت کو میری بہت بہت دعائیں پہنچائیے گا اور کہیئے گا کہ جو جو میری Sweet Pease بڑھتی تھیں میں ہمیشہ رضیہ اور حفاظت کے باغ کو اور ان کو یاد کرتا تھا۔ میرے Sweet Pease اب ختم ہو رہے ہیں۔ نو دس فٹ تک بڑھے۔ دوسرے پھول بھی اچھے ہوئے خدا کرے میرے دوستوں کا بھی باغ سرسبز رہے اور سوا دعائے عمر و اقبال کے اور کیا عرض کروں۔

دعا گو

محمد علی عفی عنہ

یکم مارچ ۱۹۵۱ء

---

(۴۶)

للّن صاحب کے نام

میرے کرم فرما۔ دامت اعظامکم، تسلیم۔ بہت دنوں سے خط لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔مگر پریشانیاں، افکار، نہ لکھ سکا مگر پھر بھی میرا دل مجھ کو برا نہیں کہتا۔

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

راجہ صاحب سلمہ کو خط لکھنے کا تہیہ کیا گیا۔مگر لکھ نہ سکا۔ میری دعا عرض کردیجیے گا۔ دعاؤں کا شکریہ ادا کردیجیے گا۔ مہاراجہ راجکمار سلمہ کی خدمت میں بھی دعا پہنچایئے گا اور عرض کردیجیے گا۔

چو با حبیب نشینی و بادہ پیمائی
بہ یاد آر محبانِ بادہ پیما را

ذری وقت دعا بھول نہ جایئے گا۔کنور صاحب کو دعائے عمر و اقبال۔ آفاق سلمہ بھی ایسے ہی مضامین کی باتیں کر رہے ہیں۔للّن صاحب دیکھیے اب آپ کا دیدار کب نصیب ہوتا ہے۔کل آپ کی بیگم صاحبہ اندر تشریف لائی تھیں۔

دعا گو اور دعا خواہ

محمد علی عفی عنہ

ردولی، ۱۲/مارچ ۱۹۵۱ء

مکرر آنکہ یہ خط کئی دن ہوئے لکھا گیا پھر میں بیمار پڑ گیا۔آج بحمد للہ دل سنبھلا ہے اور جسم آرام سے ہے۔

للّن صاحب! آپ کا خط آپ کی بیگم صاحبہ نے میرے پاس بھیج دیا اور میں نے

پورا خط پڑھ لیا۔ معاف کیجیے گا مجھ کو وہ خط پڑھ کر کچھ خوشی نہ ہوئی۔ میرے خیال میں بی بی کا خط اور اللہ میاں سے دعا صرف دو چیزیں ایسی ہیں جس میں کسی تیسرے کا بیچ نہ ہونا چاہیے۔ ایسا خط ایسی دعا جو غیر بھی جان لے کچھ ٹھیک نہیں۔ اگر آپ میری ناچیز صلاح مانئے تو اب کی بار اپنی بیگم صاحبہ کو ایسا خط بھیجئے گا جو وہ کسی کو دکھا نہ سکیں۔ آپ نے سنا نہیں ہے کہ لاشریک له و لاشریك لها۔

۱۷/مارچ ۱۹۵۱ء

"... لیجیے صاحب! اس کے بعد بھاؤ شروع ہوئے۔ وہ حنائی ناخون، ہونٹوں کی سرخی اور آنکھوں کے لال ڈوروں کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ یہ مجبور کے خونیں دل کا پتہ دیتے ہیں کہ خوشی کی خبریں بھی یوں رنج میں لہو کے آنسو رلاتی ہیں ۔

اپنی بپتا کا سے کہوں— تمرے کارن جو دکھ پاوا

کے معنی اب آئینہ ہوگئے۔ اس نے انگوٹھے کی آرسی دیکھی، زرد دوپٹے کا آنچل ہاتھ پر لیا کہ رنگ ایسا ہوگیا ہے۔ کلائی سے نیچے کو اِدھر اُدھر الٹے پلٹے دیے کہ رات کروٹیں بدلتے کٹی ہے۔ پچھتاوے کے انداز سے داہنے ہاتھ کی ہتھیلی پر ٹھنڈی جمائی، اس ہاتھ کی ہتھیلی کہنی کے نیچے رکھ کر خیالی زانو قائم کیا انھوں نے انترے کے معنی ہویدا کر دیے کہ

کدرَ پیا تمری کھتا نا ہیں— مورا کیا مورے آگے آوا"

('دور کا نشانہ' کشکول)

(۴۷)

عزیز صاحب کے نام (اعظم گڑھ میں)

یار عزیز! سلام محبت۔ آج کئی روز ہوئے تمھارا خط اور نجے سلمہ والا خط آیا تھا جواب آج لکھ رہا ہوں۔ نجے بدرل اور تمھارے ایسے باقاعدہ لوگوں میں پھنس کر میری مٹی خراب ہے۔ میں الول جلول آدمی خط لکھنے پر آگیا تو برابر لکھتا ہی رہتا ہوں اور اگر سون کھینچی تو خبرے می خیزد۔

اتنے زمانے میں میاں بدرل نے نجے سے جواب طلب کیا۔ ان کا تحریری جواب بھی مع عذرات معقول کے آگیا۔ یہاں بدرل کے ذریعے سے تمھارا تقاضا بھی موصول ہوا اور ہم ہیں کہ کانوں میں تیل ڈالے بیٹھے ہیں۔ تم کہتے ہوگے ایسے نالائق آدمی سے محبت کرنا چھوڑ دینا چاہیے۔ یا کم سے کم خط کتابت تو اب ہرگز نہ کی جائے۔ پھر دل کہتا ہے کہ یہ تو ٹھیک ہے مگر اتنا پرانا دوست ہے پڑا بھی رہنے دو۔ اب اگر نیا دوست پیدا کریں گے تو اس کے اتنا پرانا ہونے میں برسوں لگیں گے، جیسا بھی ہے غنیمت ہے۔

چند آدمی اجمیر شریف کی زیارت سے واپس آرہے تھے۔ ان کے ساتھ جو نوکر تھا نہایت بے وقوف تھا۔ وہ لوگ لکھنؤ آرہے تھے۔ سندیلہ وغیرہ کے اسٹیشن پر اس کو روپیہ توڑانے بھیجا۔ اس نے روپیہ توڑایا اور آٹھ آٹھ آنے پیسے دونوں مٹھیوں میں لے کر ریل کی طرف بڑھا۔ اتنے میں ریل چھوٹ گئی۔ اب وہ برابر گاڑی کے ساتھ دوڑا چلا جاتا ہے مگر ریل پر چڑھتا نہیں ہے۔ یہاں تک کہ پلیٹ فارم ختم ہوگیا اور وہ رہ گیا۔ لکھنؤ پہنچ کر بڑی دقت کا سامنا ہوا کیونکہ قافلے بھر کے ٹکٹ اسی کے پاس تھے۔ خیر بہزار خرابی ان غریبوں کی جان اسٹیشن والوں سے چھوٹی۔ کچھ گھوس بھی دینا پڑی۔ شام کی گاڑی سے ملازم صاحب آئے۔ آقا غصّے میں بھرے بیٹھے تھے کہنے لگے۔

''ابے تو تو برابر ریل کے ساتھ دوڑا کیا اور گاڑی پکڑ کر چڑھ کیوں نہ آیا۔''

نوکر: میاں دونوں ہاتھوں میں تو پیسے تھے گاڑی کا ڈنڈا کیسے پکڑتن۔

آقا: ابے پیسے ایک ہاتھ میں لیتا دوسرا ہاتھ خالی ہوجاتا۔

نوکر: واہ میاں اب ترکیب بتاوے چلے ہَو۔ادبیر نہ بتلائیو۔

آقا: اور مردود سب کے ٹکٹ بھی تیرے ہی پاس تھے۔

نوکر: لیو میاں اپنے ٹکٹ لیو، گسّا کاہے کرت ہو۔

اب ایک دوسرے نوکر کا حال سنئے۔ حاجی بغلول مرحوم کے ملازم تھے میاں ہرفاریوڑی۔ کچہری میں ان کی عرضی دعوے کا مسودہ کھوگیا۔ وہ تلاش ہی کر رہے تھے کہ نواب صاحب کا چوبدار پہنچا کہ آپ کو نواب صاحب نے فوراً طلب کیا ہے۔ یہ تو ادھر مسودہ ڈھونڈھنے میں مصروف تھے۔ چوبدار نے کہا لاؤ ککڑ والے کے پاس بیٹھ کر دوکش حقے کے کھینچ لیں۔ میاں ہرفاریوڑی نے چوبدار کے چھجے دار ٹوپی کے نیچے چوبدار کی لمبی سی گدی دیکھی۔ ہتھیلی میں کھجلی ہوئی۔ ایک چانٹا جھاڑ بیٹھے۔ نگالی چوبدار کے حلق میں گھس گئی۔ ٹوپی اڑ کر چلم سے ٹکرائی۔ چلم ٹکڑے ٹکڑے، کوئلے ادھر ادھر زمین پر پڑے ہیں ککڑ والا چلم کے پیسے مانگتا ہے۔ چوبدار بدلا لینے کو تیار۔ دیوانی میں فوجداری کا سماں بندھ گیا۔ حاجی صاحب نے جو یہ دیکھا۔ اپنے ملازم کو ڈانٹ بتائی کہ یہ کیا کرتا ہے۔ وہ دو آدمیوں سے پہلے ہی لڑ رہا تھا۔ تیسرے حاجی صاحب آگئے۔ میاں ہرفاریوڑی نے پکار کر حاجی صاحب سے کہا۔ میاں اس وقت اپنے ہاتھ پاؤں بچائے رہئے گا۔ میں جھوٹ کے ہاتھ پھینک رہا ہوں۔

اسی طرح بھائی عزیز آج کل ایک رسالہ لکھ رہا ہوں اس کا نام ہے ''میرا مذہب'' اگر یہ چھپ گیا تو شیعہ سنّی دونوں مجھ کو گالیاں دیں گے۔ اور ایک نیا فرقہ پیدا ہوجائے گا تعجب نہیں۔ تم ٹھہرے سنّی آدمی اگر اس کو پڑھ کر تم بھی تبرّے کی مشق میرے اوپر کرنے لگو تو تعجب نہیں۔

دعاگو

محمد علی عفی عنہ

۶؍اپریل ۱۹۵۱ء

مکرر آنکہ ایک بات لکھنے کو رہ گئی۔ میاں نجے کہتے ہیں انھوں نے عمر میں کبھی یہ نہ کیا کہ ایک خط دوسرے کے لفافے میں رکھ جائیں۔ ان کے خیال میں یہ سنسر صاحب کی حرکت ہے۔ حاجی جب گھوڑی خریدنے نیلام چلے تو خود بہت سویرے یکہ والے کو جا کر جگایا تھا۔ جب نیلام میں گھوڑی خرید چکے تو روپے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ روپے ہاتھ میں لگتے ہیں، مگر نکل نہیں رہے ہیں۔ جھک کر دیکھا تو عبا الٹی زیب تن تھی۔ کہنے لگے وہ تو مال مزکی تھا ورنہ الٹی جیب میں کبھی کچھ رہا ہے۔ یہ سب اسی یکہ والے کی حرمزدگی ہے۔ کیا شریر قوم ہوتی ہے کیا نام کہ یہی قول میاں نجے کا ہے۔

محمد علی عفی عنہ

(۴۸)

خورشید صاحب کے نام

میرے پرسان حال بھائی خورشید صاحب کو سلام محبت پہنچے!

گمانِ زیست بود بر منت ز بیدردی　　بداست مرگ و لے بدتر از گماں تو نیست

محسود زیادہ ہوں اور حاسد کم۔ چاند کے حساب سے بہتر واں سال ۳۰ رجمادی الآخر کو شروع ہوگیا پھر بھی ہنس بول لیتا، برج کھیل لیتا ہوں۔ خوبصورت عورت کو دیکھ کر کم سے کم دل میں تو گرمی پیدا ہو ہی جاتی ہے۔ اس سن میں اتنی خیالی قابلیت بھی قابلِ رشک ہے۔

دل ابھی تک جوان ہے پیارے　　ایک آفت میں جان ہے پیارے

فالحمدللہ رب العالمین۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے آپ کا محبت نامہ میرے ذمے نہیں ہے۔ بہرحال یہ تو ثابت ہے کہ جب آپ کے دل میں میرا خیال آیا تھا اس وقت میں بھی آپ کی دوستی کے مزے لے رہا تھا کیونکہ ہمارے آپ کے خطوں سے راستے میں کہیں ملاقات ہوئی ہوگی۔ خالی فرق اس قدر تھا کہ آپ بے غرض یاد کر رہے ہیں اور میں اپنی غرض سے۔

آج کل میں ایک رسالہ لکھ رہا ہوں۔ میاں کھدّن[56] کی پامردی سے ختم بھی ہوگیا۔ یہ عیب بڑا ہوگیا ہے کہ لوگ اس کو پڑھ کر خوش نہ ہوں گے۔ اس کا نام ہے "میرا مذہب" بھائی خورشید آپ سمجھ سکتے ہیں کہ محمد علی اپنا مذہب بیان کرے اور کوئی خوش نہ ہو یہ امیر خسرو کی انملی ہے۔

در کوئے نیک نامی مارا گذر نہ دادند　　گر تو نمی پسندی تعبیر کن قضا را

لیکن اس رسالہ سے میری آنکھوں کی سوئیاں ضرور نکل جائیں گی۔ دل کی آرزو تو یہ

تھی کہ اس رسالے سے شیعہ سنی کچھ قریب آجاتے۔ مگر افتادِ طبیعت کچھ ایسی بری واقع ہوئی ہے کہ کہیں اگر میری سعی مشکور ہوگئی جس کا امکان صرف واہمہ ہے تو ایک نیا فرقہ پیدا ہوجائے گا۔ آج کل علاوہ روحانی تکلیف کے ایک جسمانی تکلیف بھی اضافہ ہوگئی ہے۔ یعنی کمر میں سخت چک آگئی ہے۔ آپ کہیں گے کہ یہ کون ایسی مصیبت تھی جس کی بنا پر احباب سے خراج ہمدردی وصول کیا جائے۔ حضرت بات یہ ہے کہ ایک بار دو کائستھ میرے پاس ایک غرض لے کر آئے اور بہت چالاکی سے اپنا مطلب نکالنے میں مصروف ہوگئے۔ میں نے کہا ''ہو نہ کائستھ اپنا مطلب نکالنے کے لیے دوسرے کے نقصان کی پروا نہیں کرتے ہو۔'' انھوں نے جواب دیا ''ہم وہ کائستھ نہیں ہیں جو آپ سمجھتے ہیں'' اسی طرح میری کمر کی چک وہ نہیں ہے جو آپ سمجھ رہے ہیں۔ یہ ایسی چک ہے جو نماز میں بجّنی بنا دیتی ہے۔ بچوں کو دعا۔ پرسان حال کو تسلیم۔ خصوصاً پڑوسی اسحاق صاحب کو۔

دعا گو

محمد علی عفی عنہ

۱۲/اپریل ۱۹۵۱ء

---

(۴۹)

میجر ابو جعفر کے نام

مکرمی وعطوفی دامت اشفاقکم! سلامِ شوق، نہ جانے کتنے نیاز نامے کتنے عقیدت نامے جناب کے نام لکھ چکا ہوں۔ جو قلم اور کاغذ کے شرمندہ نہیں ہوئے۔ آج بھائی بدرالحسن نے آپ کا خط دکھایا۔ گویا ہوئے۔ بہ مستان یاد دہانید۔'' جس رسالے کی خبر آپ کو بھائی بدرل نے دی ہے اس کے لکھنے کی آرزو ہمیشہ سے تھی مگر کچھ بنتا نہ تھا۔ آخر کار لکھ ہی گیا۔ مگر جو خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر نہ ملی۔ میں چاہتا تھا یہ رسالہ ایسا ہو جیسا میر تقی میر بتا گئے تھے۔ یعنی

جی میں جو آوئے کیجو پیارے
ایک ہونا نہ درپئے آزار

افسوس صد افسوس یہی نہ ہوا۔ آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ حدیث وتفسیر کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ جی کے دیکھے جاڑا جوڑی وہی بَرہیاہَن آوے۔ حضرت! احادیث وتفسیر ہی کے دکھوں تو یہ رسالہ لکھا گیا ہے۔

زبانیں بحث میں الجھی ہیں حیرت دل پہ چھائی ہے
حدیثوں میں مذاہب ہیں حوادث میں خدائی ہے
خوب لڑوایا بہم دل کھول کر
راویوں نے مار ڈالا قوم کو

قرآن سمجھنے کے لیے احادیث ضروری ہیں لیکن اسی قدر جتنی ضروری ہوں۔ یہ نہیں کہ بجائے دال میں نمک کے، نمک میں دال ڈالی جائے اور واقعی ہوا ہے یہی کہ ہمارے علماء منبر پر سے یا چوکی پر سے اگر ایک آیت پڑھتے ہیں تو پچیس احادیث پڑھتے ہیں۔ فرقہ بندی کی دلآویزی سے واقف ہیں۔ لہٰذا وہی کرتے ہیں جس میں قدر زیادہ منزلت زیادہ ہونے سے زیادہ ہاتھ آئے اور حلوے کا کونڈا گزشتہ سال سے زیادہ بڑا ساتھ جائے۔

مرے قرآن پڑھنے سے نہ ہوں یوں بدگماں حضرت
مجھے تفسیر بھی آتی ہے اپنا مدعا کہیے

(اکبر)

اگر معلوم ہو جائے کہ آپ کا رجحان تشیع کی طرف ہے یا سنیت کی طرف یا تصوّف کی طرف یا وہابیت کی طرف تو جس طرح کا مال چاہیے حاضر ہے۔ آپ کی دعا سے ہر طرح کا مال گودام میں بھرا پڑا ہے۔

حضرت نہ پوچھیے اس وقت میرے دل کا حال۔ منیجر صاحب ستر برس کا ہوں۔ ہر وقت کتاب کا کیڑا رہا۔ مگر چونکہ بنیاد اچھی نہیں تھی اس لیے اوپر کی عمارت بودی رہی۔ صرف ونحو سے نابلد۔ لیٹن نہیں جانتا، فرینچ نہیں جانتا کتاب لکھنا صرف اسی کو زیبا ہے جو موضوع پر حاوی ہو۔ ہم نے دوسروں کے اقتباس تیسروں کی کتابیں پڑھ کر کتاب لکھی۔ کاش کہ یہ جرأت نہ کرتے۔ اچھا چھوڑیئے اس قصے کو۔

جناب تھوڑی دیر کے لیے تشریف لائے تھے۔ جلیس الخیر نعمۃ اس وقت سے اس دولت مستعجل کی روشنی دماغ میں ہے۔ اگر تصنع کرتا ہوں تو رو سیاہ ہوں۔ جب آپ کا کوئی خط دیکھا ہے جب دولت ہم کلامی نصیب ہوئی ہے، تب کچھ نہ کچھ اس فقیر کی جھولی میں پڑ گیا ہے۔ کبھی منوہر کانگولی عبرت دلا گئے کبھی ''بھلا یہ کون دھرم ہے'' نے نئے نئے گوشے پیش نظر کر دیے۔ کبھی جناب صاحب الامر علیہ السلام کی راہ کی مشکلات آئینہ ہو گئیں۔ کبھی تلسی داس نے جناب امیر علیہ السلام کے کلام کی تفسیر کر دی۔ اشرف الناس مومن ینفع الناس کبھی اس بڑھاپے میں دوشاخہ لکڑی سے ڈھارس ہو گئی کہ بڑھاپے میں بھی کام چلا جائے گا۔ قصہ مختصر جب موقع ملا تو آپ کے قدموں کی خاک سے کچھ نہ کچھ موتی ہی رول لیے۔

یارب اماں وہ تا باز بیند
چشم محباں روئے حبیباں

آمین ثم آمین! منیجر صاحب بھلا کچھ امید کی جائے کہ لکھنؤ کا پھیرا ہوگا۔ میں نے

اکثر محسوس کیا ہے کہ میں Parasitic انداز کا آدمی ہوں۔ اگر آدمی ایسا ہوا کہ اس سے کچھ سیکھ لوں تو بندۂ بے دام ہوں۔ اگر یہ نہ ہوا تو اپنے وقت کا فرعون ہوں۔ بھائی بدرل کو خط لکھنے کا عارضہ ہے اور میں کوتاہ قلمی کی اقلیم کا بسنے والا ہوں۔ لیکن اگر کوئی آپ کا ایسا خط لکھنے والا ہو تو دین و دنیا کا کام چھوڑ کر اسی پر کمر باندھ لیتا ہوں۔ ''مارک ٹوین'' جب انگلستان آئے تو بڑی آؤ بھگت ہوئی ہر جگہ ڈنر ہوئے، اسپیچیں دیں۔ گروسرز کلب کی اسپیچ ان کی بہترین تھی۔ مارک ٹوین نے کہا بیرل کا ایسا گدگدی کرنے والا ابھی تو کوئی نہ تھا۔

بدرل حسن صاحب سلامِ شوق فرمارہے ہیں۔

بندہ محمد علی عفی عنہ

۱۷/اپریل ۱۹۵۱ء

۵۰

محسن علی کے نام

بھائی محسن علی صاحب! سلام مسنون اور آرزوئے دیدار کے بعد بہن مرحومہ کے انتقال کی خبر ہما بیگم کے خط سے معلوم ہوئی۔ نہ آپ کا پتا معلوم نہ صادق سلمہ کا۔ ہما بھی کراچی میں تھیں یا لاہور میں اسی وجہ سے خط میں دیر ہوئی۔ عموماً کچھ دنوں کے بعد تعزیتی خطوط نہیں لکھتے ہیں۔ کیونکہ گھڑی بھر کے لیے اگر کوئی بھول گیا ہو تو اس کو یاد دلانا کون اچھی بات ہے۔ مگر میں تجربے سے جانتا ہوں کہ یہ چیزیں ہر وقت پیش نظر رہتی ہیں۔ بڑھاپے کا ساتھی ساتھ چھوڑنے پر بھی ساتھ ہی رہتا ہے۔ کیا کروں تلقین صبر کرکے۔ آپ خود ان باتوں کو سمجھتے ہیں۔ یہ بھی محسوس کرتے ہوں گے کہ ایسے وقت میں سوا اللہ میاں کے اور کوئی مدد نہیں کرسکتا۔ ہاں البتہ بہن مرحومہ کے لیے دعائے مغفرت کرتا ہوں، بار الہا اپنی نیک بندی کو اس کی نیک اعمالی کا بدلہ دے اور اس کو اپنا قرب نصیب کر۔ آمین، ثم رب العالمین۔

نہ معلوم کب سے ملاقات نہیں ہوئی۔ ظاہراً تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اب فردائے قیامت میں ملاقات ہوگی لیکن ممکن ہے اللہ میاں اس دنیا میں پھر ایک مرتبہ ملا دیں۔ باوجود اس کے ہم آپ ایک دوسروں کا خیال کرکے دل کو لمحہ بھر کے لیے خوش کر ہی لیتے ہیں ؎

دوریم ارچہ از در دولت سرائے تو　　　لیکن بجان و دل زمقیمان حضرتیم

ایک عرب شاعرہ کے مصرعے ہیں جب میرے اوپر تازہ تازہ مصیبت پڑی تھی تو ان سے ایک سکون ہوتا تھا۔ آپ بھی آزمائیے۔

Tears, ere thy death, for many alone I shed
But thine are all my tears since thou art dead

To comforters I lend my ears apart

While pain sets ever closer to my heart

میری بھانجی بھانجے اور بہن کی ذرّیات کو میری بہت بہت دعائیں۔میری بی بی تسلیم کہتی ہے۔ دعا کہتی ہے اور اس خط کے لفظ لفظ میں شریک ہے۔ بہن مرحومہ کو جس نے ایک بار بھی دیکھا ہے اس کا یہی حال ہے۔

دورافتادہ

محمد علی عفی عنہ.

ردولی، اودھ ۱۸رمئی ۱۹۵۱.

---

(۵۱)

عابد کے نام

بیٹا عابد! سلمک الرحمٰن۔ دعا۔ کچھ لوگ تھے جن سے دل کا تعلق تھا۔وہ ایک ایک کر کے سب پاکستان چلے گئے یا انگلستان چلے گئے اور ہم نے یہ حماقت کی تھی کہ بجائے اللہ میاں کا بھروسہ ڈھونڈھنے کے ان لوگوں کا سہارا لیا تھا۔ اسی وجہ سے تکلیف زیادہ ہوگئی۔ اللہ میاں کا سہارا لیتے تب بھی کیا ہوتا۔ آئندہ تو عقیدے کے مطابق ضرور اچھا ہوتا مگر دنیا میں اس سے بھی بدتر حالت ہوتی تب بھی کوئی تعجب نہ تھا۔ سنتے تو یہی ہیں جس کو پسند کرتے ہیں اس کو اور زیادہ جھکائیاں دیتے ہیں۔ اصلیت تو انھیں معلوم ہوگی۔ بہرحال چاہے سلمان ہوں چاہے ڈاکٹر سبط۔ چاہے عابد ہوں سب کا ایک حال ہے۔ ہماری بھی زبردستی ہے۔ ہر شخص اپنے حال میں مبتلا ہے اور ہم چاہتے ہیں دنیا سب کام کاج چھوڑ چھاڑ کر ہماری تیمارداری میں لگی رہے۔ سورۂ فاتحہ پڑھ پڑھ کر دم کیا کرے۔ قرآن کی ہوا دیا کرے اور زادالمعاد سے دعائے ردِ سحر نکال کر ہمارا بازو پکڑ کر پھونکا کرے۔ یقین جانو تمھاری یاد ہمیشہ ستایا کرتی رہی ہے۔ جب بیمار تھے دو راز حال تب، ماشاء اللہ جب اچھے ہو یعنی اب مگر آج کل مہینہ بھر سے تو ہر وقت تم نگاہ کے آگے رہتے ہو۔ وجہ یہ ہے کہ میں نے ایک رسالہ لکھا ہے، ''میرا مذہب'' اس رسالے نے مجھ کو بیمار ڈال دیا۔ وجہ یہ ہے کہ جو انہماک اس رسالہ میں مجھ کو ہوا اس سے پہلے کسی کتاب میں نہیں ہوا تھا۔ سوتے جاگتے اسی کا خیال رہتا تھا۔ خط کتابت، آنا جانا سب تقریباً بند ہوگیا۔ خدا خدا کر کے ختم ہوا تو میاں کھدّن کی وجہ سے سات کنویں جھانکنے پڑے۔ تین نقلیں میرے کٹے پٹے مسودے کی کیں اور ہر مرتبہ پہلے سے زیادہ غلط لکھا۔ اس دوران میں اکثر چاہا کہ مسودہ چولہے میں جھونک دوں اور کپڑے پھاڑ کر کسی طرف نکل جاؤں۔ مگر صبر و تحمل سے کام لیا۔ دو تین دن ہوئے خیال گزرا کہ صادق اور رجّن ردولی میں ہیں۔ لاؤ ان سے صاف کروالوں۔ عربی کے جملے، آیتیں وغیرہ کے اعراب درست ہوجائیں گے۔ رجّن کا خط بھی اچھا ہے۔ چنانچہ

وہ مسودہ اب ان دونوں کے قبضے میں ہے۔ اگر خدانخواستہ نصیب دشمناں، شیطان کے کان بہرے صادق نے صبح کی چائے بنانے کے لیے آگ اسی مسودہ سے تیار کی تو ہر طرح سے اطمینان ہو جائے۔ ع

این دفتر بے معنی در شعلۂ آگ اولیٰ

(ناراولیٰ بھی ہوسکتا تھا مگر آگ اولیٰ ہی رہنے دو) تم سے اپنی پریشانیوں کا کیا حال بیان کروں۔ بس یہ سمجھ لو کہ تمھاری پریشانیوں کا آئینہ ہے (دیکھو بھائی ہم کسی کا نام نہیں لیتے) زمینداری الگ جارہی ہے۔ کمر کا درد مہمان طریق بن کر آیا تھا۔ وہ الگ مستقل ہوکر جم بیٹھا ہے، بڑھاپا الگ گھیرے ہے اور سب پر طرہ یہ ہے کہ عورتوں میں سنس آف ہیومر نہیں۔ کچھ دن ہوئے سنا تھا کہ یونیورسٹی سے تمھارا قطع تعلق ہوگیا۔ دیدار سے اس زندگی میں مایوس ہوگیا تھا۔ اب پھر سنا ہے کہ بڑی چھٹیوں تک کی مہلت ہے۔ دنیا بہ امید قائم۔ بڑی تعطیل کے ختم ہونے کی بڑی آس لگائے بیٹھے ہیں۔ ارے میاں کہیں رہو آرزو یہ ہے کہ خوش رہو۔ ہم نہ دیکھیں گے تو کیا ہرج ہو جائے گا۔ کچھ ایک تم ہی ہو تمھارے ایسے نہ معلوم کتنے پاکستان کی زمین میں پڑے ہیں، جن کے لیے میر تقی میر کہہ گئے ہیں ۔

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

ہم خود سفر کی طرف سے تقدیر کے ایسے بیٹھے پیدا ہوئے ہیں کہ زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد۔ کہیں آنے جانے کے قابل نہیں رہے۔ عمر بھر خرچ کیا۔ بے دھڑک روپیہ پھینکا۔ پاکستان آویں تو پچاس روپلی جیب میں ہوں گے۔ کجن سے ادھار لو۔ الّن سے ادھار لو، اگر قرض کریں تو کس برتے۔ اگر قرض نہ کریں تو جینے کا مقصد۔ سفر کا مقصد، دیدوادید کا مقصد سب ہیچ۔ پچاس دل والے، سیکڑوں احباب، ہزاروں ملاقاتی کسی کو ایک پیالی چائے بھی نہ پلا سکے تو سب مزا کرکرا ہوگیا۔ بس یہی بہت ہے۔ اس وقت سیکڑوں صورتیں نگاہ کے سامنے گزر رہی ہیں، یہی کیا کم ہے۔ ایک تھے بنگالی بیچارے مچھلی کو ترس گئے تھے۔ دریا کے کنارے بھات لے کر بیٹھ گئے۔ ادھر مچھلی اچھلی ادھر لقمہ منھ میں رکھا۔ ''وہ مچھلی یہ بھات'' خط لکھ رہا ہوں۔ تمام خوش خوش چہرے میرے اردگرد ہیں۔ میاں جان، نانا، دادا، چچا، بابا، چودھری صاحب، بابا، ماموں، بھائی محمد علی، یار محمد علی، چمرو چچا کی آوازیں سن رہا

ہوں۔ ڈاکٹر منصور صاحب بلڈ پریشر کا آلہ کھولے بیٹھے ہیں اور مجتبیٰ صاحب کے میراق کے قصے بیان کر کر کے مجھ کو یقین دلا رہے ہیں کہ ابھی بے حیا زندگی اور باقی ہے۔ خالی دماغ خراب ہوگیا ہے۔ کوئی گھبرانے کی بات نہیں۔ برومو ویلیئر بنٹ کا استعمال رکھو۔ دماغ تو جاچکا مگر کشکول اچھا خاصا ہوگیا۔ ارے میاں تکی تو تم ہمیشہ کے تھے۔ اب قلم کے پاؤں میں سنیچر آ گیا ہے۔ رکنے کا نام نہیں لیتا۔

کچھ دن ہوئے ہولو یہاں آئی تھیں۔ اب یہ تھوڑی معلوم ہوتا ہے کہ ہولو یہاں آئی ہیں بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ نرہے گاؤں اونٹ آیا، لوگوں نے کہا پرمیشر آئے۔ چنانچہ میں اب ہولو کو پرمیشر ہی کہہ کر پکارتا ہوں۔ پرسوں رات کو اس کے لڑکی پیدا ہوئی۔ اتنے سن میں تین بچے۔ اللہ ہی تندرستی رکھے۔ میاں کی بی بی نے کہا ہم کس سے کم ہیں۔ چنانچہ رات ان کے دو لڑکیاں ہوئیں۔ اللھم زد فزد۔ بازار مصائرت میں کچھ ہم کو دہی دہی کرنا ہے۔ ارے میاں عابد، آپ کیا سمجھتے ہیں۔ دل میں بچھڑے ہوؤں کی یاد آفت ڈھا رہی ہے۔ یہ تو میں مختلف اعزا احباب اور عنایت فرماؤں کا سرسری نام لیتا چلا جاتا ہوں۔ اگر جی میں جو کچھ ہے وہ کہوں تو دفتر تیار ہوجائے۔ بوستان جہاں پُر بہار ہوجائے۔

سوائے عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب
گدائے کوچہ میخانہ نامراد نہیں

یہ نہ سمجھنا کہ کفران نعمت ہی میں مزہ ہے۔ اِن لٹے حالوں پر بھی دل پہچاننے والے دل رکھنے والے دو چار باقی ہیں۔ معلوم نہیں تم سے کجن، چھبن، الن وغیرہ سے ملاقات ہوتی ہے یا نہیں۔ ڈاکٹر منصور کی ڈاکٹری اب تو خدا کے فضل سے چل گئی ہوگی۔ بصیغہ راز مجھ کو لکھ بھیجو کہ الن کے گھر میں ڈاکٹر منصور کا علاج ہو رہا ہے یا نہیں۔ اگر نہیں ہوتا تو مجھ کو تا قیامت ڈاکٹر منصور سے ندامت رہے گی۔ ان کے بچوں کی بیماری میں جو ڈاکٹر منصور نے کیا وہ انھیں کر سکتے تھے۔ اصغر کو بھی میری دعا کہنا۔ لڑکیوں کو دیدہ بوسی۔ ڈاکٹر صاحب سے میری بہت بہت تسلیم اور دعائیں و اظہار تشکر!

دعا گو، محمد علی عفی عنہ

ردولی، ۱۸ رمئی ۱۹۵۱ء

(۵۲)

مولانا صلاح الدین احمد کے نام

مجھ کو میرے حق سے زیادہ دینے والے صلاح الدین احمد صاحب کو اس نادیدہ عقیدت مند کی تسلیم پہنچے۔

اکیڈمی کی رکنیت میں بخوشی قبول کرتا ہوں۔ آپ روپیہ روانہ کرنے کی ترکیب بتائیے۔ میں خود قدرۃً Pessimist واقع ہوا ہوں۔ مگر ہمت والوں کا ہمیشہ ہمیشہ دعا گو رہا ہوں۔ خدا آپ کی زبان میں اثر دے۔ آپ کے قلم میں جس دے۔ آپ کے ارادے کو تقویت بخشے۔ آمین رب العالمین۔

بڑے کاموں کی شروع چھوٹی رہتی ہے۔ انشاء اللہ توفیق خدا آپ کے ساتھ ہوگی۔ آج کی رائی کل کا پہاڑ ہوکر دکھائی دے گا ؎

خلقت کی طوالت بے حد ہے دنیا کا تو لمبا قصہ ہے
ہر شخص فقط یہ غور کرے اس کل میں میرا کیا حصہ ہے

اسعی منی و الاتمام من اللہ

اچھا جناب آپ کے محط کا جواب ختم ہوا۔ اب آپ سے باتیں کرنے کا دل چاہتا ہے۔ آپ کی مصروفیتیں تو ظاہر ہیں مگر میں مجبور ہوں۔ میرا دل یہی چاہتا ہے کہ آپ سے ہمکلامی تھوڑی دیر جاری رہے۔ زحمت تو ہوگی مگر برداشت کیجیے ع

برسر فرزند آدم ہرچہ آید بگذرد!

اگر اور نہیں تو کاغذ ہی ختم ہو جائے گا۔ گھبرائیے نہیں حضرت دن رات جی چاہا کرتا ہے کہ "ادبی دنیا" کو کوئی تحفہ بھیجوں۔ مگر بڑھاپا، افکار، کاہلی، اول جلول مزاج، کچھ کر نہیں پاتا۔ آدمی آدمی لکھی ہوئی دو چیزیں موجود ہیں۔ اللہ جانے پہلے وہ ختم ہوں گی کہ ہم۔ ایک

ڈراما بھی ادھورا پڑا ہے۔ مگر ڈراما چونکہ کبھی لکھا نہیں اس لیے اس میں ڈرامائیت کم معلوم ہوتی ہے۔ دونوں میں سے جو چیز ختم ہوگئی وہ ''ادبی دنیا'' پر نچھاور کرنے کو بھیجوں گا۔ مگر ختم کرنا بھی کارے دارد!

اکیڈمی کے کاغذ پر دستخط کر کے بھیجتا ہوں۔ سالانہ چندہ آپ کو عنقریب پہنچ جائے گا۔

بندہ محمد علی عفی عنہ

ردولی، ۲۳رمئی ۱۹۵۱ء

''...... سارے لڑکے اور لڑکیاں ان کو گھر لیتے اور اس وقت کوئی دیکھتا ان کی گل افشانیِ گفتار، لکھنوی اور قصباتی دونوں زبانوں پر عبور تھا، فارسی اور انگریزی میں بھی برق تھے۔ 'امامن مہری'، کے فلسفیانہ خیالات لکھ کر ساری عورتوں پر بیگماتی زبان کے ماہر ہونے کا سکہ انھوں نے بٹھا دیا تھا...''

(انیس قدوائی: اب جن کے دیکھنے کو...'' 56-55)

(۵۳)

عتیق بیٹی کے نام

پیاری عتیق! دعائے عمر و اقبال۔ جس طرح صوفیوں کے یہاں ایک زمانہ ہوتا ہے جس کو قبض کہتے ہیں۔ اس زمانہ میں ہزار عبادتیں کریں، عہد کریں، ریاضتیں کریں مگر انوارالٰہی نہیں ساطع ہوتے اور ایک زمانہ بست کا ہوتا ہے جس میں عبادتوں کا لطف آتا ہے اور انوارالٰہی کی بارش ہوتی ہے۔ اسی طرح میرے خط لکھنے کا بھی حال ہے۔ کبھی ہر وقت خطوط لکھنے کا تقاضا ہوا کرتا ہے اور سب کو لکھا کرتا ہوں۔ کبھی ایسا ہو جاتا ہے کہ تم لوگوں کو یاد کرتا ہوں مگر خط لکھنے کی نوبت نہیں آتی۔ غالب کہتے ہیں ؎

چاک مت کر جیب بے ایام گل
کچھ ادھر کا بھی اشارہ چاہیے

یعنی ایام قبض میں سب کوششیں بے کار۔ ہاں البتہ جب اللہ میاں اپنی رحمتوں کا دروازہ کھول دیتے ہیں پھر عبادتوں کا لطف ہے۔ آج نہ معلوم کتنے دنوں سے کسی کو خط نہیں لکھا تھا۔ اس وقت تمھارا خط پڑھ کر یکبارگی بست شروع ہوگیا۔

الحمدللہ رب العالمین۔ پہلا خط تم کو لکھ رہا ہوں۔ اب بجن، چھمن، اَلن، ہما وغیرہ سب کو خط لکھوں گا۔ تمھارے آخری خط کے جواب میں جو خط میں نے لکھا تھا اس میں تمھاری تفریح کے لیے بہت سے اشعار لکھ دیے تھے۔ اگر تم کو وہ خط نہیں پہنچا تو مجھ کو بڑا افسوس ہوگا کیونکہ وہ خط خود مجھ کو بڑا اچھا لگا تھا۔ اچھا خیر، تم کو لکھ چکا ہوں کہ جب آیۃ الکرسی پڑھتا ہوں تو تمھاری ماں کا نام جہاں آیا بس تم یاد پڑ جاتی ہو۔ اب ایک اور ذریعہ تمھاری یاد آنے کا پیدا ہوگیا ہے۔ میں ادھر ایک رسالہ لکھ رہا ہوں ''میرا مذہب'' اس میں حضرت ابوبکر صدیق کا ذکر بہت ہے۔ جہاں حضرت خلیفہ اول کا نام آیا بس تم یاد آگئیں۔ وہ رسول کے یار عتیق تھے۔ اور تم ہماری۔ تمھارا ہی دھک سے ہوگیا ہوگا کہ ارے نانا موا

شیعہ ہے۔ اس نے کچھ ان کی شان میں برا کہا ہوگا۔ یہ خیال تمھارا غلط ہے۔ میں حضرت ابوبکر صدیق کا قائل ہوں میں نے اس رسالے میں ان کی بڑی تعریفیں کی ہیں۔ اگر وہ چھپا تو تم کو بھیجوں گا۔ تھوڑا سا اقتباس لکھ بھی دوں تا کہ تم کو اطمینان ہو جائے۔

''جناب امیر علیہ السلام کو اس حیثیت سے کہ وہ رسولؐ کی گود کے پالے تھے، شاگرد سعید تھے، ان کے بارے میں رسول اللہ نے ایسی باتیں کہی ہیں کہ کسی کے لیے نہیں فرمائیں۔ انھیں سب سے افضل جانتا ہوں۔ مگر حضرت ابوبکر صدیق کے صفات کا بھی دل سے قائل ہوں جو درجہ محبت حضرت ابوبکر صدیق کو رسول صلعم سے حاصل تھا جو عقیدت کی یکسوئی حضرت خلیفہ اول کو ذات پاک محمدیؐ سے حاصل تھی اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ صلح حدیبیہ کے وقت ہر شخص پریشان تھا۔ حضرت عمر فاروق پوچھتے تھے کہ کیا آپ نبی برحق نہیں ہیں؟ رسول کی گود کے پالے حضرت علیؓ کی کیا مجال تھی کہ اختلاف کرتے مگر انھوں نے بھی عرض کر ہی دیا کہ رسول کا لفظ صلح نامہ سے میں اپنے ہاتھ سے نہ کاٹوں گا۔ صرف یہی یار عتیق تھے جو پوری طرح ساتھ رہے۔ اور بہ حیثیت ایک وفادار خادم کے یہی فرمایا کیے کہ میاں جو کچھ کہتے ہیں وہی سچ ہے۔ یہ جملہ کسی کتاب کا نہیں ہے بلکہ خود میرے دل کا گڑھا ہوا ہے۔ مگر مجھ کو اس میں کچھ وفاداری کی تصویر دکھائی دیتی ہے کہ بغیر کہے نہیں رہا گیا۔ ابھی ایک کتاب میں پڑھ رہا تھا کہ جب جنگ احد میں رسول اللہ کی شہادت کی غلط خبر مشہور ہوگئی تو حضرت عمر کے منہ سے بہ تقاضائے محبت یہ نکل گیا ''اب کیا کریں گے لڑ کر۔'' حضرت ابوبکرؓ نے کہا 'اب کیا کریں گے جی کر۔'

تم نے لکھا ہے! اختصار سے گریز کیجیے گا اس کو اب پڑھتے پڑھتے پریشان نہ ہو جانا۔

تم مال کے فقیر (57) کو جانتی ہو وہی جو بڑے خسیس مشہور ہیں۔ ان کے لڑکے کی نسبت ہوئی۔ اس تقریب میں سمدھیانے سے لڈو آئے تھے، وہ انھوں نے تقسیم کیے۔ چنانچہ اپنے عزیز تینوں بھائیوں کو بھیجا۔ ان لوگوں نے واپس کر دیا، اس پر بہت خفا ہوئے اور اسی غصہ میں ان کو خط لکھا۔ اس خط میں شاید نطفۂ حرام لکھ دیا۔ اب ان لوگوں نے ازالہ حیثیت عرفی کا نوٹس دیا ہے یہاں انھوں نے گھر سے نکلنا چھوڑ دیا ہے۔ نوٹس کیسے تعمیل ہو۔ لوگوں

نے ڈاکیئے کو گانٹھ لیا، اس نے دروازے پر جا کر پکارا کہ منی آرڈر آیا ہے۔

آواز سن کر نکل آئے۔ نوٹس تعمیل ہوگیا۔ محلے کے دس پانچ آدمی دروازے کے ادھر ادھر چھپے کھڑے تھے۔ انھوں نے گواہی دی کہ میاں نے نوٹس لینے سے انکار کیا۔ اب مقدمہ چلنے والا ہے۔

بہت کم پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ سنا ہے وہ کہتے ہیں کہ نطفۂ حرام کہنے میں کیا حرج ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ میں اپنے باپ کو ہمیشہ القاب میں لکھتا تھا ''جناب قبلہ گاہی صاحب نطفۂ حرام دام ظلہ''۔

اور ڈپٹی بدرالحسن صاحب اور خانکے[1] پورے کے لوگ سب اس مقدمے میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ دیکھیے کیا نتیجہ ہو۔ آج کل یہاں تین چیزوں کا بڑا زور ہے۔ آم، گرمیاں اور اندھوری۔ آم کا رنج نہ کرو۔ یہاں کی جہنمی گرمی اور اندھوریوں سے تو بچ گئیں۔ تمھاری ماں ہولو کو دیکھنے آئی تھیں، اچھی ہیں۔ تمھاری بیماری کی خبر خدا نے غلط ثابت کی۔ اس کا ہزار ہزار شکر ہے۔ خدا کرے تم ہمیشہ تندرست رہو اور بڑی عمر ہو اور زندگی کی تمام آرامیں تمھارے حصے میں آئین! اپنے میاں سے میری دعا کہنا۔

عتیق یہ تو بتاؤ جب تمھارے میاں دفتر چلے جاتے ہیں تو کیوں کر وقت کاٹتی ہو؟ دو چار جاننے والیاں قریب میں ہیں یا بالکل تنہائی ہے؟ یہ کلب کیسا ہے جس کا ذکر تم نے کیا ہے؟ تم پردہ کیے جاتی ہو یا چھوڑ دیا؟ پردہ بڑی غلط چیز ہے۔ قرآن شریف میں چہرے اور ہاتھ پاؤں کا پردہ کہیں نہیں ہے۔ نہ اللہ میاں کا منشاء ہے کہ اس کی آدھی مخلوق قید میں رہے۔

دعا گو

محمد علی عفی عنہ

۱۲؍جون ۱۹۵۱ء

تمھارا خط کل ملا۔

---

1. خان پورہ، ردولی ایک محلے کا نام۔

(۵۴)

ہما بیگم کے نام

میری جان! دعائے بے اثر حاضر ہے۔ کچھ آدمی کی طبیعت عجیب بنی ہے۔ اُسی خط کو پڑھ کر آرام بھی ملتا ہے جس خط سے چوٹ لگتی ہے۔ اگر چوٹ نہ لگے تو مٹھاس کا مزا بھی نہ آوے۔ انگریزی میں ایک دوا ہوتی ہے ''ڈلکمارا'' اس کے لفظی معنی ہیں میٹھا کڑوا۔ بس یہ سمجھ لو کہ دل کا لگاؤ ہی ڈلکمارا ہے۔ پوچھو تم وہاں بیٹھی ہوئی میں یہاں دن کاٹ رہا ہوں اور مٹھاس کڑواہٹ ملی جلی زندگی کی حلاوتیں، زندگی کی تلخیاں اپنا کام کر رہی ہیں۔ کسی چیز پر اختیار نہیں۔ کسی چیز پر بس نہیں۔ آدمی مجبور مگر بدقسمتیوں پر سوء اتفاقیوں پر، خلاف مزاج باتوں پر ایسا تعجب ہوتا ہے جیسے گیہوں بیچے تھے اور دام نہیں ملے۔ بقول کسی کے۔ بار الہا کہاں سے، بار الہا کہاں کو؟ کیوں، کس واسطے؟ یہ تکلیفیں کیوں؟ یہ آرامیں کیوں؟ یہ آراموں کی کھچڑی کیوں؟ عقل مفلوج ہے منطق خاموش ہے، تجربہ حافظہ کھو بیٹھا ہے، سمجھ مبہوت ہوگئی ہے ادھر پردۂ راز ہے، ادھر پردۂ راز ہے۔ معلوم نہیں کیسے آئے، معلوم نہیں کیسے جائیں گے۔ کہاں سے آئے کہاں کو جائیں گے۔ حیرت کا راز ہے گورکھ دھندوں کا بیوپار ہے، خواب میں خواب دیکھ رہے ہیں۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

گوتم بدھ کہتے ہیں خواہشوں کو چھوڑ دو۔ کیا سہل لٹکا بتا دیا ہے۔ انھوں نے کہا اور ہم نے کیا۔ بھلا اسباب و علل نے ہم کو اس قابل بھی رکھا ہے کہ ہم گوتم بدھ کی صلاح پر کاربند ہوں۔

تمھاری بوبو مرحومہ حضوری کا حلوہ بنا رہی تھیں۔ مرزا سلطان علی مرحوم کی بی بی مرحومہ بیٹھی منہ دھو رہی تھیں۔ مالن سہرے لے کر آئی۔ تمھاری بوبو نے کہا ''اے چچی ذری

غوطے دے کر سہرے تعزیوں پر چڑھا دیجیے۔" کہنے لگیں۔" دلہن جو اس جوگے ہوتے تو اپنے ہی گھر میں عزاداری نہ کیا کرتے۔ اسی طرح ہم بھی اگر اسی جوگے ہوتے تو افوض امری الی اللہ پر کاربند نہ ہوتے۔ میری بیٹی لاحول و لاقوۃ الا باللہ العلی العظیم کی مزاولت کر۔

ہر آنچہ آیدت از غیب نیک و بد منگر
ہمیں بس است کہ از کوئے دوست می آید

یہاں سب خیریت ہے۔
ہولو کی دوسری لڑکی کو پیچش ہوگئی ہے۔ قیصر ایسا کر رہی ہیں جیسے معلوم ہوتا ہے مطمئن ہوگئی ہیں۔

راقم
تمھارا باپ عفی عنہ
۲۲ر جون ۱۹۵۱

---

(۵۵)

مولانا حمایت الحسن صاحب (بنارس) کے نام

۴؍جولائی ۱۹۵۱

عزیزی مولانا سلمہ!

دعا وتسلیم۔ لیجیے صاحب آپ اس فنا کے چیتھڑے کی خیر و عافیت کے خواہاں ہیں تو سنئے۔ میں ابھی تک کاغذ بننے کے کارخانے نہیں پہنچا ہوں۔ خیر بنارس کا کمخواب، ٹانڈہ کی جامدانی تو کبھی نہیں تھا۔ تھا لیکن خوش وضع، سادہ، خوش مذاق عورتوں کے اوڑھنے کا معمولی دوپٹہ ضرور تھا، سو وہ بھی گیا۔ تار تار علیحدہ ہورہا ہے۔ قضا و قدر کے جولاہے نے صاف بنا تھا۔ مگر زمانے کے بدتمیز دھوبی نے جفتے پہلے ہی ڈال دیے تھے۔ اب تو رفو کی ضرورت ہوگئی ہے۔ پھر غضب تو یہ ہوا کہ جیٹھ کی کڑی دھوپ نے سکھا تو دیا مگر بادِ مخالف کولُو نے گرد آلود کردیا اور ساتھ کے جتنے کپڑے پھیلے تھے کسی کو پاکستان کے گھاٹ پہنچایا، کسی کو قبرستان کے گھاٹ پر بچھا دیا۔

چہ شد اطلس فلکی قبا کہ دریدہ ام ملکی روا
کہ دریں زیاں کدۂ فنا پئے یک دو گز کفن آمدی

میری بھانجی اور اس کی ذریات کو میری دعا کہیے۔ لکھنؤ آنے کی خبر گرم تھی۔ معلوم نہیں کہ کب تک انشاء اللہ تعالیٰ آیئے گا۔

دعا گو

محمد علی عفی عنہ

۵۶

ہما بیگم کے نام

میری جان! تمھارا خط کل شام کو ملا۔ دل چاہا اسی وقت جواب لکھوں مگر نہ لکھ سکا۔ آج صبح بھی نہ لکھ سکا۔ اس وقت پونے چار بجے ہیں۔ لکھنا شروع کیا ہے۔ **اللھم بلغ بالخیر**۔ یوں تو جس کا خط آجائے جی خوش ہوتا ہے کیونکہ آنے جانے والے رہ نہیں گئے۔ مگر دو چار خطوں کا انتظار رہتا ہے۔ تمھارے خط کا خصوصاً۔ اور اسی طرح عابد کے خط کا۔ اچھا سنو جو رسالہ میں نے ''میرا مذہب'' کے نام سے لکھا ہے اس کا حال یہ ہے کہ بیلا پھولا آدھی رات گجرا میں کن کے گلے ڈالوں، نہ تم یہاں نہ عابد یہاں۔ دو ایک قدر دان ملے تو وہ ایسے جیسے نیاز فتح پوری۔ انھوں نے کہا تھا کہ میں نگار میں چھاپوں گا۔ میں نے خیال کیا کہ اشاعت بھی ہو جائے گی اور صدیق شاہی سے بھی چھٹکارا ملے گا۔ مگر نیاز فتح پوری نے پڑھ کر مجھ کو لکھا ''آپ کا رسالہ اس قدر دلچسپ ہے کہ میں ایک ہی نشست میں اس کو ختم کرنے پر مجبور ہو گیا۔ مگر یہ نگار میں چھپنے کی چیز نہیں۔ میں اس کو خود الگ چھپواتا مگر اس وقت نگار کا روپیہ جس بینک میں تھا اس کا دیوالہ نکل گیا ہے۔ اس لیے چہ خورد بامداد فرزندم کا سوال ہے۔'' نیاز آدمی تو صاف ہیں لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عبارت کا لطف زیادہ لیتے ہوں اور کم پڑھے لکھے آدم کے مطالب دل پر نہ بیٹھتے ہوں۔ بہر حال اصل مسودہ تو میں لکھنؤ بھیج رہا ہوں انشاء اللہ تعالیٰ چھپنے کو۔ ایک اور نقل ہے اس میں مطالب تو تقریباً سب آگئے ہیں۔ مگر کچھ الٹ پلٹ گیا ہے۔ وہ تم کو بھیج رہا ہوں خدا کرے پہنچ جائے، جب پڑھ لینا تو عابد کو بھیج دینا۔

''کشکول محمد علی شاہ فقیر'' کے کچھ اجزا چھپ کر ملے ہیں۔ چھ جزو باقی ہیں۔ وعدہ تو کیا ہے دیکھیے خدا راس لائے کہ میں اپنی زندگی میں اس کو احباب کو بانٹ سکوں۔ ''گناہ کا خوف'' ڈاکٹر حسین ظہیر کے نیگ لگا۔ ایک رجسٹری شدہ خط بھیجا تھا جواب ندارد۔ قیصر، بدرل، تم سب کو دعا کہتے ہیں۔ ہولو، جابر، سعید تسلیم کہتے ہیں اور بیٹی کیا لکھوں، اگر لکھنے

بیٹھ جاؤں تو دفتر لکھوں مگر

کوئی آساں نہیں لہو رونا
دل میں طاقت جگر میں حال کہاں

خطوط کی نقل میاں کھدّن بڑی خوشی سے کر رہے ہیں۔ زیادہ نہیں ہیں۔ کوئی دس پندرہ ہوں گے۔

آفاق بہت بہت تسلیم کہتے ہیں۔

دعا گو

محمد علی عفی عنہ

ردولی، یکم اگست ۱۹۵۱

وجّو میاں(58) کے نام

مائی ڈیئر وجّو۔ دعا۔ یہ خط جیسا کہ ظاہر ہے اپنی غرض اور خالص غرض کی بنا پر لکھ رہا ہوں۔ اللہ میاں نے حکم دیا، دنیا کے تجربے نے تصدیق کی۔ سلمان نے توثیق کی اور تم نے اپنی مہر پسندیدگی لگائی کہ واقعی سوا اپنے پیدا کرنے والے کے دوسرے کا سہارا ڈھونڈھنا شرک خفی ہے۔ مگر یہ کفر آشنا دل پھر بھی دوسروں کی آس لگانے پر تلا رہا۔ ارے تم لوگ تو تم لوگ...... اور...... تک سے اس بت پرست دل نے عقیدہ جوڑا۔ لاحول و لاقوۃ الا باللہ العلی العظیم۔ جیسے کان میں کوئی کہتا ہے کہ اگر مادّہ ہی پوجنا تیرے ماتھے پر لکھا تھا تو حکم سنگھ سے ناتا جوڑنا تھا جو شاہ آل محمد ڈپٹی کلکٹر رام سہنی گھاٹ کے ذریعے سے کبھی نہ کبھی تو یاد کر لیتے۔

اچھا سنو تمھارے وعدے پر تکیہ کر کے قیصر تن تنہا ہوائی جہاز کے ذریعے سے جدّے آ رہی ہیں۔ پاسپورٹ بن گیا ہے۔ ٹیکہ لے رہی ہیں، ہوائی کمپنیوں کو لکھا ہے۔ اگر خدا کو منظور ہے تو وہ انشاء اللہ العزیز حج کے لیے روانہ ہو جائیں گی۔ تاریخ روانگی سے انشاء اللہ تعالیٰ بذریعہ Cable یا خط بعد کو مطلع کروں گا۔ اگر فرائض منصبی سے فرصت ہو تو اس خط کی رسید اور جو ہدایتیں دینا چاہو ان سے مطلع کرو۔ گو کمپنیوں کے خطوط ابھی نہیں آئے ہیں۔ مگر پھر بھی خدا کی ذات سے امید ہے کہ شاید انشاء اللہ تعالیٰ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مدینہ منورہ بھیجنے کا اہتمام اور مکہ معظمہ، عرفات، منیٰ کا اہتمام تم کو کرنا ہے اور واپس بھیجنے کی بھی زحمت تم ہی کو کرنا ہے۔ زبیدہ کو دعا۔ دوران حج اگر کوئی پرسانِ حال ملیں تو ان سے بھی سلام مسنون کہنا۔

دعا گو، محمد علی عفی عنہ

۲/اگست ۱۹۵۱

۵۸

خورشید صاحب کے نام

بھائی خورشید۔ زادشفا قلم۔ سلام شوق۔ آپ کا محبت نامہ آیا تھا اور جہاں تک یاد پڑتا ہے میں نے جواب بھی لکھا تھا مگر قسم نہیں کھاؤں گا ممکن ہے لکھنے کا ارادہ ہی کرتے کرتے رہ گیا ہوں۔ بہرحال اگر وہ خط میں نے نہ بھی لکھا ہو تو آپ از ڈاک خانہ دور رہے ہوں مگر از دل دور کبھی نہیں رہے۔ اس دوسرے خط کا بھی شکریہ قبول فرمایئے۔ میں زندہ ہوں۔ چلا جاؤں تو افسوس کر لیجیے گا مگر تعجب کی گنجائش نہ ہوگی۔ ادھر کچھ بڑھاپے کی وجہ سے شکایتیں بڑھ گئی ہیں۔ اس کے بعد انفلوئنزا کی ایک ٹھوکر لگی مگر باوجود ان باتوں کے ابھی تک زندہ ہوں اور بے لوث احباب کے لیے دعا میں مشغول ہوں۔ بچوں کی مفارقت کا پرانا قصہ ہے۔ ادھر مولانا عابد بھی پاکستان کے ہوگئے۔ جب سے داغ مفارقت سب کے سب چمک اٹھے۔ میری ایک کتاب ''کشکول محمد علی شاہ فقیر'' دو برس سے ایک ظالم مطبع والے کے ہاں پڑی ہے۔ دوسرا رسالہ ''میرا مذہب'' تیار ہے۔ چاہتا تھا ان دونوں کو چھپا ہوا دیکھ لیتا تو جی خوش ہوجاتا۔ صوری اولاد کو نہیں دیکھ سکتا ہوں۔ معنوی ہی اولاد کو کھیلتے دیکھ لیتا تو جی خوش ہوجاتا۔ آج کل ''صحیفۂ کاملہ'' اکثر دیکھتا ہوں۔ اردو کا ترجمہ تو کچھ نہیں مگر فارسی کے ترجمے میں کچھ جھلک اصل کتاب کی آجاتی ہے۔ جتنی دیر پڑھو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی پیٹھ پر ہاتھ رکھے تسکین دے رہا ہے۔ ''صحیفۂ علویہ'' بھی نظامی پریس نے چھاپا ہے۔ اگر یہ کتابیں اپنے پاس نہ ہوں تو منگا لیجیے۔ مذہب میں چھری کٹاری تو بہت دیکھی ہوں گی، مذہب کا مرہم، مذہب کی فرحت، مذہب کی ٹھنڈک، مذہب کی خوشگواری جیسے صبح کی ٹھنڈی ہوا، ذری ان کی بھی سیر کیجیے۔

محمد علی عفی عنہ

۴راگست ۱۹۵۱

(۵۹)

ہما بیگم کے نام

ردولی ۴؍اگست 1951

ہما پیاری، دعائیں! کل ایک پلندہ تم کو بھیجا ہے وہ دو جگہ کے سنسر کے دستبرد سے بچ گیا تو دیکھنا نہیں تو مجبوری ہے۔ ''گناہ کا خوف'' آنکھوں میں لگانے کو نہیں ہے۔ ڈاکٹر حسین ظہیر جنھوں نے چھاپا تھا خط کا جواب بھی نہیں دیتے ''میرا مذہب'' دیکھنے کے بعد عابد کو بھیج دینا۔ اس کے بعد والے مسودے میں کچھ ترمیمیں ہوئی ہیں۔ مگر فی الجملہ کتاب کا منشا وہی ہے۔

قیصر حج کے لیے تیار ہیں۔ تنہا جارہی ہیں۔ اللہ میاں پر بھروسہ ہے اور میاں وجو پر بھروسہ ہے۔ معلوم نہیں کس پر بھروسہ زیادہ ہے۔ بڑھاپا آہستہ آہستہ قبضہ کر رہا ہے۔ جیسے دشمن کی فوج رفتہ رفتہ بڑھ رہی ہو اور اصل فوج کے علاوہ گریلا فوج ملک میں ابتری جگہ جگہ پہلے سے پھیلاتی جاتی ہو، بس یہ سمجھ لو کہ گڈھ ٹوٹا لشکر ہار چکا۔ اب بھاگنے میں مت دیر کرو۔

جب تم کو خط لکھتا ہوں تو دل میں نرمی سختی دونوں ساتھ ساتھ محسوس کرتا ہوں۔ جیسے کوئی کریلے کھائے۔ جس میں خوشبو اور کڑواہٹ دونوں کا مزا ساتھ ہی ساتھ ملتا جائے۔ کارڈ پر اتنی جگہ باقی ہے، گرمی، مریض، زکام، کوئی مضمون نہیں سوجھتا اور باتیں کرنے سے جی نہیں بھرا، بجے سے ملاقات ہو تو میری دعا کہنا۔ دنیا میں بجے[59] کے ایسے آدمی ہوں اور صحیفہ کاملہ ایسی دعا ہو، کتابیں ہوں، گلابی جاڑوں کا ایسا موسم اور ساون کا جھولا ہمیشہ پڑا رہے تو دنیا جنت کی آرزو میں کاہے کو مرا کرے۔

محمد علی عفی عنہ

---

(۶۰)

ڈاکٹر حسین ظہیر کے نام

مائی ڈیئر ڈاکٹر!

سلام شوق۔ بہت دن ہوئے یونیورسٹی کے پتے سے ایک خط بھیجا تھا۔ چونکہ پتا مکمل نہ تھا معلوم نہیں پہنچا تھا یا نہیں۔ اب پھر لکھتا ہوں ''گناہ کا خوف'' اکثر احباب مانگتے ہیں۔ میرے پاس صرف ایک جلد باقی ہے۔ معلوم نہیں وہ کتابیں جو آپ کے ساتھ گئی تھیں ردّی کی ٹوکری میں پہنچ گئیں، کیڑے کھا گئے یا ابھی کچھ باقی ہیں۔ اگر کچھ ہوں تو بھیج دیجیے مشکور ہوں گا۔ جب سے آپ گئے ملاقات کا کیا ذکر، مہینوں حال نہیں معلوم ہوتا۔ لکھنؤ میں کبھی عالیہ یا عبدالحسن صاحب سے ملاقات ہوگئی تو خیریت معلوم ہوجاتی ہے۔ زمانہ اور اسباب زمانہ اتنے دوسرے ہوگئے ہیں کہ نہ معلوم کتنے ہیں کہ جن سے مل کر جی خوش ہوتا تھا اور اب برسوں خبر بھی نہیں ہوتی۔ خود ہمارے ساتھی تو قریب قریب ختم ہو چکے۔ بھلے کو ہم نے اپنے سے کم سن لوگوں سے رسم بڑھا لی تھی۔ گویا سینگ کٹا کے بچھڑوں میں داخل ہوگئے تھے۔ مگر خدا کا کرنا ایسا ہے کہ ان سے بھی واسطہ نہ رہا۔ اب دو ایک بڈھے رہ گئے ہیں ان سے کبھی ملاقات ہوجاتی ہے تو آپس میں ایسی باتیں ہوتی ہیں جیسے ہم لوگ اعراف میں بیٹھے ہیں۔ تازہ ترین اسکینڈل جو ہم لوگوں میں دل کے بہلاؤ کے لیے بیان ہوتا ہے ان لوگوں کی نانیوں، دادیوں کے متعلق ہوتا ہے جو خود گورنمنٹ کے پنشن خور ہیں۔ ایک ایک پرانا قصہ بیس بیس بار بیان ہوتا ہے۔ سنتے سنتے جگہیں مقرر ہوگئی ہیں کہ کس مقام پر ہنسنا چاہیے اور کس پر افسوس کرنا چاہیے...... اور کس مقام پر تعجب کرنا چاہیے۔ نیا سے نیا مصنف جو اب ہم پڑھتے ہیں ''ایڈیسن'' اور ''اسٹیل'' ہیں۔ نیا سے نیا مسئلہ جو ہم سوچتے ہیں ڈارون کا ''خلاقۃ الادفق'' ہے۔ قصہ مختصر زندہ ام مگر مردہ، مردہ ام مگر زندہ۔ سیدہ کو دعا۔ ہم کو اس وقت سیدہ کا جو چہرہ یاد آیا وہ وہی چہرہ ہے جس پر بے شکن جوانی کھیل رہی ہے۔ تمھارا چہرہ بھی وہی صاف امنگ کا بھرا یاد ہے۔ اب نہ معلوم

کتنی شکنیں تجربے کی پڑ گئیں۔ ہماری لڑکیاں کجن، الن، ہما سنا ہے بڑھیا ہوگئیں۔ (عالیہ [60] میں ماشاء اللہ ابھی خفیف جوانی کی جھلک دکھائی دیتی ہے) سنا ہے سلمان کے ماتھے کے بال اڑ گئے۔ گالوں پر بڑھاپے کا گوشت ابھر آیا ہے۔ جب یہ حال ہو تو ہمارے چہرے کا کیا پوچھنا کوشش کرتے ہیں کہ خط بنانے میں بھی اپنے چہرے پر نظر نہ پڑے اور اگر پڑ جاتی ہے تو جی چاہتا ہے ایک تھپڑ ماریں۔ معلوم ہوتا ہے کہ شیخ حبیب اللہ مرحوم کے والد شیخ عنایت اللہ مرحوم بیٹھے ہیں۔ جب ہماری شادی ہوئی تھی تو اعزہ میں دو ایک جوان لڑکیوں کی مائیں جن کو حسد ہوتا تھا ان میں سے ایک تھیں جو ہماری بی بی مرحومہ سے جلن نکالنے کے لیے کہتی تھیں کہ ''ارے دولھا کی چاند ایسی صورت دیکھ کر شیعہ ہو جائے گی'' آج یہ قصہ جس سے بیان کریں وہ کہے یہ بڈھا بہت جھوٹ بولتا ہے۔

علی ظہیر لکھنؤ میں منسٹر ہیں۔ مگر ان کی منسٹری کا لطف ہمارے لیے آدھا رہ گیا۔ حبیب اللہ مرحوم ہو گئے۔ وسیم غریب نہ رہ گیا۔ خلیق [61] چلے گئے۔ زمانہ بدل چکا۔ صرف شیعہ کانفرنس وہی رہی اور عماموں کا وہی زور ہے۔ خود ہماری Agnosticism ہربرٹ اسپنسر والی باقی ہے۔ مگر موت کے قریب ہونے کی وجہ سے صرف اشاروں کنایوں میں کبھی کبھی دکھائی دے جاتی ہے ورنہ عموماً پانچوں وقتوں کی نماز کی آڑ میں چھپی بیٹھی رہتی ہے۔ تمھارے پاس ڈاکٹر اتنا وقت کہاں ہوگا کہ فضول اتنی بکواس کرو۔ لیکن اگر اس کے جواب میں سیدہ اور بچوں کا حال لکھ بھیجتے تو تھوڑی دیر کے لیے جی خوش ہو جاتا۔

ہماری سمدھن صاحبہ بیگم علی رضا جن کو ہم ''دلاری انٹیا'' کہا کرتے تھے سنا ہے غریب بہت بیمار ہیں۔ علی رضا مرحوم انتقال کر گئے۔ اب غریب دلاری ہیں نہ انٹیا خط ختم کرنے کو دل نہیں چاہتا مگر مجبوراً ختم ہی کرنا پڑے گا۔

میری بیوی، سیدہ اور بچوں کو اور تم کو دعا کہتی ہیں۔

دعا گو

محمد علی عفی عنہ، ردولی

۱۸/اگست ۱۹۵۱

(۶۱)

سعید مصطفیٰ کے نام

سعید پیارے بیٹے۔ دعا! تمھارا خط آیا۔ دل خوش ہوا۔ اسی طرح جی لگا کر پڑھے جاؤ اور کھیلے جاؤ۔ اپنے دوستوں کو ہماری دعا کہو اگر ہم اچھے ہوتے تو الہ آباد آ کر تمھارے دوستوں سے ملاقات کرتے۔ بیٹا تم نے دو روپے مانگ بھیجے ہیں ہم کو بھیجنے میں کوئی عذر نہیں مگر جیسے Matron نے تمھارے روپے پہلے لے لیے تھے اسی طرح یہ بھی لے لیں گی اور چھپا کر بھیجنا بری بات ہے۔ جس کو نہ تم پسند کرو گے نہ ہم۔ گھبراؤ نہیں ہم تمھارے پرنسپل کو لکھیں گے کہ تمھاری پاکٹ منی اگر مناسب سمجھیں تو زیادہ کر دیں۔

دعا گو

تمھارا میاں جان

۲۰ر اگست ۱۹۵۱

(غیر مطبوعہ)

"...... ردولوی تو بس نام کے تھے ورنہ بول چال، چال ڈھال، ٹھاٹھ باٹھ کے آئینہ میں عین مین لکھنوی! وہی آن وہی شان، وہی لوچ وہی چھل بل لکھنے ہی میں نہیں بولنے میں بھی اور علم مجلس کے تو جیسے بادشاہ تھے۔ بوڑھوں میں بیٹھتے تو سنجیدہ و حکیم، جوانوں میں آ نکلے تو سرمست و ظریف۔ بچوں میں گھر گئے تو کھلنڈرے! ادیب ہوں کہ طبیب، شاعر کہ اہل حرفہ، مولوی ہوں کہ مشائخ جس کسی کی بھی مجلس میں گزر ہو جائے میر مجلسی ان کے لیے رکھی تھی..."

(۶۲)

سعید مصطفیٰ کے نام

نورچشم من، دعا! تمھارا سچے دل سے لکھا ہوا کارڈ آیا۔

فیض خدا کہ بر دل آگاہ می رسد
اے دل بہ ہوش باش کہ ناگاہ می رسد
جائے کہ زاہداں بہ ہزار اربعیں رسند
مست شراب عشق بہ یک آہ می رسد

خدا اس کو مشرف بہ حج و زیارت کر کے بخیریت واپس لائے آمین ثم آمین۔

یہ سب کچھ تو ٹھیک ہے مگر یہ میرا ''پرتو معرفت'' دیکھ دیکھ کر آخر تم کیا کرنے والے ہو اور مجھ کو اس کا یقین ہو گیا تو میں کیا کرنے والا ہوں۔ جانور فربہ شود از خورد و نوش۔

آدمی فربہ شود از راہ گوش۔ تم تو خوش ہو ہو کر کہا کرو گے کہ چچا بڑے عمدہ آدمی ہیں اور چچا غریب تحت الثریٰ کو پہنچ جائیں گے۔ تمھارے گھر آنے سے مجھ کو ویسی ہی خوشی ہوگی جیسے ہمیشہ ہوتی ہے لیکن بلاوجہ پیسہ میری خاطر میں نہ پھینکو۔ حکیم رشید اسی گاڑی سے جانے والے تھے جس سے بیگم گئی ہیں بلکہ انھیں کے ذریعہ سے حبیبہ وغیرہ سے کہلا بھیجا تھا کہ فلاں گاڑی سے دادی جائیں گی۔ بدخبر لکھنے سے دل نہیں خوش ہوتا۔ مگر کاغذ کا پیٹ بھرنا ہے، کل میاں اویس[62] سرکاری مطالبے میں پکڑے گئے مطالبہ ہزار روپے سے اوپر کا سنا جاتا ہے۔

کچھ اوپر ہزار روپے کی ضمانت درکار ہے گو میں اپنا فرض نہیں سمجھتا نہ میرے امکان میں ہے۔ مگر اس واقعہ سے ایک گونہ بے چینی سی ہے۔ یہ تو صرف ایک مطالبہ ہے۔ سنا جاتا ہے کہ ایسے ایسے کئی مطالبے ہیں بقول ملک نظام الدین کے۔ پیے بیٹھے ہیں دریا کہیں آروغ لیتے ہیں۔

چھمّن کا خط کوئی ہفتہ بھر ہوا آیا تھا۔ سبط ابھی تک اسپتال میں ہیں مگر لکھا تھا کہ پہلے سے بہتر ہیں۔ اللہ میاں سے ہر شخص گڑگڑا کر دعائیں مانگتا ہے کہ وہ اپنے ہر منفرد بندے کی خاطر سے اپنی مشیت بدل دے۔ اگر اللہ میاں یہی کرنے پر آجائیں تو دنیا کا انتظام کانگریس کی حکومت اور بھارت ماتا کی حکومت سے بھی زیادہ گڑبڑ ہوجائے۔ لہٰذا دعا صرف یہ مانگنا چاہیے کہ بارالٰہی ہم کو راضی بہ رضا رہنے کی توفیق عطا کر۔ مالک میرے، تیری حکمت سب سے بہتر ہے۔

اویس اس وقت واپس آگئے۔

۲۷/اگست ۱۹۵۱

دعاگو

تمھارا میاں جان

---

(۶۳)

نجّے کے نام

یار نجّے خدا تمھاری ہیرے کی ایسی شفاف روح، سونے کا ایسا دہکتا دل، موتی کے ایسے آبدار دانت، چاند ایسا چمکتا چہرہ بہت دن سلامت رکھے۔ تم بڑے اچھے آدمی ہو۔ جس سے تم سے ملاقات ہو جاتی ہے وہ تعریفیں ہی کرتا ہے۔ چنانچہ ہما بھی انھی لوگوں میں ہیں جو تمھارا دم بھرتی ہیں۔ اگر میں نیک آدمی ہوتا تو سچ کہوں مجھے تمھارے اوپر رشک آنے لگتا۔ مگر میں جیسا آدمی ہوں تم جانتے ہو اس لیے میرے تمھارے درمیان میں مقابلے کا ڈر بالکل نہیں۔ تمھارا خط آیا۔ خلوص و محبت کی جھلک اس میں ایسی تھی کہ جیسے دل کی کلی کھل گئی۔ بحمد للہ اب اچھا ہوں اور یوں تو شکایت کرنے کی بہت گنجائش ہے۔ اچھا خاصا کھانا کھاتا ہوں، ہنستا ہوں، بولتا ہوں لوگوں سے باتیں کرتا ہوں سو رہتا ہوں ہزاروں کا محسود ہوں کم کا حاسد مگر خدا کے احسانات کو بھلا کر کہو تو زمانہ کی شکایت فلک ناہنجار کی ناسازگاری وطن میں بے وطنی پر دفتر کے دفتر لکھ جاؤں۔ آدمی بھی عجب معجون مفرح بلکہ معجون غیر مفرح اللہ میاں نے بنایا ہے کہ ہر وقت شکایت ہی کا پہلو پیش کیا کرتا ہے۔ شکر کے موقعے ایسے نظرانداز کر جاتا ہے جیسے اس نے اللہ میاں کے ہاتھوں گیہوں بیچے تھے اور اللہ میاں اس کے دام دبا بیٹھے تھے۔ لاحول و لاقوة الا باللہ العلی العظیم۔ مثلاً دو چار شکوہ و شکایات کی باتیں لکھتا ہوں۔ غور سے پڑھنا۔

۱۔ بڑھاپا آ گیا	بڑھاپا کس کو نہیں آتا
2۔ بال بچوں سے دور جا پڑا	ہوش کے ناخن لو، نہ معلوم کتنے ہوں گے جن کے بال بچے ہیں ہی نہیں ان سے تو اچھے ہو۔
3۔ لکھنؤ جاؤ تو معلوم ہوتا ہے	کیوں جھوٹ بولتے ہو اب بھی دو چار

کوئی جاننے والا رہ ہی نہیں گیا	احباب دوست مخلص تو مل ہی جاتے ہیں اگر نہ ملتے تو ہم بار بار لکھنؤ کیوں جاتے۔ جب لکھنؤ جانا بند کردو تو ہم جانیں کہ تم سچ کہتے ہو چودھری مجتبیٰ حسن ہیں۔ محبوب عالم ہیں۔ چودھری نعمت اللہ ہیں۔ صدرالاسلام ہیں اور نہ معلوم کتنے نکلیں گے۔
4۔ سلمان بہت یاد آتے ہیں	کیوں سڑا منہ سوندھا کرتے ہو، تین برس سے انھوں نے تمھاری بات نہیں پوچھی۔ اتنے زمانے میں صرف ایک خط لکھا تھا وہ بھی اس لیے کہ بڑھاپے میں اپنا مزاج داں نوکر ان کی ساس کی خدمت کرنے کو حیدرآباد بھیج دو۔ اور آپ ہیں کہ ان کی یاد کے برہے گا رہے ہیں۔ کہیں منہ لگاتے تو آپ نہ معلوم کیا کرتے۔
5۔ ادھر بڑھاپے کی وہ بیماریاں ہوگئیں جو جاتی نہیں	لکھنؤ کے مشہور سرجن ماتھر ابھی ابھی بتا چکے ہیں کہ ستر برس کے سن میں ایسے خوش قسمت کم دکھائی دیتے ہیں اور تم ہائے کے نالے (نعرے) مار رہے ہو۔ آخر کیا قیامت کی بوریہ بٹورنے کا ارادہ ہے۔
6۔ ردولی میں عیب جو زیادہ رہ گئے ہنر دیکھنے والے چلے گئے۔	خود اپنی افتادِ طبیعت دیکھو گریبان میں منہ ڈالو۔ ہر شخص سے تو لڑائی کر لیتے

ہو اور پھر الٹے شکایتیں کرتے ہو......
سے لڑ گئے............ سے...... بگاڑ
کرلیا... سے بول چال بند (خیر یہ تو
اچھا کیا) اور پھر چاہنے والوں سے
خراج ہمدردی کے طلب گار ہو اور پھر
ہمدردوں کا ذکر نہیں کرتے بدرل ہیں،
آفاق ہیں، حسن عباس ہیں، فیض آباد
میں صفت حسین اور کیا چاہتے تھے کوئی
چاہنے والوں کی فوج بھرتی کرنے کا
ارادہ تھا۔ ضیغم کو بھول ہی گئے۔

7۔ علاقہ جارہا ہے

معلوم نہیں کہ علاقہ پہلے جائے کہ تم
پہلے جاؤ۔ پھر اس کا رونا کیا روتے ہو۔
حافظ رحمت اللہ علیہ نے تو کہہ ہی دیا
ہے کہ علاقہ جائے گا ضرور مگر تمھارا کچھ
نہ بگڑے گا۔ علاقے کی فال یاد کرو نکلی
تھی

آں جامہ کہ بود درو بوئے یوسفم
ترسم برادران غیورش قبا کنند

اور تمھارے لیے حافظ جی نے فرمایا تھا ۔

بیخبر اند زاہداں نقش بخواں و لاتقل
مست ریاست محتسب بادہ بنوش و لاتخف

بیٹھے رہو جیسی پڑے گی کٹ جائے گی۔

8۔ آج کل قیصر حج کو گئی ہیں
اِس سے تنہائی تکلیف دہ ہے

اللہ کا شکر بھیجو کہ یہ دن نصیب ہوا۔ خدا
چاہے گا تو انشاء اللہ تعالیٰ حج اور

زیارت سے مشرف ہو کر آجائے گی۔
اللہ اس کی آرزو پوری کرے۔آمین!
آج 28/تاریخ صبح کا وقت ہے۔ وہ
اس وقت انشاء اللہ تعالیٰ جدّے میں
بیٹھی ہوگی۔ تنہا ضرور گئی ہے مگر اللہ کا
بھروسہ اور وجّو کا سہارا ہے۔ ذری اس
کی ہمت تو دیکھو تم کو تو بجائے اظہار
مفارقت کے خدا کا شکر بھیجنا چاہیے اور
پھر یہ بھی تو سوچو اچھا ہے دل کے پاس
رہے پاسبان عقل لیکن کبھی کبھی اسے تنہا
بھی چھوڑ دے اچھا اب مریض بہت
بیٹھے ہیں اور آج لکھنؤ جانے کا بھی
ارادہ ہے

جب جا کے برآمدے میں سونا ہوگا
تکیہ یک ہوگا یک بچھونا ہوگا
تنہائی میں آہ کون ہووے گا انیس
ہم ہوویں گے اور باغ کا کونہ ہوگا

اس لیے ختم کرتا ہوں۔ خدا تم کو اور تمھارے والوں کو خوش و خرم رکھے۔ آمین۔

دعا گو

محمد علی عفی عنہ، ۲۸/اگست ۱۹۵۱

---

(٦٤)

ہما بیگم کے نام

۶ ر ستمبر ۱۹۵۱

میری جان دعا! رات لکھنؤ سے واپس آیا۔ اسی وقت تمھارا دوسرا خط ملا۔ آج ۶ ر ستمبر ہے۔ کل کا خط آج پھر لکھتا ہوں۔ کل تک لکھوں گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ کل نہیں تو پرسوں ڈاک میں جائے گا۔ تمھارے خط کے آنے سے عجیب خوشی نصیب ہوتی ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ جواب ایسا لکھوں کہ تمھارا بھی جی خوش ہو۔ اس کے لیے آورد کی کوشش نہیں کرتا بلکہ جب دل پریشان ہوتا ہے تو مضمون کی چول خوب نہیں بیٹھتی۔

کاغذ ابھی باقی ہے، باتیں کرنے سے جی نہیں بھرتا، کون باتیں کریں کہ رین کٹے، جب محبت کا پاؤں درمیان میں ہوتا ہے تو کوئی نہ کوئی بات نکل ہی آتی ہے۔ دیکھو دوا بانٹ لیں تو پھر لکھیں۔ ہاں تو ہما بیگم میں کیا کہہ رہا تھا وہی محبت کی بات، تم لوگ تو سب دور دور جا پڑے مگر اب دو چار خدا کے بندے ہیں جو جی سے بات پوچھ لیتے ہیں۔ اس زمانہ میں محبوب عالم مل گئے ہیں۔ دوسرے کے کام آکر خوش ہوتا ہے اور احسان نہیں رکھتا، بڈھے عیاش کے سب صفات رکھتا ہے۔ یعنی سخاوت، ہمدردی، پیسہ خرچ کرنے میں کل کا خیال نہ کرنا، بدلے کی آس نہ لگانا، سب باتیں ہیں۔ ہماری ان کی پرگت ملی ہوئی ہے۔

آج کل یہاں قحط کی صورت بندھ گئی تھی۔ مگر پانی برس گیا۔ خدا نے خیر کی۔ ردولی میں ایک پیدائشی سڑی رہتے ہیں۔ ان کا نام ہے...... تم کاہے کو جانتی ہوگی۔ پکڑیا تلے ہماری دادی کے ایک خالہ زاد بھائی (شاید) تھے سید...... ان کے دو بیٹے تھے...... اور...... ان میں سے چھوٹی کی شادی ہوئی تھی۔ بی...... مرحومہ کی گونگی بیٹی کے ساتھ، صوفیانے[1] میں تم نے ان کو دیکھا ہوگا۔ ان کی ایک بہن بھی تھیں...... ان کی شادی ہوئی بھائی...... مرحوم کے ایک عزیز کے ساتھ سلطانپور میں۔ ان سے میاں...... اور...... بھائی بہن پیدا

1. ردولی کا ایک محلہ

ہوئیں...... ایک بڑے بوڑھے کو بیاہی گئیں۔ ان کے بعد وہ ...... ہمارے ضلع دار کے ساتھ چلی گئیں۔ آج کل وہ آئی ہیں اور میاں...... اور ...... کے فساد ہو رہے ہیں۔ کاغذ کا پیٹ بھرنا تھا اور کچھ نہیں خون سیاوش کے اوپر پورا شاہ نامہ تیار ہوگیا۔ یہاں ایک چوری کی بائیسکل پر نئی مہابھارت شروع ہونے والی ہے...... اپنے زمانہ میں بڑی خوبصورت تھیں۔ اب دیکھا تو ؎

گیا حسن خوبانِ دل خواہ کا
ہمیشہ رہے نام اللہ کا

دعا گو

تمھارا باپ عفی عنہ

۶۵

حسن عباس کے نام

عزیزی حسن عباس سلمہ! دعا۔ طاہرہ کی زبانی سنا گیا ہے کہ تم بالکل چپ ہو گئے ہو۔ یقیناً زندگی سے بیزار ہو گئے۔ تمھاری طبیعت مہینوں سے اعتدال سے ہٹی ہوئی تھی۔ بنے مرحوم کے جانے کی وجہ سے تم اپنی طرف سے اور بے پروا ہو گئے ہو گے۔ حالانکہ ہم لوگوں کی نظر میں تمھارے زندہ رہنے کی ضرورت اور بڑھ گئی ہے۔ غم فطرتی چیز ہے جو دوسروں کا درد خدا کے یہاں سے زیادہ لایا ہے اور خودغرضی کم لایا ہے جیسے تم، اس کا حصہ غم میں اور زیادہ ہوتا ہے۔ مگر نہ خدا کا حکم ہے نہ عقل کا نہ فطرت کا کہ غم کو پالا پوسا جائے۔ لہٰذا بیٹا اپنے کو سنبھالو، اگر رخصت لے کر یہاں چلے آتے تو شاید اچھا ہی ہوتا۔ میں یہ سب کچھ اپنی خودغرضی سے لکھ رہا ہوں۔ تم جانتے ہو کہ میں تم کو اپنے معدودے چند چاہنے والوں میں شمار کرتا ہوں۔ اس لیے بھی چاہتا ہوں کہ جتنے دن میں خود زندہ ہوں میرے چاہنے والے بھی زندہ رہیں اور اس حالت میں رہیں کہ میرے مرتے وقت میرے کام آسکیں۔

میری دلی خواہش ہے کہ تم چلے آؤ، اس جگہ تمھاری بات تو پوچھنے والا کون ہوگا یہاں پر بھی دو چار ہیں۔ جو تمھارے الم میں شریک ہو کر اس کو کم کریں گے۔ قیصر دعا کہتی ہیں۔ جابر سعید سلام عرض کرتے ہیں۔

دعا گو، محمد علی عفی عنہ

ردولی ۱۸ر ستمبر ۱۹۵۱

(غیر مطبوعہ)

---

(۶۶)

ہما بیگم کے نام

ردولی ۲۱ر ستمبر ۱۹۵۱

میری جان دعا۔ اپنا حال لکھنے کو دل نہیں چاہتا۔ تمھارا حال جاننے کو دل بے چین ہے۔ قیصر بیگم کا تار بلکہ وجو کا تار جدّے سے آیا ہے کہ چچی ۲۴ کو بمبئی پہنچ رہی ہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ تم اپنا حال کہو۔ میں نے کہا تھا کہ اپنا حال لکھنے کو دل نہیں چاہتا۔ اب صرف اپنا ہی حال دماغ میں آرہا ہے۔ اللہ بچائے اس انانیت سے۔

سنو! آج کل نماز بڑے خشوع وخضوع سے پڑھ رہے تھے۔ سجدۂ شکر کے ساتھ بڑے جی سے دعائیں مانگتے تھے۔ دعائیں مادّی استفادے کی تو مانگتے ہی تھے، نفسیاتی پہلو کی زیادہ مانگتے تھے۔ مثلاً بار الہا غرور کم کر، حسد کم کر، بار الہا اپنی مرضی پر راضی رکھ۔ مالک میرے رحم فرما، میرا استحقاق کچھ نہیں، مگر رحیم کریم تو ہے۔ اس میں اچھا خاصا طول ہوتا تھا۔ جس کو میں نفس کو توڑنے کی علامت سمجھتا تھا۔ ایک دن میں نماز پڑھ رہا تھا کہ آفاق آگئے۔ سلام پھیر کر ان سے باتیں کرنے لگا اور پھر عصر کی نماز کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ دورانِ نماز میں خیال ہوا کہ دعا مانگنا بھول گیا۔ ایک عجیب تعجب خیز خیال دل میں آیا۔ یعنی دل نے کہا اچھا ہوا اس کھِس کھِس سے بچ گئے۔ خیالات کے اوپر فالج گر پڑا۔ میں مبہوت ہوکر رہ گیا کہ یہ کیا ہے؟ اب تجزیہ کرتا ہوں تو معلوم ہوا کہ دعا کے قبول ہونے کا یقین نہیں تھا۔ خود وجود باری تعالیٰ میں صرف ایک دھندلا سا یقین عادتاً پڑ گیا تھا۔ میں انکساری کی شاعری نہیں کر رہا ہوں، اپنی سچی مصیبت بیان کر رہا ہوں۔ گو میں ہمیشہ سے کہتا تھا کہ بغیر دیکھی چیزوں کا یقین اس درجے کا نہیں ہوتا جیسا بدیہات کا ہوتا ہے۔ مگر اپنی بے ایمانی کی اس حد سے واقف نہیں تھا۔ اب نماز کے بعد صرف خدا کے رحم کی دعا مانگتا ہوں۔ ہما! کہو اب کیا کریں ہم اپنی لاادریت سے واقف تھے مگر پھر بھی یہ نہیں سمجھتے تھے کہ کفر کی ان گہرائیوں تک ہیں۔ نماز وغیرہ پڑھ کر ہمیشہ سے جانتے تھے کہ اس طرح ہمارے اعمال باضابطہ اور اچھے ہوجائیں گے، لیکن کفر کے اس درجے کی خبر نہیں تھی۔

راقم محمد علی عفی عنہ

وصی میاں [63] کے نام

عزیزی وصی میاں دعا۔ قضائے خدا اور سنت آدم برحق ہے۔ رضا بقضائه و تسلیماً لامرہ میں ہم کو عذر ہی کیا ہوسکتا ہے۔ لیکن دل پر قبضہ نہیں۔ ہاتھ ملنے کو دل چاہتا ہے وہ کر رہے ہیں۔ وصی میاں جیسا کہ میں ایک بار پہلے بھی عرض کر چکا ہوں جو نعمت آپ کو صُلبی ملی تھی وہ مجھ کو حسن اتفاق سے روحانی پہلو سے ملی تھی۔ میں بہترین تعزیت آپ کو، آپ کی بیگم صاحبہ کو اور بچوں کو پیش کرتا ہوں، آپ بھی مجھ سے ہمدردی فرمائیں۔ مرزا صاحب مرحوم کی عمر چہ از روئے طول اور چہ از روئے قبلہ کم نہیں ہوئی اور مرحوم کا ادبی فیض اب بھی جاری ہے لیکن اس کو کیا کریں کہ پھر بھی جی نہیں بھرا۔

آپ کو خیال ہوگا کہ میں مرحوم کے سامنے کبھی اپنے بڑھاپے کا ذکر نہیں کرتا تھا۔ ایک تو ان کے سامنے موت اور عمر طبعی کا ذکر نہیں کرنا چاہتا تھا اور ایک ان کی موجودگی میں پیری اور ان کے لوازم کم محسوس بھی کرتا تھا اور اکثر وہ شعر یاد آجاتا تھا جو میں مرحوم مغفور کے سامنے پڑھتا تھا؎

ہر چند پیر و خستہ و بس ناتواں شدم
ہرگہ نظر بروئے تو کردم جواں شدم

خدا آپ لوگوں کو صبر عطا کرے اور مرحوم و مغفور کو اپنی مغفرت میں لے! آمین

دعا گو

محمد علی عفی عنہ، ردولی

حسن عباس کے نام

عزیزی سلمہ، دعا۔ خدا کرے تم اچھے ہو اور اچھے رہو۔ آمین ثم آمین۔ مجھ کو تو دو دن کے وقفے کے بعد پھر وہی 99.4 حرارت رہنے لگی۔ ظاہراً اچھا خاصا ہوں۔ سلفاٹرائڈ کے نام سے کھریا پھانک رہا ہوں۔ اگر دوائیں اصلی ہوں تو کچھ امید بھی بندھے۔ اس طرح سے ڈاکٹر کی فیس اور دوا کے دام مسلم ہیں۔ باقی اللہ اللہ۔ تمھارے رخصت ہونے کے خیال سے ایک گونہ خوشی ہوئی مگر یقین جانو تمھاری ناسازی مزاج سے طبیعت کو اچھی خاصی تکلیف ہے۔ مگر دل کہتا ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ تم اچھے ہو اور اچھے رہو گے۔ بار الٰہا ایسا ہی کر۔ آمین۔ قیصر کا تار جدّے سے آیا ہے۔ ہم ۲۲ر ستمبر کو انشاء اللہ تعالیٰ بمبئی پہنچ رہے ہیں۔ خدا اصل خیر سے اس کو گھر لائے۔ آمین۔

باقی احوال بدستور ہیں۔ اتوار کو انشاء اللہ تعالیٰ لکھنؤ کا ارادہ ہے۔ مگر اللہ میاں کا ارادہ ہمارے ارادے پر غالب ہے۔

دعا گو

محمد علی عفی عنہ

۲۱ر ستمبر ۱۹۵۱

(غیر مطبوعہ)

(۲۹)

ہما بیگم کے نام

ردولی ۲۸ر ستمبر ۱۹۵۱

ہما پیاری۔ دعا! سنو ہمارے استاد مرزا محمد عسکری صاحب کا انتقال تراسی سال کی عمر میں ہوگیا۔ وراثت میں ہم کو ان کا سٹھیانہ پن ملا ہے۔ اب ہم سے اس طرح کے خطوط کی امید نہ رکھو

بہار پیشہ جوانے کہ غالبش نام اند
کنوں بہ بین کہ چہ خوں میچکد زہر نفسش

ہماری قیصر حج سے واپس آگئیں۔ بہت خوش ہیں۔ وجّو نے جیسی امید تھی، اُس سے زیادہ خاطر کی۔۔ کیا کہنا دریا دل آدمی کا۔ قیصر نے بھی بڑی آن بان سے حج کیا۔ قیصر کا شوق زیور اور کپڑے کا تو تم جانتی ہو۔ وہاں سونا سولہ روپے تولہ ستا تھا۔ ریشمی کپڑے بھی ستے تھے، مگر قیصر نے کچھ نہیں لیا۔ اس نے کہا ہم حج کرنے آئے ہیں۔ یہاں زیور اور کپڑے خریدنے نہیں آئے ہیں۔ روپیہ اچھا خاصہ بچا تھا۔ اس روپے کا اس نے لکھنؤ میں کپڑا خریدا کہ تمام نوکروں کے کپڑے دے گی۔ چنانچہ آج بانٹ رہی ہے۔ واپسی میں ہوائی جہاز، ہوائی طوفان میں نہ معلوم کہاں کا بہہ کر کہاں پہنچ گیا اور ساڑھے چھ گھنٹوں کا سفر اٹھارہ گھنٹوں میں کٹا۔ مگر اللہ میاں نے غریب کو گھر پہنچا دیا۔ اس سفر میں ایک خاندان سے ملاقات ہوگئی۔ حاجی داؤد ناصر عجیب طرح کے فرشتہ خصلت لوگ ہیں۔ کروڑ پتی ہیں اور دن رات مہمان وغیرہ ٹھہرایا کرتے ہیں اور اس کی خدمت ایسی کرتے ہیں جیسے کوئی غریب آدمی کسی امیر آدمی کی کرے۔ قیصر کی زندگی حج سے ایسی مکمل ہوگئی ہے کہ میرا بہت دل خوش ہوا۔ میں تو یہ سوچتا تھا کہ بعد حج اگر مرجائے تو بھی کوئی ہرج نہیں۔ میری باقی ماندہ زندگی تو بے نمک ہوجائے گی، مگر قیصر تو پیش خدا پاک صاف ہوجائے گی۔ خیر خدا

نے ہر طرح رحم کیا۔ میں نے تمھارے خط کا مضمون اس کو سنایا تھا۔ اس نے کہا مجھ کو بڑا اچھا لگا۔ کہتی تھی میں نے ہما کے لیے ہر جگہ بڑی دعائیں مانگی ہیں اور اب بھی دعا کہتی ہوں۔ ہما بیگم! تمھارے خط سے میری زندگی بڑھتی ہے۔ بڑھاپے میں طاقت آتی ہے۔ خدا تمھاری مدد کرے۔ تمھارے مصائب کم کرے اور اپنے خزانۂ غیب سے تم کو خوشیاں نصیب کرے اور جب وقت آئے تو ایمان پر خاتمہ کرے اور بعد اس کے اپنی جوار رحمت میں لے اور تمھارے صدقے میں مجھ کو بھی بخش دے۔ آمین رب العالمین۔

راقم

تمھارا باپ عفی عنہ

حسن عباس کے نام

عزیزی سلمہ۔ دعا! کل سے میرے حرارت کا سلسلہ جاری ہے۔ پریشان ہوکر میں نے انگریزی علاج چھوڑ دیا اور ہومیوپیتھک علاج ایک فیض آباد کے ڈاکٹر کے مشورے سے شروع کیا کچھ فرق معلوم تو ہوتا ہے مگرابھی کچھ کہہ نہیں سکتا۔ خدا کرے تم اچھے ہو۔ رخصت کی منظوری نامنظوری کا کیا نتیجہ نکلا۔ قیصر اچھی نہیں ہوئیں مگر چل پھر رہی ہیں اور مرض کی شکایت بھی کر رہی ہیں۔ لکھنؤ لیڈی ڈاکٹر کو دکھانے کے لیے جانے والی ہیں۔ رات جعفر سے ملاقات ہوئی تھی۔ کوئی قائم مقامی کی جگہ لیتے تھے کہ مکانوں کے تقسیم کے صیغے میں ملی ہے۔

قیصر دعا کہتی ہیں۔

دعا گو

محمد علی عفی عنہ

۳۱/اکتوبر ۱۹۵۱ ردولی

(غیر مطبوعہ)

حکیم حسن عباس کے نام

عزیزم سلمہ! تمھارا محبت نامہ آگیا۔ یہ نہ سمجھنا کہ چونکہ تم نے جواب دیر میں دیا تھا اس لیے میں نے بدلہ نکالا ہے۔تم نے خط ہی دیر میں پایا تھا اور مجھ کو فطرتی کاہلی نے روکا۔ اس لیے کوتاہ قلمی ہر دو جانب سے مختلف وجوہ سے ہوئی۔ میں بحمدللہ اچھا ہوں، ''شکراً شکراً'' کہا کرتا ہوں اور دل یہ چاہتا ہے کہ جب بیمار پڑوں تب بھی ''شکراً شکراً'' کہوں، کیونکہ چوتھے امامؑ نے بتایا ہے کہ اللہ میاں بیمار ڈال کر آدمی کے گناہ بخشنے کا بہانہ ڈھونڈتے ہیں۔ دیکھو جو بن پڑے۔

آج کل نہ بخار معلوم ہوتا ہے نہ اضمحلال۔ الحمدللہ رب العالمین ہماری نجّن کہتی ہیں کہ چہرے کا روپ اچھا ہورہا ہے۔ ان کو یہ دکھائی دیتا ہوگا۔ ہم تو جب آئینہ دیکھتے ہیں تو شکن ہی شکنیں دکھائی دیتی ہیں۔ اگر کوئی بیماری باقی ہے تو وہی جو بستر پر سونے سے چل رہی ہے۔ بس خدا کرے تمھاری رخصت کی درخواست جلد منظور ہوجائے۔ کوئی خاص ضرورت تو اس چھٹی کی نہ تم کو ہے نہ ہم کو۔ مگر اب ایک امید پڑ چکی ہے وہ پوری ہی ہوجائے تو اچھا ہے۔ ردولی میں دو تین دن ہوئے ایک رات کو پانچ یا چھ قفل ٹوٹے، دو جگہوں سے مال بھی گیا۔ تب سے پھر کوئی واردات نہیں ہوئی۔ یہ واقعہ صرف کاغذ کا پیٹ بھرنے کو لکھا گیا۔ قیصر دعا کہتی ہیں۔ جابر سعید سلام کہتے ہیں۔ تمھارے یہاں خیریت ہے۔

دعا گو

محمد علی عفی عنہ

۱۲/نومبر ۱۹۵۱ ردولی

(غیر مطبوعہ)

---

(۷۲)

نجّے کے نام

بیٹا نجّے! خدا تم کو خوش رکھے اور تمھاری نیک دلی، نیک نیتی اور نیک عملی کا اجر دے۔ اگر واقعی تم اتنے ہی نیک آدمی ہو جیسا کہ معلوم ہوتے ہو تو انشاء اللہ تم دنیا میں اقبال مند، کامیاب اور خوش رہوگے اور قاضی صاحب مرحوم کے اتنا جیوگے اور اس کے بعد غڑاپ سے سیدھے جنت میں جاؤگے۔ یہ سب خوشامد سے نہیں لکھ رہا ہوں بلکہ میرے دل میں یہی ہے اور جو لوگ تم کو جانتے ہیں سب کا خیال یہی ہے۔ اگر یقین نہ ہو تو ہما کے سر پر قرآن رکھ کر ان سے پوچھ لو۔ ہما، یوں بھی جھوٹ نہیں بولتیں۔ قرآن سر پر رکھ کر کیسے غلط بات کہیں گی۔ شاہدہ(64) سے البتہ نہ پوچھنا کیونکہ پیغمبر بھی اپنی بی بی اور اپنے خدمت گار کے آگے پیغمبر نہیں ہوتا۔ البتہ ضیا سے پوچھ سکتے ہو۔ مگر قرآن ان کے سر پر نہ رکھنا وہ گرا وِرا دیں گے تو بے ادبی ہوگی۔ اچھا اب خوشامد اور سچی تعریف ختم کرتا ہوں اور اصل مطلب پر آتا ہوں۔ تمھاری خیریت تو معلوم ہی ہوجاتی ہے۔ آج کل ہما کی مصروفیت کی وجہ سے ان کا خط نہیں آتا۔ اس لیے تم سے عرض ہے کہ اپنا اور ان کا اور شاہدہ کا مفصل حال لکھ بھیجو اور پوسٹ کارڈ بھیجنے کی معافی دو۔ اس میں صفت یہ ہے کہ Censor صاحب پوسٹ کارڈ دیکھ کر کھسیانے ہوجاتے ہیں۔ تم کو کون نئی بات لکھوں میاں بدرل تو گھنے موتنے کی سب باتیں لکھ ہی دیتے ہیں۔ تمھاری خالہ نے دانت بنوائے ہیں۔ میاں بدرل نے سہیل سے کہا کہ ان سے کہہ دینا رات کو ضرور دانت لگا کر لیٹا کریں تاکہ عادت پڑ جائے۔ میں نے کہا کہ اتنا اور کہہ دینا کہ جنھوں نے یہ صلاح بتائی ہے وہ خود رات کو دانت نکال ڈالتے ہیں۔ میاں بدرل نے بڑے ضبط سے کام لیا نہیں تو مجھ سے لڑائی ہوجاتی۔

دعا گو

محمد علی عفی عنہ

۲۳ر نومبر ۱۹۵۱

ہما بیگم کے نام

ردولی　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　نومبر ۱۹۵۱

ہما پیاری، دعائیں پیش کش ہیں۔ الحمدلله رب العلمین والعاقبة للمتقین۔ اما بعد واہ بیگم تم بڑی منشی ہو نئے نئے گوشے نئے نئے زاویے ڈھونڈھ نکالتی ہو کہ بڈھے باپ کا جی خوش کردو۔ خیر اللہ تم کو خوش رکھے۔ جیسے تم دوسروں کا جی خوش کرتی ہو۔ کل کا دن میرے لیے بڑا اچھا تھا۔ صبح کو فیض آباد گیا تھا۔ آفاق(65) کو ڈاکٹر کو دکھانا تھا وہاں سے واپس آکر چار خط اور ایک تار ملا۔ تار نجن کا تھا کہ آپریشن ہوگیا۔ سب خیریت ہے۔ تمھارا خط تھا جس کا حال تم کو بھی معلوم ہے اور میرا دل بھی مزہ لیتا ہے۔ ایک خط مرزا عسکری صاحب مدظلہ اللہ تعالیٰ کا آیا۔ میں نے ان کو رسالہ بھیجی تھی لکھتے ہیں ''خدا تم کو سلامت باصحت و عافیت، با اقبال اور خوش دل و خوش حال رکھے۔ اس زمانے میں جبکہ نفسانفسی، کش مکش اور بے تعلقی حد درجے کو پہنچ گئی ہے۔ تمھاری قدیم طرز روش اور پرانی چال یعنی سابق دوستوں اور محبت رکھنے والوں کا خیال تمھارا ہی کام ہے۔ اِس پاسِ وضع اور دلی محبت کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ بہت دنوں سے نہیں ملے، دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔''

آل رضا کی نظم پڑھ کر ایک عجیب کیفیت دل میں آئی۔ بعض درمیانی مصرعے اور آخری بند نے دل کو اللہ میاں کا گھر بنا دیا۔ تنقیداً نظر کرنے سے آل رضا کے دلی کیفیات کا اندازہ ہوا کہ بیچارے کے دل میں وہاں[1] پہنچ کر نہ معلوم کیا تلاطم رہا ہوگا۔ انھوں نے ہزار بیان کرنے کی کوشش کی مگر اس وقت کا دماغ اُس وقت کا دل کوئی کیا سمجھ سکتا ہے۔ نہ معلوم کیا مچھلاؤ پڑا ہوگا۔ ارے یہ مچھلی پکڑوں کہ وہ۔ ارے وہ مچھلی دیکھو، چاندی ایسی

---

1. کربلائے معلّی

چمکی اس کو چھوڑ کر اسی کو لے لوں۔ دو لے لوں۔ قصہ مختصر۔

پڑ گیا لوٹ میں شبیرؑ کا مہماں ہو کر

اگر عقیدہ عمدہ ہو تو زندگی کی یہ گھڑیاں جنت سے آتی ہیں۔ ہم ملحد، بے ایمان امام حسینؑ کو نہ معلوم کس زاویے سے دیکھتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست نے کربلائے معلّٰی سے خط لکھا۔ تھوڑی دیر کے لیے دل پر کچھ خفیف سا اثر ہوا۔ میں نے ان کو حسب ذیل لکھا تھا۔

گرچہ دوریم از بساط قرب ہمت دور نیست
بندۂ شاہ شما ایم و ثنا خوان شما

اتنا میری طرف سے بھی عرض کر دیجیے گا کہ یہ نادیدہ غلام آپ کا ''مقام شبیری کو مقام ابدی جانتا ہے'' لیکن ایک کمی ہے جس کی وجہ سے اپنے کو غلامان غلام میں گنتے کانپا جاتا ہوں۔ وہ یہ کہ نامرد ہوں، ہیز ہوں، ڈرپوک ہوں، اُن کیڑوں میں ہوں جن کی ریڑھ کی ہڈی نہیں ہوتی۔ بھلا آپ کی غلامی کا دعویٰ اور ڈر، لاحول ولاقوۃ۔

میرے آقا، میرے خداوند نعمت، میرے قائد، میرے راعی، چاروں طرف ظلم کا کمال اور حق کو پامال دیکھتا ہوں اور مجھ سے چھوٹی سے چھوٹی قربانی نہیں ہو سکتی۔ ذری اللہ میاں سے کہہ دیجیے کہ بس اتنا چاہتا ہوں کہ بڑی سے بڑی نہ سہی اللہ میاں کے حکم پر اور آپ کا نام لے کر کچھ چھوٹی ہی چھوٹی قربانیاں کر لوں۔ ایاز قدر خود بشناس اپنی حیثیت سے بڑھ کر بات نہیں کرتا۔ یہ نہیں کہتا کہ سر کی قربانی مجھ سے ہو جائے۔ بال بچوں کو اس کی راہ پر قرباں کر دوں، گھر بار لٹا دوں، بس اتنا چاہتا ہوں کہ لوگ پہچان جائیں کہ یہ کس کا غلام ہے۔ ابھی آفاق نے اس دن جگر کا شعر پڑھا ؎

تری خوشی سے اگر غم میں بھی خوشی نہ ہوئی
یہ زندگی تو محبت کی زندگی نہ ہوئی

میں نے کہا یہ شعر ایسا ہے کہ چاہے پلنگ پر داہنی کروٹ لیٹ کر پڑھو، چاہے کربلا کے میدان میں تڑپ کر پڑھو آنسوؤں کا تو سستا سودا ہے وہ تو سہل ہیں دل بھی بے چین

ہو جاتا ہے۔ مگر امام علیہ السلام کا بھی نام لے کر ہمت قربانی کی نہیں بندھتی۔ اسی وجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ جمع خرچ ہے زبانی ہے۔ اگر دل سے ہوتا تو کبھی نہ کبھی کچھ تو ہو جاتا بس یہی دعا میرے لیے مانگیے گا۔

بدرل، آفاق، قیصر، جابر، سعید سب تم کو دعا اور سلام اور ہر ایک کی مزاج پرسی کرتے ہیں۔ لڈن اور بجن، کاظم اور سب کو بہت بہت دعا۔

محمد علی عفی عنہ

---

(۷۴)

صلاح الدین احمد کے نام

دامت نوازشکم! تسلیم۔ محبت نامے کا شکریہ ''ادبی دنیا'' موصول ہوا تھا مگر شکریہ کا خط نہ لکھ سکا۔ نو ہفتے تک ہلکی حرارت میں مبتلا رہا۔ اب بحمداللہ بالکل اچھا ہوں۔ گو گزشتہ علالت اللہ میاں کی نوٹس تھی کہ تیار رہو۔ جواباً اوپر کے جی سے لبیک لاشریک لک لبیک کہہ دیا اور کیا کہتا۔ بہرحال اب بالکل اچھا ہوں۔ البتہ عقل کچھ کُھل سی ہوتی معلوم ہوتی ہے۔ ''ستر ابہترا'' غالب کہہ گئے ہیں کچھ سٹھیانے پن کا اثر شروع ہوگیا ہے۔ حضرت آپ کی ادب نوازی، ادیب پروری کا تقاضا تو یہ کہتا ہے کہ ''ادبی دنیا'' کی خدمت میں دن رات مصروف رہوں مگر ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

اپنے میں وہ حال نہیں پاتا جس استہزا یعنی sense of the ridiculous کچھ کم ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ اس لیے قلم اٹھاتے کچھ ڈر سا معلوم ہونے لگا ہے۔ میرے استاد مرزا محمد عسکری صاحب لکھنوی بڑے ادیب اور مصنف تھے۔ مرحوم نے ابھی انتقال کیا ہے۔ میرے بچپن میں ان کی خوش بیانی، نغز گوئی، بذلہ سنجی کے ڈنکے بجے ہوئے تھے۔ مجھ سے بڑی محبت کرتے تھے، مگر واقف کار محسوس کرنے لگے تھے کہ باتیں کرنے میں طول کلام اور عرضِ معنی اور رقبۂ افادیت میں کچھ تناسب بگڑنے لگا تھا۔ یہی دھڑکا لگا رہتا ہے نہیں تو لکھنے کو اب بھی جی چاہتا ہے۔ امتثالاً لامرہ کوشش کروں گا اور کچھ ہوگیا تو دس جنوری تک حاضر کروں گا۔

آپ نے میرے ہفوات پر تقریظ لکھ کر میرا کلاہ گوشۂ آفتاب تک پہنچا دیا ہے۔ اس کے بعد بھی اگر میں حکم نہ بجا لاؤں تو حیف ہے مجھ پر۔ اتنی درخواست ضروری ہے کہ اگر کچھ ہوگیا، مگر ''ادبی دنیا'' کے پایہ سے گرا ہوا ہو تو خالی عبرت دلانے کی نظر سے قبول نہ

کیجیے گا ''کشکول محمد علی شاہ فقیر'' امید ہے کہ ڈھائی برس کے بعد پریس سے آجائے۔ جیسے ہی آگئی حاضر کروں گا۔ مگر صلاح الدین صاحب چھاپنے والے نے کیا ظلم کیا ہے۔ چھپائی ایسی ہے جیسے یتیم بچے کا منھ ہوتا ہے۔ غلطیاں ایسی ہیں کہ جیسے بڑے گھر کی لونڈی ہوتی ہے۔ کتاب مسخ ہوکر رہ گئی ہے اور ہم ہیں کہ بے بس، بے اختیار دم بخود بیٹھے ہیں۔ دیکھیے دیکھیے وہی بات جو میں کہتا تھا سامنے آئی۔ یعنی بے ضرورت کلام شیطان کی آنت ہوگیا۔ اور ہم کو کب خبر ہوئی جب صفحہ قریب بہ ختم پہنچا۔

دعا گو

محمد علی عفی عنہ، ردولی

۱۲ر دسمبر ۱۹۵۱

---

(۷۵)

ہمایوں مرزا کے نام

مائی ڈیئر ہمایوں مرزا صاحب...... سلام مسنون الاسلام!

آپ کے ذہن پر مجھ کو رشک ہے۔ آپ کے خیال پر غبطہ ہے اور یہ افسوس ہے کہ میں آپ کا ایسا کیوں نہ ہوا۔ میرا شعور باطنی بھی پکار پکار کر کہا کیا ہے جو آپ نے خط میں لکھا ہے۔ مگر میں اسی دلدل میں خردرگل رہا جس سے پاؤں آپ نے باہر نکال لیے اور کتاب بند کردی۔ کیا کروں آدمی تاریخ کا بچہ ہے اور تاریخ سے بچ کر نکل جانا سمجھ ہی میں نہیں آتا۔ مگر اللہ میاں کی دنیا صرف ہمایوں مرزا صاحب اور محمد علی سے تو بنی نہیں ہے۔ یہاں تو مولوی عبدالشکور صاحب بھی ہیں اور مولوی مہدی حسن صاحب بھی ہیں اور علی ظہیر بھی اور جو راستہ اختیار کرو ملیح آباد کے خان صاحبان سے مڈبھیڑ ہو ہی جائے گی۔ جب تک روپیہ دنیاوی آرام کی کنجی ہے جب تک ایک سے دوسرا چالاک ہے تب تک دنیا ایسی ہی رہے گی۔ سب سے بہتر زمانہ جو اسلام کا تھا یا عیسائیت کا یا یہودیوں کا جب خود پیغمبران علیہم السلام موجود تھے اس وقت تو تاویلیں ہوا کیں۔ خود پیغمبر کی موجودگی میں سورۂ منافقون کی ضرورت ہوئی۔ السلام علیکم کا جواب ترکی بہ ترکی دیا گیا تو یہ امید لگانا کہ ایک دن مولویوں سے چھٹکارا ملے گا، کچھ ٹوٹی ہوئی آس ہی معلوم ہوتی ہے۔ تم کو جب تک دنیا سے تعاون کرنا ہے جب تک لڑکوں کا بیاہ کرنا ہے۔ لڑکیوں کو پار گھاٹ لگانا ہے، دوستوں کی تیمارداری کرنا ہے، دشمنوں سے حفاظت کرنا ہے، صلح کرنا ہے، لڑائی کرنا ہے، معاملت کرنا ہے، بدمعاملگی سے بچنا ہے، جب تک تبرا اور مدح صحابہ کی آوازیں سننا ہے تب تک دشمنوں کی کھٹ پٹ، دوستوں کے معانقے سے چھٹی نہیں ہم فقط یہی کر سکتے ہیں کہ اپنا کام کیے جائیں اور کوشش کریں کہ قرآن کو مجبور نہ بنا دیں۔ میں قدرتاً pessimist واقع ہوا ہوں کاش optimist ہوتا۔ یقین جانیے آپ کے خط سے میرے دل میں وہی خیال آیا جو میں آپ کے سامنے کہہ چکا ہوں، یعنی خدا مولوی عبدالشکور اور مولوی مہدی حسن کو بھی آپ ہی

ایسا پہلوان کردے۔ آمین، ثم آمین۔

سمپورنانندجی اور الگورائے شاستری کے ساتھ تو سفر نہیں کر سکتے۔ پھر نسیم صاحب اور علی ظہیر ہی صاحب بدرقہ راہ ہوں گے۔ کتنے ہمایوں مرزا دنیا میں ہیں اور گئے محمد علی پانچوں سواروں میں ہیں کہ جن کے ساتھ مل کر خدا تک راستہ پورا ہو۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کے خیالات نے راست بازی کی شاہراہ دکھائی مگر gregarious animal کیا کرے۔ نماز آدمی ہاتھ باندھ کر پڑھے گا یا ہاتھ کھول کر۔ اگر آدمی دونوں طریقوں کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھے تب بھی جو ritual اختیار کرے گا اس میں پھنس جائے گا۔ اس لیے صرف قرآن کی پیروی سے کام چلتا دکھائی نہیں دیتا اور مجبوراً تاریخ روایات traditions کی پابندی کرنی پڑے گی۔ باقی سب چیزوں کو مٹا دیجیے اور صرف قرآن ہی رہنے دیجیے یا کوشش کیجیے کہ اور سب چیزوں میں کچھ نہ کچھ ہم خیالی پیدا ہو۔ نہیں تو دنیا چھوڑ کر کسی پہاڑ کی گھاٹی میں چلے جائیے اور جب معلوم ہو کہ اسلام رہبانیت نہیں ہے تو کھسیانے ہو کر پھر لوٹ آئیے اور

با ہمیں مردماں بباید ساخت
چہ تواں کرد مردماں ایں رند

کا وظیفہ پڑھیے۔

ہمایوں مرزا صاحب یقین کیجیے گا آپ کے خط سے میرے دل کی قوت بڑھ گئی۔ پھر کہتا ہوں کہ بار الہا اسلام میں بہت سے ہمایوں مرزا پیدا کردے۔ آمین!

دعا گو عقیدت کیش

محمد علی عفی عنہ

ردولی یکم فروری ۱۹۵۲

ایک دوسری کتاب دوسرے رنگ میں پیش کرتا ہوں۔ بیکار سی کتاب ہے مگر جو عمر بھر کام کر کے بڑھاپے میں دل بہلانا چاہتا ہو، اس کی خدمت گزار ''کشکول محمد علی شاہ فقیر۔''

---

(۷۶)

مرزا محمد وصی بی۔اے ایل ایل بی کے نام

مائی ڈیئر وصی! دعاء

تمھارا خط آیا اور اپنے ساتھ ۱۸۹۲ سے لے کر مرزا صاحب مرحوم کی رحلت تک کے خود میرے واقعاتِ زندگی پیش نظر ہوگئے۔ آپ ہمارے چاہنے والے استاد کی نشانی ہیں۔ جب تک حافظہ باقی ہے، جب تک گزشتہ زندگی پر مختصراً آئندہ زندگی کا مدار ہے تب تک ہم آپ کیسے چھوٹ سکتے ہیں۔ بڑھاپا، بیماری، کمزوری، موت، بار بار کے دیدار سے محروم رکھے۔ مگر دل کا تعلق کیسے جاسکتا ہے۔ آج چار پانچ مہینوں سے بیماری کا سلسلہ شروع ہوا ہے۔ برابر نوٹسیں مل رہی ہیں کہ رختِ سفر باندھے تیار رہو۔ اسی وجہ سے ملاقات کی نوبت نہ آئی ورنہ

حلقہ پیر مغانیم ازل در گوش است

مرزا صاحب مرحوم کے سامنے بڑھاپا کم محسوس ہوتا بھی تھا اور ان کے آگے اپنی بیماریوں کا ذکر کم کرتا بھی تھا۔ تم سے وصی میاں اپنی ضعیفی کا ذکر کرتے کیوں دبوں۔ سنو Albumen آتا ہے۔ قلب سے بجائے کھٹ کھٹ کے کھٹ پٹ کی تیاری ہے۔ لکھنؤ ڈاکٹر کو دکھانے گیا تھا۔ ہزار چاہا کہ محمودنگر تک پہنچ جاؤں مگر حرارت اور کمزوری نے روک رکھا۔ ایسے وقت میں معمولی ملاقات والوں کو پھر ایک بار دیکھ لینے کو دل چاہتا ہے، چہ جائیکہ تم لوگ۔ عنقریب لکھنؤ آنے والا ہوں۔ اگر بس چلا تو بچوں کو اور تمھاری بی بی کو ضرور دیکھنے آؤں گا۔ تم خود جس وقت جی چاہے آؤ، ادھر میری دو کتابیں چھپی ہیں جب ان کو دیکھتا ہوں مرزا صاحب مرحوم یاد آجاتے ہیں۔ قدر شناس کی تلاش کس کو نہیں ہوتی اور پھر ایسا قدر شناس جو ہماری اچھائیوں کا بانی ہو اور ہماری خامیاں دیکھ ہی نہ سکتا رہا ہو۔ تمھارے حصے کی کتابیں رکھی ہیں۔ جیسے ہی موقع ہوگا حاضر کروں گا۔ ردولی کچھ دور نہیں ہے۔ متعدد

ریلیں آتی ہیں جس وقت دل چاہے چلے آؤ۔ تمھاری وجہ سے گھڑی دو گھڑی اچھی کٹ جائے گی۔ اگر تمھارے گھر میں اور بچے آئیں تو میری آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔ مہینہ ڈیڑھ مہینہ میں عرس ہے۔ اگر درمیان میں نہ آسکو عرس میں سب کے سب آؤ۔ عرس ۱۴-۱۵ ر جمادی الثانی کو ہوتا ہے اور کیا عرض کروں۔ سوا اس کے کہ

یارب اماں دہ تا باز بیند
چشم محباں روئے حبیباں

قیصر بیگم تم کو، تمھارے بیوی بچوں کو بہت بہت دعا کہتی ہیں۔

راقم خواجہ تاش
محمد علی عفی عنہ
۲ رفروری ۱۹۵۲

---

(۷۷)

ہما بیگم کے نام

ردولی ۱۲رفروری ۱۹۵۲

ہما پیاری، دعا! کشکول کے سلسلے میں تمھارا خط اور رضا سلمہ کا خط آیا تھا جواب آج تک نہ گیا۔ بیٹی معاف کرنا، ادھر کچھ مختلف اسباب سے خط کم لکھے ''میرا مذہب'' چھپ گئی۔ میں نے تم تک بھجوانے کا سامان بھی کیا ہے مگر دیکھیے کب تک پہنچے۔ عبدالعزیز صاحب جنھوں نے کشکول کی تعریف کی ہے ان سے میری تسلیم اور میرا شکریہ کہہ دینا۔ میری دونوں کتابیں ایسی کس مپرسی کے عالم میں چھپی ہیں کہ کچھ انتہا نہیں۔ جتنی غلطیاں صحت نامہ میں بنائی گئی ہیں اسی قدر اور رہ گئیں۔ خیر ہوگا۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ کسی نہ کسی طرح یہ دونوں کتابیں میری زندگی میں چھپ تو گئیں۔ میں اچھا ہوں اور زندہ ہوں۔ کچھ دن ہوئے میں بیمار تھا لیکن اب بفضلہٖ اچھا ہوں۔

اس وقت صبح کا وقت ہے۔ نماز پڑھ کر تقریباً آدھ پاؤ خشک میوے کا چبینا کیا ہے۔ بجائے چائے کے ایک پیالی دودھ پیا ہے۔ مریض ابھی آنا شروع نہیں ہوئے ہیں۔ باغ بندروں نے اجاڑ کر دیا ہے۔ بقول سودا کے۔

بجائے گل، چمنوں میں کمر کمر ہے گھاس

وجہ یہ ہے کہ آدمیوں کی کمی اور بندروں کی بہتات۔ کہیں کہیں ایک آدھ گلاب کا پھول دکھائی دیتا ہے جو باغ آج کل دلہن بنا ہوتا تھا وہ مرزا سودا کی دلّی ہوگیا ہے۔ جیسے ان کے شہرآشوب میں ؎

ہزار گھر میں کہیں ایک گھر جلے ہے چراغ

سو وہ چراغ بھی بقول سودا کے دل کا داغ ہی ہوکر چمک رہا ہے۔

زندگی کٹتی جارہی ہے۔ ستر برس کا ہوگیا ہوں۔ جینے کے دن کم اور جینے کی ہوس

زیادہ ہورہی ہے۔تم اپنا حال لکھو اور جو دل چاہے لکھو مگر کاغذ کا پیٹ بھردو۔ تمھارا خط دیر تک پڑھے جانا چاہتے ہیں بس اور کیا ہے۔

سعید لکھنؤ کالون کالج جانے والے ہیں۔ اب کب تک گھر پر پڑھاتے جائیں۔ جابر اچھے ہیں۔ قیصر بھی وہی اپنے پرانے ٹھاٹھ سے چلی جاتی ہیں۔ آفاق کی ہمدردی کافور کے مرہم کی طرح ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔ بدرل کا خلوص دل کو گرم رکھتا ہے۔ مٹھو تندہی سے علاقے کا کام دیکھتے ہیں۔ مجید دل سے خدمت کرتا ہے جس میں علاوہ فرض کی ادائی کے وفاداری کی جھلک دکھائی دیتی ہے، دل کا پہلو چمکتا ہے۔ اگر اللہ میاں کا شکر بھیجنے کی عادت ہوتی تو بڑی گنجائش تھی۔ مگر یہاں تو نہ شکراً کی مشق ہے نہ عفواً عفواً کی۔

لیجیے صاحب خط کا رنگ ہی بدل گیا۔ ایک صاحب کشمیری امام باڑہ کے آدھمکے۔ بچارے صاحب حاجت ہیں۔صورت سوال ہے، کپڑوں کا برا حال ہے، مگر بجائے صاف صاف ضرورت بیان کرنے کے یوں گل افشانی فرماتے ہیں''آپ نے شاید مجھ کو نہیں پہچانا، واقعی زمانہ بدل گیا ہے۔ مجھ کو وہ وقت یاد ہے جب آپ الیکشن کے لیے کھڑے ہوئے تھے اور شیخ حبیب اللہ آپ کے مقابلے میں تھے۔ راجہ صاحب محمود آباد آپ کے خلاف تھے اور راجہ صاحب سلیم پور آپ کی طرف سے کوشش کر رہے تھے۔ یہ وہی زمانہ تھا کہ سید محمد ہادی ڈپٹی کمشنر پرتاپ گڑھ نے میری سفارش راجہ صاحب محمود آباد سے کی تھی۔ راجہ صاحب نے میری تنخواہ مقرر کردینے کو کہا مگر سید محمد ہادی صاحب نے اس کو ناپسند کیا۔ کیونکہ راجہ صاحب یونہی عنایت فرمانا چاہتے تھے اور میں چاہتا تھا کہ کوئی خدمت بھی میرے متعلق کی جائے۔ حسن اتفاق کہ عین اسی وقت سرور زیر حسن نے کچھ ایسا کہہ دیا کہ اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ بعد کو رفیع احمد قدوائی کے چھوٹے بھائی جو لکھنؤ میں اے ڈی ایم تھے۔ انھوں نے خواجہ قمرالدین ریلوے مجسٹریٹ سے سفارش کردی۔ کوئی ڈیڑھ برس اہل دار رہا۔ مگر وہ سنّی کشمیری اور میں شیعہ کشمیری۔ کچھ ایسا ہوا کہ ڈیڑھ سال بعد وہاں سے علیحدہ ہوگیا۔ چودھری ارشاد حسین[66] صاحب سے اکثر مجالس میں لکھنؤ میں نیاز حاصل ہوجاتا تھا۔ ادھر میں آیا۔ میں نے کہا جناب کی بھی زیارت کروں۔ سبحان اللہ آپ کا فیض یہ دوا بانٹنے کا ایسا جاری ہے اور ماشاء اللہ آپ نے کتابیں بھی بہت سی جمع کرلی ہیں۔ ہمارے یہاں لکھنؤ میں پیارے لال نے بھی اس میں ید طولیٰ بہم پہنچایا تھا مگر کیا کہیے۔ یہ

بات وہاں بھی نہیں تھی۔ افسوس ہے کیا کہیں۔ اگر آپ کہیں ہمارے لکھنؤ میں ہوتے تو تمام شہر آپ کا گرویدہ ہوجاتا۔ راجہ صاحب پیرپور کے یہاں مجالس میں اکثر جانے کا اتفاق ہوا۔ بڑے چوٹی کے رئیس تھے۔"

اس کے بعد ایک اور صاحب تشریف لائے فرمانے لگے "میں امیر آدمی تھا، اب غریب ہوگیا ہوں۔ فی الحال کربلائے معلیٰ جانے کا ارادہ ہے۔ ایک مرتبہ پہلے بھی مشرف بہ زیارت ہوچکا ہوں۔ اب پھر جارہا ہوں۔ دو خطوط قبلہ و کعبہ کے لے کر چودھری ارشاد حسین صاحب کے یہاں آیا تھا۔ وہاں داخلہ ہی نہیں ہوا۔ دو روپے دروازے ہی سے دے کر رخصت کردیا۔ ایک بیوہ لڑکی ہے اور ایک یتیم نواسہ میں قبلہ و کعبہ کا خط لے کر آیا تھا۔ مگر کسی نے ایک پان تک کو نہ پوچھا۔

ان کہانیوں سے مراد یہ ہے کہ چودھری ارشاد حسین کے یہاں اکثر گھیلے (گھائل) یہاں آکر چوٹ کھاجاتے ہیں اور کچھ نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ چودھری ارشاد حسین سب کو کچھ نہ کچھ دیتے ہیں مگر اکثر احسان فراموشوں کے منھ سے ان کی شکایت ہی سنی۔ مجھ کو بھی اکثر لوگ یہاں سے واپس جاکر یہی کہتے ہیں کہ ایک ملحد کے یہاں گزر ہوا تھا۔ ایک صاحب اللہ بہت دن ہوئے آئے ہوئے تھے۔ جنھوں نے مولوی ناصر حسین صاحب قبلہ مرحوم کے یہاں جاکر بڑی تعریفیں کی تھیں۔ مگر وہاں ان لوگوں نے بتادیا کہ آپ کس مغالطے میں ہیں، وہ بڑا ملحد کافر ہے۔

اہلِ ایماں "سوز" کو کہتے ہیں کافر ہوگیا
آہ یارب رازِ دل ان پر بھی ظاہر ہوگیا

لو بی بی کاغذ کا پیٹ بھر گیا۔ عمدہ عمدہ پکوان نہ سہی، چونی چوکر ہی سہی مگر سیری تو ہوگئی۔

تم غور کروگی تو عبارت میں بے ربطگی پاؤگی۔ اکثر الفاظ بیچ میں چھوڑ جاتا ہوں۔ بعد کو پھر لکھتا ہوں۔ یہ ہے بڑھاپا اور اس کو کہتے ہیں سٹھیا جانا۔

تمھارا باپ عفی عنہ
۱۲رفروری ۱۹۵۲

---

(۷۸)

ولایت حسین صاحب کے نام

ڈیئر ولایت حسین صاحب تسلیم! آپ کا آخری کارڈ آیا۔ آپ ماشاء اللہ جوان آدمی، پڑھے لکھے، سمجھ دار، ذمہ دار، بالغ، عاقل، مکلف، راستے کی مشکلوں، سفر کی صعوبتوں کی اس قدر پوچھ گچھ کیا ہے۔ ارے صاحب الہ آباد کے اسٹیشن پر ٹکٹ گھر ڈھونڈھ لیجیے۔ ردولی کا ٹکٹ لیجیے اور ہمت کر کے ریل میں بیٹھ جائیے۔

دل افگندیم بسم اللہ مجریہا و مرسہا!

اور احتیاط مدنظر ہو تو جو ماما آپ کے یہاں کھانا پکاتی ہے اسے کہیے کہ داہنے بازو پر ایک پیسہ امام ضامن کا باندھ دے۔

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

فیض آباد کے اسٹیشن پر کوئی نہ کوئی بندۂ خدا مل ہی جائے گا جو لکھنؤ جانے والی گاڑی پر آپ کو بٹھا دے گا۔ فیض آباد کے اسٹیشن پر بندر بہت ہیں۔ مگر امام ضامن تو بازو پر بندھا ہی ہوگا۔ پھر ڈر کاہے کا ہم سفر ردولی اسٹیشن بتا دیں گے۔ جی کڑا کر کے اتر پڑیئے گا اگر آمد کا وقت معلوم ہوگیا تو میرا آدمی وہاں موجود ہوگا۔ اگر میں اس دن تک مر گیا تب بھی محمد علی کو اتنی جلدی لوگ بھول نہ گئے ہوں گے۔ کوئی نہ کوئی خدا ترس آپ کو میرے گھر کا پتا بتا ہی دے گا۔ ہمت مرداں مدد خدا۔ آپ چل کھڑے ہوئیے گا۔ سب سے پہلے میری بی بی سے میری بادقت موت کا پرسہ دیجیے گا۔ اس کے بعد اور باتیں کیجیے گا۔ البتہ اسٹیشن سے غریب خانے تک سڑک خراب ہے یکے تانگے کا ڈنڈا مضبوط پکڑے رہیے گا۔ خدا چاہے گا تو بیڑا پار ہے۔ آپ خدانخواستہ کچھ موم کے بنے تو ہیں نہیں کہ دھوپ میں دشمنوں کے پگھل جانے کا ڈر ہو۔ شکر کا پنڈا تو ہے نہیں کہ برسات میں بہہ جائے گا۔ پھر کیا پروا ہے

اور تقدیر میں خدانخواستہ نصیب دشمنان لاکھ کوس دور سات قرآن درمیان، شیطان کے کان بہرے، اگر کچھ ایسا ہی لکھا ہے تو رضا بقضائه تسلیماً لاامره۔ مجبوری ہے۔ اگر آپ کے دل میں اس بات کا دھڑکا ہو کہ میں مہمان کو مار ڈالتا ہوں تو الہ آباد میں صدیق حسن صاحب ممبر بورڈ آف ریونیو، سراج الدین احمد صاحب ڈی آئی جی پولیس، جسٹس رگھبر دیال صاحب رگھوپتی سہائے صاحب فراق لکچرر یونیورسٹی جسٹس ولی اللہ جن سے میری میٹروپول ہوٹل نینی تال میں ملاقات ہوئی تھی۔ ان حضرات سے تصدیق کر لیجیے گا کہ میں آدم خوری کا شوق نہیں رکھتا۔ اصل معاملہ تو ایک طرف رہا مجھ کو بڑا اشتیاق آپ کی زیارت کا ہے اور امید کرتا ہوں کہ انشاء اللہ تعالیٰ میرے آپ کے مراسم گہرے ہو جائیں گے۔

خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

گزشتہ سال میری بی بی تن تنہا ہوائی جہاز سے حج کو چلی گئی اور پھر واپس آگئی، اسی طرح انشاء اللہ تعالیٰ آپ بھی اس سفر کی مہم کو سر کر لیں گے۔ مجھ کو آپ سے ملنے کا واقعی اشتیاق ہے کیونکہ باوجود احتیاطوں کے آپ آدمی مجھ کو اچھے معلوم ہوتے ہیں۔

بندہ محمد علی عفی عنہ

ردولی، اودھ

۴؍مارچ ۱۹۵۲

---

(۷۹)

بنام نورالحسن صاحب ہاشمی شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی

مکرمی وعطوفی دامت فضلکم، تسلیم۔ جناب کے کارڈ کا شکریہ تہہ دل سے آپ کی نیک بیں نگاہ نے ''میرا مذہب'' کے صرف صفات پر نظر کی اور عیوب کو نظری کر دیا۔ یہ خود جناب کی خوبی ہے کتاب کی نہیں ع

کانٹوں کو ہٹا کے پھول چن لیتا ہوں

کتاب کے لکھنے کی اصل منشا کی طرف آپ نے اشارہ کر دیا۔ میری محنت کی سچی داد دے دی۔ خدا آپ کو اس کا اجر دے۔ ابھی بہت سی رائیں تو معلوم نہیں ہوئیں۔ دو چار جو معلوم ہوئیں ان میں سوا ایک کے کسی صاحب نے میری دلی آرزو کی طرف اعتنا نہیں کی۔ مگر وہ صاحب میرے چاہنے والے، میرے شاگرد، میرے استاد مولانا عابد الشمر سلمہ ہیں۔ اس لیے ممکن ہے انھوں نے سعادت مندی سے وہی رائے قائم کی ہو جو آپ نے کی۔ باقی حضرات تو خیر شیعہ تو عموماً اس وجہ سے خفا معلوم ہوتے ہیں کہ گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے۔ سنّی ظاہراً خوش معلوم ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے کہ ازخرس موئے بس است۔ مجھے افسوس ہے کہ یہ کتاب بہت مجمل نہ لکھی گئی

کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

روایت اور درایت کے بیان میں وضاحت ہونی چاہیے۔ گو میں نے اشارہ کیا ہے مگر اس موضوع پر زیادہ لکھتا تو اچھا تھا۔ عن فلاں عن فلاں میں یہ صفت ہے کہ جب تک آدمی ازسر تا پا جھوٹ بولنے پر تیار نہ ہو جائے پڑھنے والے کو مشکل سے دھوکا دے سکتا ہے۔ برخلاف درایت کے جس میں یہ عیب ہے کہ باوجود ادعائے نیک نیتی ممکن ہے خود اپنے نفسیاتی رجحان کی وجہ سے لکھنے والا خود اپنے کو دھوکا دے جائے۔ اس حقیر نے اپنے تجزیہ نفس کی کوشش کی ہے۔ معلوم نہیں کامیاب ہوا ہوں یا نہیں۔ ملاحظہ ہو صفحہ 16۔ ''گو

میں انتہائی الخ" دوسری کوشش میری یہ رہی ہے کہ بغیر کھر و نچے لگائے بات کہہ جاؤں۔ افسوس ہے کہ اس میں مجھ کو پوری کامیابی نہ ہوسکی۔ خصوصاً مولانا شبلی کے معاملے میں گو میں نے بڑی ایمانداری کی کوشش کی ہے۔ مگر اس میں شاید میرا نفس شریک ہوگیا ہے۔ میں شبلی مرحوم کی اس روایت سے بہت جلا ہوا تھا جس میں انھوں نے حضرت علیؓ کے شراب پی کر نماز میں کچھ کا کچھ پڑھانے کا ذکر کیا ہے۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ مجھ کو بڑے واثق ذریعے سے معلوم ہوا ہے کہ مولوی سلیمان صاحب خود اس کو آئندہ ایڈیشن میں نکال ڈالنے کا ارادہ ظاہر کر چکے ہیں اور اس وجہ سے اس روایت کے کمزور ہونے کا یقین اور زیادہ ہوگیا ہے اس طرح میرے نفس کو موقع مل گیا کہ وہ مجھ کو سختی برتنے پر مجبور کردے۔ آخر میں عرض ہے کہ خدا کرے آپ سے دولت ہم کلامی حاصل ہو۔ رودولی میں ۱۱،۱۲؍ مارچ کو عرس ہے۔ اگر موقع ہو تو تشریف لائیے۔ بوڑھا آدمی ہوں۔ مرنے سے پہلے گھڑی دو گھڑی جناب کی صحبت میں اچھی کٹ جائیں۔ جلیس الخیر نعمۃ۔

بندہ محمد علی عفی عنہ

رودولی، ۴؍مارچ ۱۹۵۲

مکرر آنکہ اگر جناب کچھ لکھنے کی زحمت فرمائیں اور اس میں میری بیان کردہ خامیوں کا ذکر کریں تو مجھ کو برا نہ معلوم ہوگا۔

---

(۸۰)

علی ضامن[67] صاحب کے نام

بھائی ضامن صاحب زادمحبتہ، سلام شوق۔ آپ کا محبت نامہ آیا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے اندھیری رات میں سفر کر رہے ہیں اور دور کہیں چراغ دکھائی دے۔ چراغ حیات کی دلیل ہے جس کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ہمارا ہم جنس وہاں ہوگا۔ آدمی تو ماشاء اللہ ہر جگہ ہیں۔ خدا کی خدائی پڑی ہے لیکن بڑھاپے میں ایسے آدمی جنھوں نے خود ہمارے بہتر دن دیکھے ہوں کم رہ گئے ہیں ؎

تھا جن جن کو عشق کا آزار مر گئے
اکثر ہمارے ساتھ کے بیمار مر گئے

ایسا کوئی ہم عمر ہم جنس مل جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے جیسے جوانی لوٹ آئی۔ مگر یہ صرف لحظہ بھر کے لیے ہوتا ہے۔ جیسے اس وقت آپ کا خط دیکھ کر ہوا ورنہ یوں تو بھائی بدرل اور ہم اکثر پاس بیٹھے رہتے ہیں۔ مگر جوانی واپس آنا کیسا کافور کی بو بڑھتی جاتی ہے۔ بیماری حیرانی کا ذکر کرنا ایک دوسرے کو آئینہ دکھانا ہے۔ اس لیے اس ذکر کو چھوڑیے۔ "میرا مذہب" اور "کشکول محمد علی شاہ فقیر" حاضر ہیں۔ یہ دونوں کتابیں اتنی غلط چھپی ہیں کہ دل سے اتر گئیں۔ مگر پھر بھی پیاری ہیں۔ جیسے چیچک نکلنے کے بعد اولاد ہوتی ہے۔ منھ الٹا توا ہوگیا۔ ایک آنکھ پھوٹ گئی۔ چہرے پر آدھ سیر قیمہ بھرو تو جلد برابر ہو۔ مگر دل یہی کہتا ہے کہ بچوں کی نمائش میں شاید انعام بندہ زادہ ہی پا جائے۔

بھائی بدرل پاس بیٹھے ہیں۔ ہم لوگ خود اپنی درازی عمر کی دعا نہیں مانگتے بلکہ ایک دوسرے کی طول حیات چاہتے ہیں۔ کیونکہ جانتے ہیں کہ جہاں ایک کھسکا دوسرا بھی ٹک نہیں سکتا۔ لاحول و لاقوۃ الا باللہ۔ ہزار کوشش کرتے ہیں کہ بڑھاپے کا ذکر نہ آئے مگر قلم سے یہی باتیں نکلتی رہتی ہیں۔ لہٰذا اس خط کو نظیراکبرآبادی کے مصرع پر ختم کرتا ہوں

ع

اب بھی ہمارے آگے یار دجوان کیا ہے

بدرل اور ہم آپ کی باتیں اکثر کیا کرتے ہیں۔ ہم لوگوں کو یہ معلوم بھی نہ تھا کہ آپ مرادآباد میں ہیں کہ کج گاؤں میں کہ کلکتہ میں۔ لکھنؤ ایسا مرکز تھا جہاں سب مل لیتے تھے یا ایک دوسرے کا حال جان لیتے تھے۔ اب لکھنؤ جاؤ تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی غیر شہر میں وارد ہوئے ہیں۔

دعا گو

محمد علی عفی عنہ

۲۹ر مارچ ۱۹۵۲، ردولی

---

(۸۱)

ہاشمی صاحب کے نام

ردولی، اودھ ۱۰/اپریل ۱۹۵۲

ضاعف اللہ فضلکم۔ سلام مسنون اور اشتیاق دیدار۔ حادثۂ مفارقت پر میری دلی تعزیت قبول فرمایئے۔ میں بوڑھا ہوگیا ہوں۔ سرد و گرم زمانہ دیکھ چکا ہوں۔ مجھ کو آپ کی تکلیف کا اندازہ ہے کیونکہ شروع جوانی میں اسی طرح کی مصیبت میں مبتلا ہو چکا ہوں اور آپ کی تکلیف کا اندازہ کرسکتا ہوں۔ یہ معلوم کرکے کہ دوسرا بھی اس تکلیف میں ہے...... چین نہیں ہے۔ اگر کچھ تسکین ہو سکے تو ہمدردی بہ دِل و جان پیش ہے۔ رضاً بقصائہ و تسلیماً لامرہ کہنے سے کچھ مرہم سا ضرور رکھ جاتا ہے۔ مگر زخم کی گہرائی ویسی ہی رہتی ہے۔ پھر بھی بقول کارڈل نیوٹر جس چیز کا چارہ نہیں اس کو حکیمانہ نظر سے برداشت بھی کرنا پڑتا ہے۔ میں ناتجربہ کاری کے زمانے میں تعزیت اور پرسے پر ہنسا کرتا تھا۔ میری ایک لڑکی جو بہت دنوں سے بیمار تھی (اس کے علاوہ چار لڑکیاں اور بھی تھیں) وہ گزر گئی۔ صبح کو ایک صاحب تعزیت کو آئے۔ بے چارے کم سخن تھے۔ آکر چپ بیٹھ گئے۔ میں نے کہا ہاں تو پھر شروع کیجیے۔ بچی کیا بیمار تھی مجھ کو اطلاع بھی نہیں ہوئی۔ خدا آپ کو صبر دے۔ وہ بے چارے پریشان ہوگئے۔ اس کے بعد میرا اکلوتا لڑکا گزر گیا۔ اس واقعے کے بعد ایک دیہاتی جاہل ملاقاتی نے ہمدردی کی۔ عجب بھونڈے طریقے سے اس نے مجھ کو تسکین دی۔ مگر یہ معلوم ہوا کہ جیسے زخم پر کسی نے مرہم رکھ دیا۔ اس نے کہا ''وہ لڑکا تمھارا تھا ہی نہیں۔ اگر تمھارا ہوتا تو تمھارے پاس رہتا نا۔ وہ جس کا تھا اس نے لے لیا۔ تم کیوں رنج کرتے ہو؟ ہاشمی صاحب! اِس وقت بھی وہ زخم ہرا ہے اور اِس وقت بھی وہ مرہم اپنا کام کر رہا ہے۔ اس کے بعد سے میں ہر پہلو سے تعزیت کی قیمت سمجھنے لگا اور اسی وجہ سے یہ صفحہ سیاہ کیا کہ شاید دلی ہمدردی غم میں کچھ افاقہ کرے۔ ارحم الرحمین آپ حضرات کو صبر دے۔ آمین!

اب کی بار لکھنؤ آنے پر دولت ہم کلامی حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔

محمد علی عفی عنہ

خواجہ غلام السیدین[68] کے نام

ضاعف اللہ فضلکم۔ دعا اور تسلیم۔

اے وقت تو خوش کہ وقتِ ما خوش کردی

اکثر حضرات کے خطوط ہوتے ہیں۔ جیسے عرضی دعویٰ یا جواب دعویٰ۔ کبھی کبھی ایک آدھ خط ایسے بھی آجاتے ہیں کہ جن میں نصف ملاقات کا مزہ ہوتا ہے۔ یہ خطوط ویسے ہی کمیاب اور نادر ہوتے ہیں۔ جیسے خود ایک صاحب ہیں جن کو خواجہ غلام السیدین کہتے ہیں۔ علم تو خیر بڑی چیز تھی لیکن وہ تو لغت میں بھی نکل آتا ہے اور مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی میں بھی ہے مگر دل جس چیز کو ڈھونڈھا کرتا ہے وہ چیز اور ہے۔

ہم کو آدمی کی ہے جستجو وہ
کتابیں عبث منگاتے ہیں

لیجیے اس شعر نے ڈاکٹر عابد کو یاد دلایا ''کشکول'' اور ''میرا مذہب'' میں نے آپ ہی کے ساتھ ڈاکٹر عابد صاحب[69] کو بھی بھیجا تھا۔ ان کا بھی جواب نہیں آیا۔ یہی دونوں کتابیں اشفاق کو بھی بھیجی تھیں۔ کل ان کا خط محبی ڈپٹی بدرالحسن صاحب کے پاس آیا۔ جس سے پتہ چلا کہ ان کو بھی نہیں پہنچیں۔ اشفاق نے میرے محرم چھوڑنے پر سخت گرفت کی تھی۔ اس لیے میرا مذہب ان کو خاص کر کے بھیجا تھا اور ''کشکول'' تو صرف برائے بیت تھی۔ آپ دونوں آدمیوں کو اصل میں کشکول بھیجی تھی اور میرا مذہب تو صرف اس لیے بھیجا تھا کہ اگر میں نے دس بیس کتابیں لکھی ہوتیں تو وہ سب بھیجتا اور بھیجتے وقت دل میں کہتا کہ ''پھول وہی ہے جو ہمیشہ سر چڑھے''۔

خواجہ صاحب تکلیف کر کے انیس سلمہا[70] کو فون کر کے دریافت کر لیجیے کہ وہ کتابیں کیا ہوئیں۔ کشکول میں نے بیچ ڈالی اور ''میرا مذہب'' کوئی مول نہیں لیتا۔ لیکن

آپ کا خط آنے کے بعد پھر سے پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ خواجہ صاحب یقین مانیے گا۔ آپ اور ڈاکٹر عابد کو دیکھنے کو آنکھیں ترس گئی ہیں۔

یارب اماں دہ تا بازبیند
چشم محباں روئے حبیباں

دعا گو

محمد علی عفی عنہ، ردولی

۱۵راپریل۱۹۵۲

---

(۸۳)

سبط اور قمر کے نام

یار سبط اور قمر دعائیں قبول کرو۔ تم لوگ ماشاء اللہ کام کرنے والے لوگ ہو۔ خدا نے چاہا تو دنیا میں نام کروگے۔ مخلوق کی خدمت کر کے خدا کو خوش کروگے۔ ہم بڈھے ناکارے نہ دین کے نہ دنیا کے سوا تم لوگوں کے لیے دعا کرنے کے اور کس کام کے ہیں۔ جب تم لوگوں کی یاد ستاتی ہے تو ایک سلسلہ قائم ہو جاتا ہے۔ جو بڑی دیر تک چلا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ پھر بھی طولانی نہیں ہوتا، لیکن چونکہ تم سے ہر آدمی کے پاس ذری دیر تک بیٹھا رہ جاتا ہوں اس لیے وقت اچھا کٹ جاتا ہے۔ اکثر تو یہ ہوتا ہے کہ باتیں کرنے میں نماز کا وقت تنگ رہ جاتا ہے۔ کبھی یہ ملاقات کا سلسلہ تم سے شروع ہوتا ہے کبھی کسی دوسرے سے لیکن جب شروع ہو جاتا ہے تو پورا چکر لگانا پڑتا ہے۔ جیسے کسی نوجوان ڈاکٹر کا ذکر آ گیا تو سب سے پہلے سبط سے ملاقات ہوتی ہے۔ اگر کہیں فارن لیگیشن کا ذکر آ گیا تو سلمان سے باتیں ہونے لگتی ہیں۔ نیکی، نیک دلی کا ذکر آ گیا تو ہم اپنی لڑکی چھبن کے پاس کراچی پہنچ جاتے ہیں۔ اگر کہیں بچوں کی تعلیم و تربیت کا ذکر آ گیا تو لاہور میں ہما سے باتیں کرنے لگتے ہیں۔ مسئلہ مسائل کا ذکر آ گیا تو اپنے بھتیجے مولوی عابد کی جھلک دیکھ لیتے ہیں۔ کسی پڑھی لکھی لڑکی کا سامنا ہو گیا تو قمر کو پاس بیٹھا پاتے ہیں اور گھنٹوں باتیں ہوا کرتی ہیں۔ یہ نہ سمجھنا کہ صرف خاص ہی خاص لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا ہے بلکہ تم لوگوں کی صحبت میں پہنچتے ہی اکثر یہ ہوتا ہے کہ اور بہت سے لوگوں سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ جب قمر سے باتیں ہونے لگتی ہیں تو میاں سبط کا انگریزی داں باورچی ضرور ملتا ہے۔ کھانے کا وقت نکل گیا ہے۔ بے چاری آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی ہیں۔ ڈرائنگ روم میں اکیلے بیٹھے بیٹھے دل گھبراتا ہے تو اٹھ کر باورچی خانے چلے جاتے ہیں۔ وہاں کیا دیکھتے ہیں کہ بی قمر ترکاری بھون رہی ہیں اور انگریزی داں باورچی صاحب نے ابھی آٹا بھی

نہیں ساتا ہے۔ ہم زبان حال سے قمر سے کہتے ہیں کہ آخر ایسے باورچی کے رکھنے سے کیا فائدہ؟ وہ ہنسنے لگتی ہیں کہ اتنے میں تمھاری آواز میڈیکل کالج سے آتی ہے کہ کھانا تو ضرور دیر میں پکاتا ہے مگر انگریزی جانتا ہے اس لیے اس کو نکالنے کا نام نہ لیجیے اور جو حکم دیجیے ہم میاں بی بی دل و جان سے آپ کا حکم ماننے کو تیار ہیں۔

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

ہم بڈھے ہوگئے ہیں۔ گو ابھی چلے جاتے ہیں مگر کب تک۔ تم لوگوں کا خیال آتا ہے تو جی میں للک سی اٹھتی ہے کہ تم میں سے جس سے ملاقات ہوجاتی غنیمت ہوتا۔ پھر دل کو سمجھا لیتے ہیں کہ اگر نہ بھی ملاقات ہوگی تو کیا ہرج ہے۔ جب تک تندرست ہیں کسی نہ کسی طرح دل بہل ہی جاتا ہے۔ جب دم نکلنے لگے گا تو اس وقت کسی کی یاد تھوڑا ہی ستائے گی۔ بس خالی اتنی خواہش ہے کہ جب تک اس دنیا میں ہیں تم سب کی نسبت اچھی ہی اچھی باتیں سنتے۔ قیصر تم دونوں کو دعا کہتی ہیں۔

تمھارا

محمد علی عفی عنہ

ردولی، اودھ

۲۷راپریل ۱۹۵۲

---

(۸۴)

مرزا محمد وصی ایڈووکیٹ کے نام

عزیزی وصی میاں، دعا! آپ جس وقت چاہئے تشریف لائیے۔ ہم لوگوں کو دلی خوشی ہوگی۔ البتہ ان گرمیوں میں آپ لوگوں کو تکلیف ضرور ہوگی۔ زمینداری جانے کی وجہ سے نہال اقبال میں دیمک ضرور لگ چکی ہے اور گھڑی گھڑی ترقی کرتی جاتی ہے۔ مگر غریبی اور بے سروسامانی کی وجہ سے محبتیں کم نہیں ہوجاتیں۔ مثلاً یہ کہ 1952 بعد از حضرت عیسیٰ پہلا سال ہے کہ میرے یہاں پنکھا قلی نہیں ہے۔ ہزار کوشش کی کہ مل جائے، مگر حاجی بغلول مرحوم کی گھوڑی کی طرح اگر جانورر پسند آیا تو دام پسند نہ آئے اور اگر دام پسند آئے تو گھوڑا ناپسند ہوا۔ بغیر پنکھا قلی کے بھی زندگی کے دن پورے ہورہے ہیں۔ صفیہ بیگم سلمہا اور بچوں کو دیہات کی سیر کرواتے اپنے ہاتھ سے مٹر کی پھلیاں توڑی جاتیں، بوٹ توڑے جاتے۔ اس خالی فصل میں سب کھیت خالی پڑے ہیں۔ آم کا آسرا تھا وہ بھی ٹوٹ چکا۔ خالی محبت باقی ہے۔ وہ مرتے دم تک رہے گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ آم تو کمیاب ہیں مگر فصل پر کچھ نہ کچھ کھانے کو مل جائیں گے ہی۔ اگر چور لوگ آم کے باغوں میں ہم سے پہلے نہ پہنچ گئے۔ ان تمام باتوں کا حاصل یہ ہے کہ ایک پوسٹ کارڈ پہلے سے بھیج دیجیے اور تکلیف اٹھانے پر کمر ہمت باندھ لیجیے۔ پھر گھر آپ کا ہے۔ اور آپ لوگوں کو یہاں دیکھ کر مجھ کو خوشی ہی ہوگی۔ ہمارے مرزا صاحب تو ہیں نہیں مگر گل نہیں گل کی نکہت ہی سہی۔ صفیہ بیگم سلمہا کو اور بچوں کو میری اور قیصر کی دعا۔

محمد علی عفی عنہ

ردولی، یکم مئی ۱۹۵۲

ہما بیگم کے نام

ردولی ۷؍مئی ۱۹۵۲

میری جان، دعائیں حاضر ہیں!

رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ واقعی میرے دل میں درد اٹھا ہے اور حکیم ڈاکٹر چارپائی کے اردگرد گھوم رہے ہیں بلکہ صرف شاعرانہ پہلو سے درد ہو رہا ہے۔ تم کو تو کچھ لکھتے بھی ڈر معلوم ہوتا ہے کیونکہ تم سے کوئی مصیبت بیان نہیں کی کہ تم نے توکل کا راستہ دکھانا شروع نہیں کیا۔ حاجی ذاکر حسن مرحوم نے پیروی جناب امیرؑ میں اپنا کھانا اٹھا کر فقیر کو دے دیا اور غضب یہ کیا کہ روایت کی پوری پیروی کے شوق میں گھر بھر کا کھانا اٹھا کر دے دیا۔ دوسرے وقت بھی یہی کیا۔ اب تو لڑکے بہت بے چین ہوئے۔ وہ کہتے تھے ابا بھوک لگی ہے۔ اور حاجی صاحب کہتے تھے کہ بیٹا کہو اللھم صل علی محمد و آل محمد۔ جب وہ پھر رو رو کر کھانا مانگتے تھے تو زائر صاحب فرماتے تھے بیٹا کہو لا الہ الا اللہ۔ وہ غریب سمجھتے تھے کہ اب کی ضرور پیٹ کی کھرچن کم ہو جائے گی۔ جب اِس سے بھی کچھ نہ ہوتا تھا اور وہ پھر کھانا مانگتے تھے تو فرمایا جاتا تھا بیٹا کہو الحمدللہ! نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ لڑکے زبانِ حال سے کہتے تھے۔ بھاڑ میں جائے یہ سب کچھ ہم کو بھوک لگی ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم بھی اپنے توکل کی تلقین سے مجھ سے بھی کوئی کلمۂ کفر کہلانے پر تلی بیٹھی ہو۔ تم تو اس رنگ میں ہو اور بی کجن کو دیکھو وہ کراچی میں بیٹھی بیٹھی تحریر فرماتی ہیں کہ میاں جان میں نے سنا ہے کہ تم بہت بڈھے اور دبلے ہو گئے ہو۔ پوچھو بڑھاپے میں کوئی دبلا اور بوڑھا نہیں ہو جاتا تو کیا مسیں بھیگتی ہیں۔ جوانی میں ہمیشہ پہاڑ پر جاتے تھے۔ سال بھر کی

تندرستی کا سامان جمع کر لیتے تھے۔ اب کی سال یہ ہے کہ پنکھا قلی بھی نصیب نہیں ہوا۔ زمیندار مقدمہ ہار گئے۔ انتہائی پہلی جولائی تک سب قصہ پاک ہو جائے گا۔ میں نے بہت دن ہوئے حافظ میں فال دیکھی تھی۔ انھوں نے فرمایا تھا علاقے ضرور جائیں گے ۔

آں جامۂ کہ بود درو بوئے یوسفم
ترسم برادران غیورش قبا کنند

پھر میں نے اپنے لیے فال دیکھی تو انھوں نے کہا تھا ۔

بے خبرند زاہداں نقش بخواں و لاتقل
مست ریاست محتسب بادہ بنوش و لاتخف

پہلی فال تو مہینے بھر میں پوری ہوتی دکھائی دے رہی ہے۔ دوسری فال اسی طرح پوری ہو سکتی ہے کہ میں پہلی جولائی کے پہلے ہی چل دوں۔ دیکھو کیا ہوتا ہے۔

دعا گو

تمھارا باپ عفی عنہ

---

(۸۶)

حسن عباس کے نام

نورچشم من، دعا! تمھارا رقعہ موصول ہوا، طمانیت ہوئی۔ یہ سن کر اور دل خوش ہوا کہ رمضان شریف یہیں گزارو گے۔ آج کل زمینداری جانے کی وجہ سے ہر طرف مایوسی ہی مایوسی دکھائی دیتی ہے۔ اگر تسکین ہوتی ہے تو صرف ہمدردی کا خط پا کر یا ان سے بات کر کے۔ میں زندہ ہوں اور تندرستی بحمداللہ ...... ہے۔ خدا کرے تم اچھے ہو۔

قیصر دعا کہتی ہیں

دعا گو

محمد علی عفی عنہ

۱۲رمئی ۱۹۵۲

(غیر مطبوعہ)

---

(۸۷)

نواب عسکر یار جنگ صاحب حیدرآباد کے نام

جمیل المناقب دامت اعطاءکم۔تسلیمات! کتابیں موصول ہوئیں۔ یہ آپ نے کچھ اچھا نہیں کیا۔ اب آپ کے جس نیازمند کو ضرورت ہوگی ایک دیۂ پارۂ کاغذ، تین پیسے کا پوسٹ کارڈ لکھ مارے گا اور آپ کو ممکن ہے اس سے بھی زیادہ زحمت اٹھانی پڑے جو ان کتابوں میں اٹھانی پڑی۔

گل و گلچیں کا گلہ بلبلِ خوش لہجہ نہ کر
تو گرفتار ہوئی اپنی صداقت کے باعث

اس میں چنداں آپ کا بھی قصور نہیں۔ یہ افتادِ طبع یعنی دوسروں کی کاربرآری کے جذبے پر موقوف ہے۔ جیسے گنگا جی فیض پہنچاتی ہیں اور کسی پر احسان نہیں رکھتیں۔عرفی کا شعر ہے ۔

اقبال کرم می گزد ارباب ہمم را
ہمت نخورد نیشتر لا و نعم را

اس کے یہ معنی بتائے جاتے ہیں کہ ارباب ہمم کسی کا احسان نہیں لیتے۔ میں اس کے معنی یہ کہتا ہوں کہ اربابِ ہمت احسان کرکے اپنے دل میں یہ نہیں لاتے کہ ہم نے یہ احسان کیا ہے یا نہیں کیا ہے۔ وہ گنگا جی کی طرح دینا فطرت کے یہاں سے لائے ہیں۔ ان کے یہاں ''میں نے دیا'' یا ''میں نے نہیں دیا'' کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس کو ''ہاں'' اور ''ناں'' کا effort کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ یہی حال گنگا جی کا ہے اور یہی حال عسکری حسن صاحب کا۔

میں نے اس کو کئی بار محسوس کیا ہے۔ مثالاً عرض کردوں۔ باوجود بیماریوں کے دوستوں کی خاطر ہندستان بھر کی دوڑ لگانا، باوجود مصروفیت کے ڈاکٹر حسین ظہیر کے گھر کے

چکر لگانا، سب اسی ذیل میں آتے ہیں۔ روزہ بیماری میں قصر ہے۔ دوست مومن کی زیارت کے لیے جانے میں بھی ہے۔ روزی کے لیے قصر سمجھ میں آتا ہے۔ بیماری کے لیے سمجھ میں آتا تھا مگر دوست مومن کی زیارت والا قصر صرف آپ کو دیکھ کر سمجھ میں آیا۔ ع

دل بدست آور کہ حجِ اکبر است

اب اسی سلسلے میں دو باتیں ''میرا مذہب'' کے متعلق بھی سن لیجیے۔ ہمارے یہاں ایک ہمارے عزیز رہتے تھے چودھری کرم حسین ان کے بیٹے تھے چودھری اقبال حسین مرحوم۔ ان کو ایک دوست کے خلاف گواہی دینی پڑی جو ان کے محسن بھی کہلاتے تھے۔ لوگوں نے کہا ''اقبال کرم میگزد ارباب ہمم را۔'' عرفی نے پہلے ہی کہہ رکھا تھا کہ میاں اقبال حسین ولد کرم حسین لوگوں کو کاٹ کھاتے ہیں۔

میری کتاب کے اوپر بھی اسی قسم کی رائے زنیاں ہو رہی ہیں۔ خلاف اور موافق لیکن جیسی صداقت کی کھنک آپ کے خط میں تھی کہیں نہیں دیکھی۔ عصمت کے بارے میں آپ نے مجھ سے پورا اختلاف کیا ہے لیکن سچائی کی آن دل میں جگہ کیے ہے جو کچھ دل میں تھا وہ کاغذ پر آ گیا۔ یک درگیر و محکم گیر کو کوئی پسند کرے یا نہ کرے مگر عقیدت کا استقلال ظاہر ہوتا ہے۔ کتاب صلاح کار حاضر خدمت ہے اور سوا ترقی جاہ و ایمان کے کیا عرض کروں۔ ہم لوگ زندہ ہیں اور چلے جا رہے ہیں۔ زمینداری بھی چلی جا رہی ہے۔ دنیا بھی چلی جا رہی ہے ع

ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا!

عقیدت کیش

محمد علی عفی عنہ، رودولی

۱۴ر مئی ۱۹۵۲

---

(۸۸)

میجر سید ابوجعفر کے نام

جناب میجر سید ابوجعفر صاحب خان بہادر کلکتہ۔ صاحب خلقِ عظیم کے امتی سید ابوجعفر صاحب کو سلام شوق پہنچے۔ واللہ میجر صاحب یہ نہ شرط انصاف نہ شرف دوستی۔ اپنے میٹھے بولوں سے آپ کیا کرنے پر تلے ہیں۔ میں بوڑھا خرف، بڈھا اور بالا برابر۔'' سٹھیا گیا ہوں بچوں کا ایسا بھولا پن پھر سے آگیا ہے اور آپ میری حالت سے فائدہ اٹھا کر مجھ کو پھر سے شیعہ کرنا چاہتے ہیں۔ آخر اس سے آپ کو کیا فائدہ ہوگا۔

کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری

اللہ میاں نے آپ کی زبان میں نرمی، آپ کے قلم میں اثر اسی واسطے دیا تھا کہ آپ میرے ایسے نادان پر ہاتھ صاف کیجیے اور مجھ کو مسلمان سے پھر شیعہ کر لیجیے اور تو اور ذری اس بات پر غور کیا ہوتا کہ ابھی ابھی چار پانچ سو روپیہ لگا کر ''میرا مذہب'' چھپوایا ہے۔ اگر میں شیعہ ہوگیا تو اس رقم پر پانی پھر جائے گا۔ مگر نہیں آپ مانیں گے نہیں۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ آپ دم نہ لیں گے۔ حاضری کے دسترخوان پر بٹھا کر آپ مجھ سے اَن کہی کہلا کر دم لیں گے۔ اچھا میجر صاحب ہمارے آپ کے درمیان صلح ہوجائے۔ شرائط حسب ذیل ہیں:

۱۔ میں محمدؐ و آل محمدؐ پر دل و جان سے قربان ہوں۔

بصدق وصفا گشتہ بیچارہ جامی!
غلام غلامانِ آلِ محمدؐ

آپ نام بنام تبرّا چھوڑ کر صرف دشمنان محمدؐ و آل محمدؐ سے بیزاری کیجیے اور اس کی پروا بالکل نہ کیجیے کہ ٹوپی کس کے سر پر سج گئی۔

شراب لعل کش و روئے مہ جبیناں بیں
خلاف مذہب آناں جمال ایناں بیں

دل میں بھی صرف دشمنانِ محمدؐ و آلِ محمدؐ کا خیال آوے۔

2۔ میں آپ کا خط بھائی بدرل کو نہ دکھاؤں اور آپ مجھ کو بڑے بڑے خطوط اکثر لکھ کر نصف ملاقات کا لطف بخشا کریں۔ اور آپ یہ سلسلہ جب ختم کر دیں تو آپ کا خط بھائی بدرل کے آگے رکھ کر جتنی اشتعال انگیز باتیں کہہ سکوں کہوں۔

آپ نے تحریر کیا ہے ''اچھا جناب آپ نے میرے اس کہنے پر برا کیوں مانا کہ آپ تقیہ کر رہے ہیں۔'' آپ کے اسی گمان پر تو سر دھنتا ہوں کہ آپ بات اس انداز سے کہتے ہیں کہ بری لگتی ہی نہیں۔ بیان میرا بگڑ گیا ہوگا ورنہ آپ کی بات اور بری لگے؟ تقیہ کے اوپر جو کچھ مجھ کو کہنا تھا کہا، میں عرض کر چکا اگر مجھ کو پھر سے لکھنے کا موقع دیا جائے تو بھی شاید کچھ اضافہ نہ کر سکوں۔ البتہ بہت سی باتیں شیعہ اور سنی کی چھوڑ گیا ہوں۔ تاکہ مطلب حاصل ہو جائے اور تکلیف کم سے کم پہنچے ورنہ بہت سی باتیں لکھ سکتا تھا۔ مثلاً صحیح بخاری کی بعض لغو احادیث یا ذاکرین کی لغو بکواس اسی ذیل میں بند بات بھی آتی ہے کہ تقیہ کا غلط استعمال اور تبرا یہ دونوں ایسی مشکل راہیں ہیں کہ جن میں ذرا سا پاؤں ڈگ گیا آدمی منھ کے بل آرہا اور زندگی دوہری ہوگئی۔ ایک وہ جو صرف اپنے فرقے والوں کے بیچ میں ہوسکتی ہے اور دوسری وہ جو ملی جلی صحبت میں ہوتی ہے۔ یہ بڑے غضب کی بات ہے خدا اسے بچائے sincerity ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ چاہے بندے سے واسطہ ہو چاہے خدا سے۔ دوہری زندگی کسی کو نہیں پسند۔

آپ نے بیگم صاحبہ کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ خدا کرے موصوفہ ویسی ہی اچھی ہوں جیسی آپ چاہتے ہیں۔ آمین! اگر مرزا آگئے ہوں تو ان سے میرا سلام کہیے گا۔ آم اب کی سال یہاں کم ہیں اس لیے مجھے امید ہے کہ مرزا جب آم کھانے بیٹھے ہوں گے تو پہلے ہماری روح پر فاتحہ پڑھ دیا ہوگا...... بھائی بدرل کا سلام نہیں لکھ رہا ہوں اس وجہ سے کہ ان سے اس خط کا ذکر اشارتاً و کنایۃً کبھی نہیں آیا۔

محمد عفی عنہ

۱۹/جون ۱۹۵۲

---

(۸۹)

جناب ایڈیٹر صاحب ''نقوش'' کے نام

جناب من تسلیم! حضرت کا خیال ہے کہ میں نے مضمون لکھنے میں پہلے عذر کیا تھا یہ نخرہ نہ تھا بلکہ بڑھاپا۔ گرمیاں، زمینداری جانے سے فقیری کا دھڑکا سب نے مل کر حواس باختہ کیے تھے۔ اب اس کے بعد تصویر کی فرمائش کچھ مشکوری کا جذبہ ایسا ابھر آتا ہے کہ دل چاہتا ہے کہ بڑا سا خط لکھو۔ اس وقت بادل گھرے ہوئے ہیں۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ اس لیے طبیعت ذرا مزے میں ہے۔ آپ نے مضمون اس اصرار سے مانگا تھا اور تصویر بھی طلب کی ہے کہ انانیت اور اوچھاپن راضی ہوگئے۔

مرد فربہ شود از راہ گوش!

اس بڑھاپے میں میرے بچے سب دور دور جا پڑے۔ ان کے کہنے سے یہ تصویر کھنچوائی تھی ورنہ اس سن میں تصویر کھنچوانا کیسا۔ آئینہ دیکھ کر غصہ چڑھ آتا ہے۔ اڑسٹھ برس دو مہینے کے سن میں ۱۷ جولائی ۱۹۵۱ کو یہ تصویر کھنچوائی تھی۔ اور حسب ذیل عبارتیں لکھ کر مختلف بچوں کو بھیجی تھی:

۱۔ یہ تمھارا باپ ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔
2۔ پیری و صد عیب می گفتند۔
3۔ یہ تصویر میری نہیں ہے۔ میں اتنا بوڑھا اور بدصورت کیسے ہوسکتا ہوں۔
4۔ جو کچھ خدا دکھائے وہ ناچار دیکھنا۔
5۔ بڑھاپے کی مسکراہٹ جوانی کا ماتم۔

جو تصویر آپ کو بھیج رہا ہوں اس پر بھی کچھ لکھنے کو دل چاہتا ہے۔ ''ہم امید لگائے تھے کہ چہرے کی شکنیں، جلد کا اتو جلد ختم ہو جائیں گی۔ مگر ''نقوش'' کے ہاتھوں ہم ''ڈورین گرے'' ہوکر رہ گئے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ آسکر وائلڈ کا ہیرو ''ڈورین گرے'' جو جو آوارگی

سیاہ کاریاں کرتا تھا ان سب کا اثر بجائے اس کی صورت کے اس کی تصویر پر پڑ جاتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے اپنی تصویر دیکھ لی اور اس کو اس قدر نفرت ہوئی کہ اس نے تصویر کو خنجر سے چاک کر دیا۔ تصویر جیسی کھنچی تھی ویسی رہی ہوگی اور ڈورین سینہ چاک ہوکر اسی وقت مر گیا۔ یہ نہ خیال کیجیے گا کہ داد طلبی کے لیے۔ انکساری کی کٹیا لگا کر تعریفوں کی مچھلیاں پکڑ رہا ہوں بلکہ واقعہ بیان کر رہا ہوں۔ میرے اوپر بڑھاپے کا اثر شروع ہوگیا ہے۔ سٹھیاناپن قبضہ کرتا جارہا ہے۔ حسِ استہزا کم ہورہا ہے اس کی وجہ سے بعض اوقات احساسِ کمتری بڑھ جاتا ہے اور کچھ لکھتے وقت ڈر لگا رہتا ہے کہ جن باتوں پر ہم دوسروں پر عبرت کرتے رہتے تھے وہی دن ہم کو دیکھنا پڑا۔ اظہارِ مشکوری میں اپنی کتابیں جو موجود ہیں بھیجتا ہوں۔ بعض ہیں جو ناپید ہیں۔ نہیں تو داد طلبی کے شوق میں وہ بھی حاضر کرتا۔

آپ کے یہاں مولویوں کی تباہ کاریاں زور پکڑ رہی ہیں۔ اس کا انسداد کچھ کیجیے گا ورنہ آپ کو بھی وہی روزِ بد دیکھنا نصیب ہوگا جو ایران، افغانستان وغیرہ کا ہے۔

مشکور عنایت

محمد علی

۷ر جولائی ۱۹۵۲، ردولی

۹۰

ہما بیگم کے نام

ردولی!

میری جان دعا! تمھارا کراچی والا خط ملا۔ خدا کرے رتی کا بچہ اچھا ہو اور اچھا رہے۔ آمین! تمھارے خط سے دل کو آرام ملتا ہے۔ ہما بیگم! ایک کتاب ہے ''پیغمبر'' کوئی شخص ہیں خلیل جبران وہ مصنف بھی ہیں اور مصور بھی۔ قصہ یہ ہے کہ پیغمبر المصطفیٰ کسی شہر میں رہتا تھا۔ گیارہ بارہ برس کے بعد اس کے وطن کا جہاز اس کو لینے آیا ہے۔ وہ سب سے رخصت ہو رہا ہے۔ شہر بھر جمع ہے اور اس سے مختلف لوگ درخواست کرتے ہیں کہ ہم کو مختلف باتوں پر کچھ بتاتے جائیے۔ کوئی زراعت کے اوپر سوال کرتا ہے کوئی شادی کے اوپر، کوئی بچوں کی تعلیم کے اوپر اور کوئی دوستی پر وغیرہ وغیرہ۔ وہ سب کو بتاتا ہے۔ چنانچہ دوستی پر ایک نوجوان نے پوچھا۔ اس کے خیالات کا ترجمہ میں نے اردو میں کر ڈالا۔ کیونکہ اس میں مجھ کو آفاق اور اپنی دوستی کی پوری تصویر دکھائی دی ہے۔ وہ ترجمہ میں تم کو بھیجتا ہوں۔

المصطفیٰ سے ایک نوجوان نے کہا ''دوستی کے اوپر کچھ فرماتے جائیے۔''

المصطفیٰ نے ارشاد کیا ''تمھارا دوست تمھاری دعا ہے جو قبول ہوگئی۔ وہ ایسا کھیت ہے جس میں تم محبت کا بیج بوتے ہو اور اس کی پیداوار سے کھلیان ایسا بھر جاتا ہے کہ جی سے الحمدللہ رب العلمین نکلتا ہے۔۔ دوست تمھارا وہ دسترخوان ہے جس پر بھوکی روح سیر ہو جاتی ہے اور تمھارے گھر کا وہ کونہ ہے جہاں بیٹھ کر ایسا سکون ہو جاتا ہے کہ دل سے شکرگزاری کی لے نکلتی ہے۔ دوست جب بولتا ہے تو تم کو یقین رہتا ہے کہ خود تمھارے دل کا تار بھی اسی سر میں سانس دے گا۔ اسی کے ساتھ تمھارے دل کی جواری بھی کھل جاتی ہے۔ جب تم دونوں چپ بھی رہتے ہو تب بھی دونوں تاروں کی گونج ملی ہوئی رہتی ہے

اور دونوں دلوں کی لَے بے تابی نہیں ہوتی کیونکہ دوستی میں تمام خیالات، تمام خواہشیں، تمام تمنائیں جوڑواں پیدا ہوتی ہیں اور بن مانگے دونوں کے منہ میں ایک ایک چھاتی آجاتی ہے۔ دونوں جو ملے تھے وہ گود کے دو حصوں میں پہنچ جاتے ہیں مگر پھر بھی علیحدگی کا گمان بھی نہیں ہوتا۔ جدائی ہوئی تو مگر بچھڑے کہاں۔ ماں کے چہرے میں دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں۔ اپنا اپنا تماشا بھی کیے جاتے ہیں اور ماں کی آنکھوں میں اپنا اپنا تماشا دیکھتے جاتے ہیں۔ ہاں مگر یہ یاد رکھنا کہ کوئی غرض بیچ میں نہ آنے پائے نہیں تو روح کی گہرائیاں اوتھلا پانی ہوکر رہ جائیں گی۔ محبت تو اس لیے بنی ہے کہ دوست کے دل کی تہہ میں پہنچ کر موتی نکال لائے۔ اگر اس میں کوئی اور غرض شامل ہوگئی تو اس جال میں گھونگھے ہی ہاتھ لگیں گے۔ جو بہتر سے بہتر تمھارے دل کے اندر ہے وہ دوست کا ہے۔ اس کو دل کے کنارے بٹھا کر اپنے جوار کی بھی سیر دکھاؤ اور بھاٹے کی بھی۔ دوستی اس لیے نہیں ہوتی کہ تم دونوں بیٹھ کر وقت کا گلا گھونٹو...... دوستی اس لیے ہوتی ہے کہ روحانی زندگیاں بڑھ جائیں کیونکہ دوست کا کام خلا میں اڑان بھرنے کا نہیں ہے بلکہ تمھارے بازوؤں میں قوت پرواز بڑھانے کا ہے۔ مل کر ہنسو بھی، مل کر خوش بھی رہو، کیونکہ یہ ہنسی یہ خوشی وہ شبنم کے چھوٹے چھوٹے قطرے ہیں جن میں دل کو صبح والی تفریح حاصل ہوتی ہے۔ صبح والی تازگی ملتی ہے۔''

دونوں مرثیے بھیجتا ہوں۔ یہ مرثیے مکمل نہیں ہیں۔ جتنے سوزخوانی میں پڑھے جاتے ہیں وہی ہیں۔

ہما! خدا تم کو زندہ سلامت رکھے۔ تمھارے خطوط آتے ہیں، زخموں پر ٹھنڈا پھایا ہوجاتے ہیں۔ صلاح الدین سے ہمارا سلام کہنا۔ آج کل محبوب عالم وہیں ہیں۔ ان سے بھی سلام کہنا۔ کرنل سلامت اللہ سے بہت بہت سلام کہنا اور کہنا کہ ملاقات تو ہوگی نہیں مگر آپ دل سے اب بھی اتنا ہی قریب ہیں۔ ہم بدقسمت، دوستوں کا دیدار نہیں دیکھ سکتے۔

دعا گو

تمھارا باپ عفی عنہ

۱۱رنومبر ۱۹۵۲

مکرر آنکہ ایک نوکر ہے بالا۔ قوم کا پاسی، وہ ہمارے یہاں ملازم تھا۔ اس کو نئے انتظام میں اوپس چالیس روپے مہینہ پر اس لیے نوکر رکھ رہے تھے کہ گورنمنٹ کی طرف سے روپیہ تحصیلے اور محمد علی کے یہاں نوکر نہ رہ جائے۔ میرے کہنے سے وہ راضی ہوگیا۔ مگر رات کو اس نے غور کیا کہ چودھری صاحب کے ساتھ بے وفائی ہورہی ہے۔ اس لیے اس نے انکار کردیا۔ اور کہہ رہا ہے اگر تم نہ رکھو گے تو میں کسی طرف نکل جاؤں گا۔ مجھے تمھارے یہاں کے نو روپے چالیس سے بہتر ہے۔ رات اس نے کھانا نہیں کھایا۔ صبح سے رو رہا ہے اور ہم لوگ بھی آب دیدہ ہیں۔ بی ہما بیگم یوں بھی ہوتا ہے۔

محمد علی

---

(۹۱)

ہما بیگم کے نام

ردولی ۳۱؍جنوری ۱۹۵۳

میری جان دعا! آج میرا ارادہ ہے کہ بیکار وقت گزاری کے لیے تم کو بڑا سا خط لکھوں جس میں کام کاج کی کوئی بات نہ ہو، لیکن لکھ کر میرا جی ہلکا ہوجائے۔ ہر وقت کی فکریں، ہر وقت کی ٹھوکریں، زمانے کے ہاتھوں ہر وقت کے کچوکے، زندگی ایک دوسری طرح کی ہوگئی ہے۔

اعصاب کا یہ حال ہے جیسے کبھی کا پڑا پڑایا ستار ہو اور تم یکبارگی اس کو اٹھا کر بجانا شروع کردو۔ ہر تار جھنن جھنن جھنن جھنن کرے۔ اور تم الجھ الجھ کر ساز کو ہاتھ سے رکھ دو۔ کھونٹیاں ڈھیلی جواری بند سندریاں ٹیڑھی، اونٹ رے اونٹ تیری کونسی کل سیدھی۔ یہ حال ہمارا ہے۔

یکم فروری: ممکن ہے عبارت سے بھی پتہ چلتا ہو۔ اگر نہ چلتا ہو تب بھی یقین جانو کہ ہماری عقل پر اچھا خاصا اثر پڑ چکا ہے۔ انتظام اور اخراجات کے بارے میں کچھ زیادہ لکھنا نہیں چاہتا۔ ایک روز بارہ بنکی میں نوشاد سے ملاقات ہوئی۔ پرانے تعلقات کی بنا پر وہ میری امداد کرنے کو تیار ہوگیا۔ آج کل وہ انتظام کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انتظام کوئی کیا کرے گا جیسے کسی گھر میں آگ لگے اور آگ بجھنے کے بعد چیزوں کا جائزہ لیا جائے کہ فلاں چارپائی کے پائے پٹی ابھی کام کے ہیں اور جو لچکا جل گیا ہے اس کی چاندی کچھ داموں بک جائے گی۔ سب سے زیادہ مشکل سوال جابر کا ہے اس کی خبرگیری کرنے والا سوا اللہ میاں کے اور کون ہے اور اللہ میاں کی مشیت نہیں معلوم۔ یہ کہہ دینا کہ ؏

کشتی خدا پہ چھوڑ دوں لنگر کو توڑ دوں

ٹھیک تو ہے اور ہر شخص یہی کرتا ہے۔ مگر ایسی مجبوری سے کرتا ہے کہ جیسے جنگل میں

راستہ ڈھونڈنا یعنی جس پر پڑتی ہے وہ ڈھونڈھنے کی کوشش تو کرتا ہی ہے مگر دل کو سکون نہیں ہوتا۔ البتہ اگر آدمی ہما کا ایسا ہوا کہ افرض امری الی اللہ کا قائل دل سے ہوا تو اس کو تو اطمینان ہے مگر بدقسمتی سے سب کا تو یہ حال نہیں۔

یکم فروری

اچھا چھوڑو ہمارا قصہ اور اپنی فکروں کو تھوڑی دیر کے لیے بھول جاؤ۔ جرمنی، آسٹریا، روم، انگلستان کے لطف بیان کرو۔ نجمن نے بھی لکھا تھا اور تم نے بھی کہ آج کل ماشاء اللہ کچھ تندرستی اچھی ہے اس وجہ سے دیکھنے کو دل چاہتا ہے۔ آنکھیں بند کر کے تم کو دیکھتا ہوں تو تمھاری وہی صورت سامنے آتی ہے۔ جو چیچک نکلنے کے ایک دن پہلے تھی اور ہم مگن ہو جاتے ہیں۔

صنما بروز چیچک بہ سرت قسم کہ آندم
بجمالے دیدہ بودم کہ تو ہم نہ دیدہ باشی

شعر نہیں بنا تو ٹھینگے سے مطلب تو سمجھ میں آ ہی گیا ہوگا۔

ہاں بٹی قرۃ العین حیدر سے ملاقات ہے، اگر ممکن ہو تو ان کو اور ان کی ماں کو ہماری دعا اور تسلیم پہنچا دو۔ اگر انھوں نے ہماری کتابیں نہ دیکھی ہوں تو ان کو بھجوا بھی دو۔ انھوں نے ''نقوش'' میں اپنے خطوط دیے تھے۔ اس میں ہماری بھی تعریف کی تھی۔ ان کے والد مرحوم کا نیازمند ہوں۔ شاید وہ بھی جانتی ہوں۔ پارسلوں کا حساب نہیں بنتا۔ نجے نے دو کتابیں ہم کو 13 رجنوری کو بھیجی تھیں۔ وہ اس وقت تک نہیں آئیں۔ اسی طرح ہم نے بہت سی کتابیں لندن اور پاکستان وغیرہ بھیجیں مگر ایک کی بھی باضابطہ رسید نہیں آئی۔ گو اکثر پہنچ گئیں اور بعض کا حال نہیں معلوم۔

ایک پرانا ناچنے والا تھا Nejensky وہ سڑی ہوگیا۔ اس نے سڑی پن میں ایک کتاب لکھی ہے۔ یہ خط اسی طرح کا ہے۔ نوشاد کو جب معلوم ہوا کہ تمھارا خط آیا ہے تو بہت خوش ہوئے۔ تمھارا بچپن ان کو یاد آ گیا۔ ان کا خط اسی لفافے میں شامل ہے۔ تمھارے بچوں کو دعا۔ قیصر دعا کہتی ہیں۔ جابر تسلیم کرتے ہیں۔

دعا گو، تمھارا باپ عفی عنہ

پرسوں شروع کیا اور آج یہ خط ختم ہوا۔

بیگم حبیب اللہ کے نام

جناب بھاوج صاحبہ دامت...... تسلیمات۔ آپ دہردون میں تھیں ورنہ حامل ہذا میتب عباس سلمہ کو لے کر میں خود حاضر ہوگیا ہوتا۔ یہ میرا بہت قریبی عزیز ہے اور ماشاء اللہ ہونہار ہے۔ مالی مشکلات ظاہر ہی ہیں۔ اس لیے امید ہے کہ آپ میری خاطر سے اس کی فری شپ کی درخواست پر سفارش فرما دیجیے گا۔ میں نے بیگم اعزاز رسول سلمہا کو بھی لکھا ہے اگر ذکر آئے تو موصوفہ سلمہا سے ہی کہہ دیجیے گا۔ میں آپ لوگوں کی زحمتوں سے واقف ہوں۔ لیکن اگر یہ غیر مستحق درخواست دہندہ ہوتا تو میری جرأت نہ پڑتی۔

ناچیز

محمد علی عفی عنہ

ردولی، ۱۹/ جولائی ۱۹۵۳

(غیر مطبوعہ)

---

(۹۳)

ہما بیگم کے نام

ردولی ۲۶؍جولائی ۱۹۵۳

ہما پیاری، دعا! تمھارا خط آیا تھا کہ خیریت لکھو۔ تم نے یہ بھی لکھ دیا تھا کہ اگر میاں جان نہ لکھیں تو قیصر خیریت کے دو حرف لکھ دیں۔ اس خط کا جواب یاد نہیں کہ گیا یا نہیں۔ صرف اس قدر یاد ہے کہ ادھر دس پندرہ دنوں سے ایک کیفیت سی دل میں پیدا تھی جس میں خط لکھنے سے ڈر لگتا تھا۔ کچھ اس قدر پریشانیاں، الجھنیں، فکریں گھیرے تھیں کہ کسی چیز کو دل ہی نہیں چاہتا تھا۔ صبح کو دوائیں بانٹنا مشکل ہوگیا۔ خیر بیٹی ہوگا۔ تم اپنا حال لکھو سنا ہے رضا کی شادی ہونے والی ہے۔ اللہ مبارک کرے۔

یہاں گرمیاں بہت پڑی تھیں۔ اب برسات خوب ہو رہی ہے۔ جتنا پوری برسات میں برستا تھا اس سے بارہ انچ زیادہ ابھی برس چکا ہے۔ مکانات گر رہے ہیں۔ کہیں کہیں لوگ بھی دب کر مر رہے ہیں۔ ہمارا گھر چھلنی ہو کر رہ گیا ہے۔ خدیجہ غریب والا گھر گر گیا۔ ہمارے باغ کی دیوار کئی جگہ سے گر گئی ہے اور ابھی ساون بھادوں باقی ہے۔

سنو ہما! تم کو ہماری خیریت سے مطلب تھا۔ وہ تم کو لکھ دی گئی۔ اور کیا چاہتی ہو؟ اگر یہ چاہتی ہو کہ تمھارے میاں جان قیامت کی بوریہ بٹوریں تو یہ خیال دل سے دور رکھنا۔ اول تو اللہ میاں کی عادت نہیں۔ اور اگر وہ ایسا کریں بھی تو یہ بندۂ نافرمان کب اس پر راضی ہوگا۔ صفیں چیر پھاڑ کر سامنے پہنچ جاؤں گا اور عرض کروں گا "**یااحسن قداتاك المھی**"۔ قیصر دعا کہتی ہیں۔ جابر تسلیم عرض کرتے ہیں۔ سعید لکھنؤ میں ہیں۔ بدرل دعا کہتے ہیں۔ آفاق تسلیم کہتے ہیں۔

محمد علی عفی عنہ

---

(۹۴)

ہما بیگم کے نام

۹ رمئی ۱۹۵۴

ردولی

ہما پیاری، دعا! ادھر مظفر (71) اور رتی (72) سلمہا کی وجہ سے جی بہت بہلا۔ یہ لوگ ہر وقت حاضر اور جی بہلانے کو تیار رہتے تھے۔ خدا ان کو اور ان کے بچوں کو سلامت اور با اقبال کرے۔

میری تندرستی بحمدللہ روز بروز بہتر ہو رہی ہے۔ مگر اتنی من کا لکڑ، اس پر بیٹھا مکڑ، رتّی رتّی کھایا تو کتنے دن میں کھایا۔ یہ حال بی بی میری تندرستی کا ہے۔ دیکھیے کیا نصیب دکھاتا ہے۔ تمھاری محبت کو کہاں تک سراہوں بس یہی دعا ہے کہ اپنے بچوں سے پاؤ جیسا اپنے باپ کے ساتھ کرتی ہو۔ آمین رب العٰلمین۔ میری طرف سے اخلاق اور بچوں کو دعا۔

راقم تمھارا باپ عفی عنہ

ہما بیگم کے نام

ردولی — ۲۰ر جولائی ۱۹۵۴

ہما پیاری دعا! ہم تو خط لکھنے سے معذور ہیں۔ اکثر لکھنؤ آنے سے معذور ہوتے ہیں۔ مگر تم لوگوں کے خطوط کا بڑا آسرا ہے۔ معلوم ہوتا ہے جیسے اپاہج کو کوئی سنبھالنے والا مل گیا۔ اچھا سنو! میں پہلے سے اچھا ہوں۔ البتہ صاحب فراش اسی طرح ہوں جیسے تھا۔ اشفاق کو میں نے ڈیڑھ سو کا چک دلی بھیج دیا تھا، مگر ممکن ہے کچھ پتہ غلط ہوگیا ہو۔ آج بدرل سے لکھوا کر دریافت کرتا ہوں۔ میرا ابھی ایک کام ہے، یعنی تم بی بی، ایک ایک خط الّن اور چھبّن اور گجّن اور طبّن کو بھیجو کہ میاں جان تم لوگوں کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ مرنے کے پہلے دیکھنا مرنے کے بعد کیا یاد رہے گا۔ جب تک سانس ہے اس کا لطف ہے۔ میں خط بھیجتا ہوں مگر معلوم ہوتا ہے غائب ہوجاتے ہیں۔ ابھی الّن کا تار آیا کہ میں نے خطوط بھیجے جواب نہیں آیا۔ بذریعہ تار خیریت سے مطلع کرو۔

محمد علی عفی عنہ

---

(۹۶)

ڈاکٹر نورالحسن صاحب پی ایچ ڈی کے نام

دامت فضلکم! دعائے شوق ''فروغ اردو'' کی تعریف نہیں ہوسکتی۔ بقول انشاء مرحوم (بتصرف) ''اس چھوٹی سی جگہ میں یہ وسعت یہ سماوٹ اللہ ری جودت۔'' ڈاکٹر جانسن نے برک کے لیے کہا ہے کہ اگر راہ میں مویشیوں کو نکل جانے کے لیے آپ برک کے ساتھ لحظہ بھر کے لیے سڑک کے ایک طرف کھڑے ہوجایئے تو صرف اتنی ہی دیر میں آپ کو معلوم ہوجائے گا کہ برک کوئی معمولی راہ گیر نہ تھا۔ یہی حال ماشاء اللہ ''فروغ اردو'' اور اس کے اعزازی مدیر کا ہے۔

مجھے ارشاد ہوا ہے کہ اپنی کتابوں کی فہرست بھیج دو اور کچھ ذاتی حالات کے بارے میں بھی شاید کہا ہے۔ کتابوں کی فہرست حسب ذیل ہے:

1۔اتالیق بی بی 2۔ یادگار مولانا کرامت حسین مرحوم ومغفور 3۔نقادی کے نکتے، یعنی قلمی تصاویر کی پرکھ 4۔صلاح کار 5۔ پردے کی بات۔ (ایک بہت چھوٹا سا رسالہ ضبط تولید پر) 6۔گناہ کا خوف 7۔کشکول محمد علی شاہ فقیر۔ ان کے علاوہ ''معلومات'' ایک ماہنامہ تھا جس میں اکثر چھوٹے چھوٹے ایک ایکٹ کے ڈرامے نکلا کرتے تھے۔ عیاش کسان، سعید وسلمہ وغیرہ۔ اگر وہاں مل جائیں تو اردو کی تاریخ تو کیا اس سے یہ ضرور پتہ چلے کہ انگریزی سے کس کس وقت اردو نے کیا کیا لیا۔ آسکر وائلڈ کا مقدمہ فندموت۔ پیراڈاکس برنارڈ شا کی شہرت کا عزت الکمال ہے۔ اس کے علاوہ ایک کاپی شملہ میں کھوگئی۔ شاید کسی وقت پانی مردے کو اچھال دے تو دو چار افسانے مل جائیں مگر اب ان کا ذکر فضول ہے۔

شاید آپ نے یہ تحریر فرمایا تھا کہ کہیں تیرے حالات لکھے ہوں تو ان کا پتہ بتا۔ حضرت! فالج کی وجہ سے دماغ بکھر گیا ہے۔ ایک بڑھیا ایک ٹوکرے میں دھان کوٹنے کو لیے جاتی تھی۔ اس پر بندر کود پڑا ٹوکرا گر پڑا۔ دھان بکھر گئے اس عورت نے کہا ''لیو اب

کا کری؟'' یہی حال میرا ہے ایک صاحب ہیں عسکری صاحب ادیب۔ ایک بار انھوں نے میرا بہترین افسانہ ایڈٹ کیا تھا۔ دوسرے مصنفین کے ساتھ میرا بھی ایک افسانہ ''تیسری جنس'' چھاپا تھا۔ اس میں ان کے اصرار سے کچھ اپنا حال میں نے لکھ دیا تھا۔ اگر وہ آپ ڈھونڈھ نکالیں تو کچھ حال میرا مل جائے۔ نہیں تو یہ مصرع کافی ہوگا ع

اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

بلکہ یہ اس سے بہتر ہوگا۔

''سیاں آون کی بھئی بیریاں، ذرو جوا ٹھاری رہوں۔''

دعا گو

محمد علی عفی عنہ

۸/ اکتوبر ۱۹۵۴

---

(۹۷)

ہاشم صاحب کے نام

مائی ڈیئر ہاشم سلمہ، دعا! حامل ہذا عباس میرا قریبی رشتے سے نواسہ ہے۔ بہت ہونہار، بہت پڑھا لکھا اور اپنے ہاتھ پاؤں دل اور دماغ پر بھروسہ کرنے والا ہے۔ صرف مربیّ چاہیے اور خدا پر تکیہ کرنے والا ہے۔ آئندہ آپ کو اختیار ہے۔ سب کو بہت بہت دعا۔

نیم جان مفلوج

محمد علی عفی عنہ

یکم دسمبر ۱۹۵۴، ردولی

---

(۹۸)

ہما بیگم کے نام

ردولی　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　یکم دسمبر ۱۹۵۴

ہما پیاری۔ کون ایسی دعا دوں کہ سیدھی در اجابت پر پہنچے۔ بہرحال تم نے ایسا جی بھرا خط لکھا ہے کہ روئیں روئیں سے دعا نکلتی ہے۔ میرا حال ہر حالت میں قابلِ شکر ہے۔ سال بھر پہلے فرعونِ بے ساماں تھا۔ اللہ میاں نے یہ عنایت کی کہ فالج گرا کر آنکھیں کھول دیں تب سے توبہ کرلی۔ اگر قبول کرنا نہیں تھا تو یہ ترکیب کیوں کی! میرے گناہ بعض ایسے ہیں کہ جب معافی چاہتا ہوں تو اللہ میاں سے بھی شرم آتی ہے۔ مگر لاتقنطوا من الرحمة الله کی ایسی ڈھارس ہے کہ بے حیا رحم کی دعا مانگتا ہوں اور شرماتا نہیں۔ میں ٹائیں ٹائیں باتیں کیے جاتا ہوں۔ ڈاکٹر روکتے ہیں کہ ہائیں ہائیں چپ رہو، مگر بوڑھوں کی عادت نباہے جاتا ہوں۔ کبھی موت سے ڈر معلوم ہوتا ہے کبھی ایسا پریشان ہوجاتا ہوں کہ پیا ملن ہم جائب ہوراما۔ گاتا ہوں بارہ برس پاچھے سیاں مورے آئے۔ ہنس ہنس گروا لگائب ہوراما۔

تمھارے بچوں کو دعائیں۔ علی کاظم سے دعائیں اور داد دینے کا شکریہ۔

راقم

تمھارا باپ عفی عنہ

---

(۹۹)

حسامی صاحب کے نام

ردولی ۴؍دسمبر ۱۹۵۴

لطف و کرم کا ذکر کیا لطف و کرم تو عام ہے — اس کے نصیب مرحبا جس پہ کریں وہ کچھ جفا

پیشتر اپنے ہی رونے پہ ہنسی آتی تھی — اب سمجھتا ہوں یہی دیدۂ تر سب کچھ ہے

دامت اعطافکم! تسلیم۔

میں اپنے زعم ناقص میں سمجھتا تھا کہ اظہار خیال کی قوت مجھ کو ودیعت ہوئی ہے۔ پھر فالج گرا، زعمِ ناقص کا پھل مل گیا۔ تمام باتیں ایک خواب پریشاں سے زیادہ بڑھ گئیں۔ لیکن تھوڑی بہت قوتِ متصرفہ رہ گئی۔ عزیزی اختر کے نام جناب کا خط پڑھ کر نہ معلوم کس عالم میں ہوں۔ اگر اور باتوں کو چھوڑ دوں اور صرف ایک شعر کو لے لوں تو اس کے تحت میں تمام عمر کا نامہ اعمال بشرط قوت بیان عرض کرسکتا ہوں۔ ''میرا مذہب'' سے اس گنہ گار کی ذہنیت کچھ جناب کو معلوم ہوچکی ہوگی۔ اس زمانے کے بعد سے کچھ عرض کرتا ہوں۔ میں نے حج کے بعد سے یہ کوششیں کی کہ کم از کم نماز پابندی سے پڑھا کروں۔ گو پڑھتا رہا ہوں، مگر سفر میں چھوٹ جایا کی۔ پھر سفر حضر میں کم و بیش جاری رہی۔ مگر آزادہ خیالی باقی رہی۔ پھر خداوند تعالیٰ نے رحم کیا اور انفعال اور توبہ کا خیال دل میں جاگزیں ہونے لگا۔ قرآن شریف اردو اور انگریزی میں پڑھتا ہی تھا جوں جوں مرنے کے قریب آتا گیا عقبیٰ کا خیال زیادہ ہوتا گیا۔ الایمان بین الخوف والرجا کبھی خوف کبھی امید کی لہریں آیا کیں۔ مگر دو دعائیں زیادہ ہوگئیں۔ یعنی بار الٰہا ایمان دے اور مغفرت کر۔ چنانچہ جناب کے بزرگ خاندان حضرت سجادہ نشین صاحب مدظلہ العالی سے بھی عرض کیا تھا۔ قصہ مختصر فالج گرا اور مجھ کو اپنے گناہوں کی وجہ سے خوف ہوا کہ توبہ کا بھی وقت نکل گیا۔ مگر استغفار جاری رکھا اور ارحم الراحمین کے رحم پر بھروسہ رہا۔ رفتہ رفتہ یہ خیال دل میں

جاگزیں ہوتا گیا کہ کہیں یہ ٹھوکر صرف اس لیے نہ بتائی گئی ہو کہ دل سے توبہ نکلے۔

شکر کر شکر حسامی یہ شکایت کیسی
وہ جفا بھی جو نہ کرتے تو کوئی کیا کرتا
(وہ جو فالج نہ گراتے تو کوئی کیا کرتا)

اب آپ فرمائیں کہ اگر اس شعر پر مجھ کو حال آگیا یا صاحب شعر سے ارادت ہوگئی تو کیا بے جا ہے۔ دو اشعار جو اس ناچیز کے نام کے سلسلے میں فرمائے گئے ہیں اس میں جناب نے اپنی عقیدت کا اعلان کیا ہے اور دوسروں کو ایمان کا راستہ دکھایا ہے۔ جس میں انشاء اللہ تعالیٰ میں بھی شریک ہوں۔ البتہ دوسرے مصرعے کی بندش اور تیسرے مصرعے کی نازش کی داد دیتا ہوں۔ آستانہ حسامیہ سے میرا عقیدہ دو تین برس جب سے حضرت سجادہ نشین صاحب مدظلہ العالی کی زیارت ہوئی تب سے میرا عقیدہ مضبوط تھا۔ اب اور ہوتا جاتا ہے۔

آپ کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ رودولی پھر تشریف آوری کا ارادہ ہے۔ نہ معلوم میری عمر اس وقت تک وفا کرے گی یا نہیں۔ اگر میری زندگی میں آجاتے تو مسرور ہوتا ورنہ دعائے مغفرت کی امید ہر حال میں ہے۔ آپ نے میری شگفتہ تحریر کا ذکر کیا ہے۔ افسوس کہ اور کتابیں موجود نہیں ہیں۔ صرف دو کتابیں پیش کرتا ہوں بحیثیت طبیب کے ایک سے دلچسپی ہوسکتی ہے، دوسری کے لیے کچھ نہیں عرض کرسکتا۔

کچھ کذب و افترا ہے کچھ کذبِ حق نما ہے
یہ ہے بضاعت اپنی اور یہ ہے دفتر اپنا

حسامی صاحب مفلوج دماغ میں مطالب اس طرح اڈے آتے ہیں جیسے آندھی میں سوکھی پتیاں، ان کو کسی نظام کے تحت میں رکھ کر پیش کرنا کیسے ہو، خیر شکراً شکراً شکراً۔ عفواً عفواً عفواً یا اللہ یا اللہ یا رباہ یا سیداہ۔

سجادہ نشین صاحب مدظلہ کی خدمت میں اگر ممکن ہو تو تسلیمات پہنچا دیجیے گا۔ موصوف نے مجھ کو وصیت نامہ عطا فرماتے وقت ''محمدی'' کا لقب عنایت کیا تھا۔

محمد علی عفی عنہ

(۱۰۰)

حسامی صاحب کے نام

دامت فیوضکم، تسلیمات! اے وقت تو خوش کہ وقت ماخوش کردی۔ جن لوگوں نے اس کا مزہ چکھا ہے وہ اس خوانِ نعمت کے منتظر اور مشتاق تھے۔ دل اور دماغ نے عجیب چاشنیاں پائیں۔ خود مجھ کو تو مولانا کا مصرعہ یاد آگیا ع

آدمی فربہ شود از راہ گوش

البتہ آمنوا اور عملو الصّٰلحٰت کی بات سب کچھ بتا گئی۔ حکیم صاحب مرنے کے قریب آیا ہوں کچھ ایسا کیجیے اپنے بزرگوں رحمت اللہ علیہم سے ہمت چاہیے۔ کچھ دعا کیجیے کہ اللہ میاں کے سامنے شرمندہ نہ جاؤں جس کا سامان سیدھا ہے۔

آپ کا مظلوم پوسٹ کارڈ کوئی ظالم چرالے گیا۔ بار الٰہا اس خط سے اس کو فائدہ بخش اور حکیم سردار عالم صاحب کو مع ان کے فیض کے تادیر سلامت رکھ۔ آمین!

نیم جان

محمد علی عفی عنہ

۲۴ر دسمبر ۱۹۵۴

(۱۰۱)

ہما بیگم کے نام

ہما پیاری، دعا! شاید کل تم کو نوشاد سے خط لکھوا چکا ہوں۔ لیکن مجھ کو یاد بالکل نہیں رہا۔ بہر حال آج پھر لکھتا ہوں اور مکرر ہو جائے گا تو سٹھیا تو گیا ہوں۔

میں نے حسامی صاحب کو خط بھیج دیا ہے اور ان سے کہا ہے کہ تم کو خط براہ راست بھیجیں۔ تم ان کو بلا انتظار ایک جلد ''بھولی ہوئی باتیں'' کی فوراً روانہ کردو۔ یقیناً وہ تم کو کچھ اشعار بھی اپنے لکھیں میں نے ان کو خط لکھ دیا ہے۔

الّن، چھبّن، بخّن سب کو خط لکھنا ہے مگر ہما سب باتوں میں کود پڑتی ہیں اور آگے آگے رہتی ہیں۔ ہم بوڑھے آدمی بھلا یہ کوئی بات ہے کہ ہم کو ہماری لڑکیوں کو خط نہیں لکھنے دیتیں۔ آخر ان کو بھی ہم چاہتے ہیں۔ الّن نے رودولی میں رہ کر ہماری دلداری کی، چھبّن نے خدمت گزاری کی، بخّن نے ہم کو زیر قبہ یاد رکھا۔ نہ معلوم کہاں کہاں سے دوائیاں منگوائیں۔ تبرکات الگ بھیجے ہیں۔ جو خدا کرے ہم تک پہنچ جائیں۔ اور ہما ہیں کہ سب کو ڈھکیل میں اکیل، بھلا یہ کوئی بات ہے۔ اب بیٹھی بیٹھی یہ پوسٹ کارڈ پڑھ رہی ہیں اور دل میں کہتی ہیں کہ پھر ہم بھی تو ایسی بات کہتے ہیں کہ دل کی کلی کھل جاتی ہے۔ ہماری بہنیں ماشاء اللہ بڑے بڑے صفات رکھتی یں۔ مگر یہ تسخیر کا عمل سوا ہمارے کس کو ملا۔ فالحمدللہ رب العلمین۔ بچوں کو دعا۔

محمد علی عفی عنہ

۱۷ر جنوری ۱۹۵۵

ہما بیگم کے نام

ردولی ۲۸؍جنوری ۱۹۵۵

میری جان، دعا! خدا کرے اب تم بالکل ٹھیک ہو! آمین ثم آمین! تمھارے ہر لفظ سے محبت ٹپکتی ہے۔ مگر بیٹی اتنی تعریفیں نہ کیا کرو، مجھ کو حجاب آتا ہے۔ ہومیوپیتھک کے ذکر پر افسوس ہوتا ہے۔ آں دفتر را گاؤ خورد، و گاؤ را قصاب برد و قصاب در راہ مرد۔ اب اس دماغ میں فالج کے بلبلے ہیں اور کچھ نہیں۔

حسامی صاحب کا پتہ بالکل ٹھیک ہے۔ اپنی کتاب ان کو بھیج دو۔ اللھم بلغ بالخیر۔ میں اس وقت زندہ ہوں اور ظاہراً اچھا ہوں لیکن اگر کسی دن چل بسوں تو یہ نہ کہنا کہ میاں جان خوب دھوکا دے گئے۔ بدرل تم کو دعا کہتے ہیں۔ قیصر دعا کہتی ہیں۔ جابر ویزا کا انتظار کر رہے ہیں۔

تمھارا دعا گو

محمد علی عفی عنہ

ہما بیگم کے نام

ردولی ۱۰ر فروری ۱۹۵۵

میری جان دعاہائے شوق! گزشتہ خط میں نہ معلوم کیا لکھا تھا، اور اس خط میں اس کی کہاں اور کس قدر تردید کر رہا ہوں۔ اس کی خبر نہیں۔ قیصر لکھنؤ گئی ہیں۔ ان کے جانے کی وجہ سے کس قدر سکونِ قلب ہے۔ ابھی ابھی آفاق آئے۔ وہ نہ معلوم کیوں ''افسردہ ہیں اور افسردہ کند انجمنے را، کا کس قدر اثر میرے اوپر ہے۔ اس کو میں بھی نہیں بتا سکتا۔ اتنا کہہ سکتا ہوں کہ تم سے باتیں کرنے میں سکون ڈھونڈھ رہا ہوں۔ اور فی الجملہ طمانیت پا رہا ہوں۔ پہلی مرتبہ ''نقوش'' میں تمھاری تصویر کشی دل پر نہیں بیٹھی تھی۔ دوبارہ پڑھنے کے بعد تعریف کرنے کو جی چاہتا ہے۔ تم نے نہایت احتیاط سے اپنے باپ کی تصویر کھینچی ہے۔ جس میں خد و خال کے ساتھ مستے مہاسے اس نزاکت سے دکھائے کہ دل کہتا ہے واہ! ورڈس ورتھ کا ایک شعر ہے:

''ایک عورت ایک آبشار کے پاس بیٹھی پانی بہنے کی آواز سن رہی ہے اور اس ترنم کا اثر اس کے چہرے پر ظاہر کرتا ہے'' اگر تم مصور ہوتیں تو اس عورت کی تصویر بنا لیتیں اور چہرے پر پانی کا ترنم ظاہر کر دیتیں۔ تم نے تصور کشی اسی کمال کے ساتھ کی ہے۔ باپ کا حفظِ مراتب بھی کیا ہے اور میری عیاش منشی اور جذبات کے ہاتھ کی کٹھ پتلی اسی طرح دکھائی ہے ماشاء اللہ۔

اچھا سنو! تمھارا تار جابر کی رسید کا پہنچ گیا۔ ان کو کراچی بھجوانے کی صورت نہ معلوم تم نکال سکوگی یا نہیں۔ ویزا میں تو صرف لاہور لکھا ہے۔ اس کی بابت مجھ کو اطلاع دو۔

حسامی صاحب نے اپنے اشعار تمھاری تعریف میں سنائے۔ مگر تمھاری کتاب شاید ان کو ابھی تک نہیں پہنچی۔ اللہ کرے نجن جلد بھیج دیں۔ حسامی صاحب عرس میں آئے

تھے۔ بڑے اچھے آدمی ہیں۔ تم اپنی رائے لکھو۔ میں اسی طرح لولا اور اپاہج ہوں مگر کوئی آرام کرسی پر بیٹھا دیکھے تو نہ جانے کہ میں پابہ رکاب ہوں۔ بس بیٹی اب کارڈ میں جگہ ہی کم رہ گئی۔ سب کو دعا۔ جابر اور سب کا حال لکھو۔ النّن، سلّو اور ان کے دولھا کا حال لکھو۔ اگر کراچی کا کچھ حال معلوم ہو تو وہ بھی لکھو۔

محمد علی عفی عنہ

"...... یہاں تک کہ ۱۰ ستمبر ۱۹۵۹ کو جمعرات کا دن آ گیا۔ ۱۱ بجے دن سے طبیعت یک بیک زیادہ خراب ہوئی۔ نماز ظہر لیٹے لیٹے ادا کی۔ پھر کبھی درود شریف پڑھا اور اللہ اللہ کہا، اور اسی پر روح پرواز کر گئی — نماز حسب وصیت دوبار پڑھی گئی۔ ایک بار شیعوں نے پڑھی، ایک بار سنّیوں نے اور نمازوں میں شرکت بہت بڑی جماعتوں نے کی۔ اللہ بال بال مغفرت کرے..."

(عبدالماجد دریا آبادی: "سچی باتیں" جلد ۹ نمبر ۴۲۔ یوم جمعہ ۲۱ر ربیع الاول ۱۳۷۹ھ مطابق ۲۵ر ستمبر ۱۹۵۹)

(۱۰۴)

ہما بیگم کے نام

ردولی ۱۲ر مارچ ۱۹۵۵

ہما پیاری دعا! نہ معلوم کتنے جوابات لکھنے کو پڑے ہیں۔ دل نفرین کرتا ہے مگر لکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ البتہ تم کو خط لکھنے کو ہمیشہ تیار ہوں۔

"ہمہ شہر پُر ز خوباں، منم و خیال ما ہے"

مجبوری ہے اچھا سنو! حسامی صاحب کا خط آیا تھا۔ نہ معلوم کتنی تعریفیں تمھاری نہ معلوم کتنی تعریفیں ہماری۔ اگر ہم وکیل بیرسٹر ہوتے اور تم لیڈی ڈاکٹر ہوتیں تو روپیہ کماتے۔ اب کچھ نہیں ہے تو مفت کی تعریفیں کیا بری ہیں۔ مجھ کو خوب یاد ہے کہ مولوی سعید صاحب مجتہد نے تمھاری کتاب کی تعریفیں کیں اور بڑے مہذب طریقے سے میری ہجو ملیح کی اور حسامی صاحب نے لکھا ہے۔ "محمد علیت" ہر جگہ چمک رہی ہے۔ اس میں بی بی تمھاری منقبت نہیں ہے۔ املی کا چیاں ایک چھوٹی چیز ہے۔ مگر اسی سے بڑا بھاری درخت ہوتا ہے۔ اسی طرح تمھاری حالت ہے۔ مجھ کو تم پر فخر و ناز ہے۔

اچھا بیٹی صلاح الدین صاحب نے ہمارے خطوط چھاپنے شروع کردیے۔ اول تو میاں کھدن ولد میر یوسف مرحوم کی تحریر، دوسرے کاتب کی اصلاح غلطی نثر کو تباہ کرتی ہی ہے۔ مگر نظم کی غلطی تو مزا کرکرا کردیتی ہے۔ تمھارے خط میں مولانا کا شعر "تا دل صاحب دلے نآمد بدرد۔ عابد کے خط میں دوسرا مصرعہ یوں ہے:

"بر در من نشیں کہ من از ہمہ وا رہانمت"

ان غلطیوں کی تلافی کیا ہوسکتی ہے۔ خیر جانے بھی دو۔ "ادبی دنیا" کا پیٹ تو بھر گیا ہم پر صلاح الدین صاحب کا بڑا احسان ہے۔ انھوں نے "کشکول" پر تقریظ لکھی تھی۔ ہم نے ایک خط کی چار نقلیں تم کو بھیجی تھیں کہ تم اپنی بہنوں کو بھیج دو، جابر کے متعلق تھا معلوم نہیں تم کو وہ خط پہنچا یا نہیں۔؟

دعا گو، تمھارا باپ عفی عنہ

ہما بیگم کے نام

ردولی ۲۳/مارچ ۱۹۵۵

میری جان، دعائیں قبول کرو۔ عقل نہ معلوم کہاں چکر کاٹا کرتی ہے کہ ایک بات میں خط میں لکھتا ہوں اور دوسری بات ذہن سے اتر جاتی ہے۔ جب یاد آتی ہے تو دوسرا خط لکھتا ہوں۔ اگر پھر ذہن سے غائب ہوگئی تو یوں ہی دل بہلانے کے لیے تم کو لکھا کرتا ہوں۔ جب کوئی پاس بیٹھا ہوتا ہے تو خیر جب کوئی نہ ہوا تو پھر تم سامنے آجاتی ہو، لہٰذا پھر لکھتا ہوں۔

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمھارے نام کے

دیکھو پھر دماغ سے مطالب روح سیلانی کی طرح مٹرگشت کو نکلے جارہے ہیں۔ خیالات کو صف بہ صف جمع کرلوں تو عرض کروں۔ میرے خطوط جو ''ادبی دنیا'' میں نکلے ہیں بہت غلط ہیں۔ گاندھی آنجہانی کی تاریخ میں میاں کھدّن جنھوں نے خطوط کی نقل اتاری تھی۔ ان کا تصرف ''ادبی دنیا'' کے کاتب صاحب کا تصرف ہر جگہ شعر میں نثر میں کارفرما ہے اسے ''ادبی دنیا' کا پیٹ تو ضرور بھر گیا مگر ہم بھوکے رہے۔ ہمارا دیوالہ نکل گیا۔ موجودہ تحریر جس سے پرچہ چھپتا ہے اس کی اصلاح ناممکن ہے۔ ہاں البتہ ''ادبی دنیا'' کے چھپے ہوئے رسالے کی اصلاح ممکن ہے جس سے یہ فائدہ ہوگا کہ اگر مجموعہ خطوط کبھی الگ چھپا تو کچھ بہتر چھپے گا۔ یا دوسری صورت یہ ہے کہ خطوط کی کاپیاں میرے پاس آجایا کریں اور میں تصحیح کردیا کروں بشرطیکہ اس وقت تک زندہ رہوں۔ اس میں بڑا طول امل مگر مجبوری ہے۔ اب باقی خط میاں نوشاد لکھیں گے۔ بیٹھے بیٹھے میری پیٹھ میں درد ہونے لگا۔

ہاویہ آمد سرائے مدعی۔ یعنی سرا میں ہائے نہیں ہے۔ صرف ہمزہ معہ اضافت ہے۔ اس کے اعداد ۴۵۸ ہوئے۔ تادلِ صاحبدے الخ۔ اس کے اعداد ۲۴۰۶ ٹھہرے۔ اس طرح ۲۴۶۰-۴۵۸ = ۱۹۴۸ پہلے مصرعے میں مرد ہے۔ مُرد غلط ہے۔

خط نمبر 3 میں شعر کے دوسرے مصرعہ میں ہمہ و کے بعد رہانمت ہونا چاہیے۔ یاقوت رقم خاں نے کارڈ کی کفایت میں کرامت دکھائی۔ اب میں پھر لکھتا ہوں۔ جابر کا حال لکھو، اخلاق سے بھی مشورہ لو اور تمھاری بہنیں جو کہیں اس سے مجھ کو مطلع کرو۔ قیصر بیمار ہیں وہ لکھنؤ گئی ہیں۔ حسامی صاحب کا اثر مجھ پر اچھا خاصہ ہے۔ اگر ان کا تقریظی خط جب آوے تو مجھ کو بھیج دو تو بڑی عنایت ہو۔ بچوں کو دعا۔ اتنی جگہ کارڈ میں رہی جاتی ہے اب کیا کروں۔ اچھا شعر سن لو۔

سودا نہیں سر میں منزلت کا ‏ ‏ ‏ ‏ سائل ہوں دعائے مغفرت کا

اب کوئی شعر بھی یاد نہیں آتا۔ ڈاک کا وقت جارہا ہے۔ بچوں کو دعا۔ نوشاد تم کو دعا کہتے ہیں۔

۲۳ رمارچ ۱۹۵۵، ردولی

محمد علی عفی عنہ

---

(۱۰۶)

ہما بیگم کے نام

ردولی ۲۴ر اپریل ۱۹۵۵

ہما پیاری! دعائیں حاضر خدمت ہیں۔ تمھارے بڑے اچھے خط کا جواب کئی دنوں کے بعد لکھا تھا۔ آج تمھاری تازہ تحریر کا جواب لکھ رہا ہوں۔ تم یہ خطوط چھپوانے پر تل ہی گئیں۔ خدا کرے ان خطوط کو دنیا اس کا آدھا ہی پسند کرے جتنا ہم اور تم ان کو پسند کرتے ہیں۔ ایک بار پھر عرض کرتا ہوں کہ خطوط جو تم کو بہت اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ شاید دوسرے کو اتنے اچھے نہ لگیں۔ اس مسئلہ پر پھر غور کرلینا بہت ضروری ہے۔ تصویر کا یہ معاملہ ہے کہ وہ تصویر جس کا تم نے ذکر کیا ہے تمھاری بوبو مرحومہ کی رائے سے لی گئی تھی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مجھ میں اوچھاپن نہیں ہے۔ لیکن تصویروں کے معاملے میں شاید میرا اوچھاپن کچھ زیادہ بڑھا چڑھا نہ ہو کیونکہ میں نے جب جب تصویر کھنچوائی ہے اکثر دوسروں کے اصرار سے کھنچوائی ہے۔ اکثر لوگ کتابوں میں بہت روپیہ دے کر اپنی تصویر شامل کرتے ہیں۔ مجھ سے دو بار دو مختلف مطبوعوں کے ایجنٹ تصویر مانگا کیے اور اسی کے ساتھ پچاس روپے بھی مانگا کیے مگر میں نے نہیں دیا۔ خیر ہوگا اس وقت تصویر کا فلسفہ بیان کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ تمھارے حکم کی تعمیل کی کوشش کروں گا۔ مگر دیر ہوگی۔

یہ خط جب لکھنے بیٹھا تو بہت سی باتیں ذہن میں تھیں۔ اب خالی الذہن ہوں۔ اس لیے ختم کرتا ہوں۔ تجھے اور شاہدہ کو دعا۔ میاں ضیاء کو بہت بہت دعا۔ نہ معلوم میرا خط ضیاء کو پہنچا یا نہیں۔ ضیاء کے آنے کے دن گن رہا ہوں۔

تمھارا باپ عفی عنہ

---

(۱۰۷)

ہما بیگم کے نام

ردولی

۲۷/اپریل ۱۹۵۵

ہما پیاری دعا۔ 17/اپریل والا خط کل 23/کو موصول ہوا۔ اس کے احکام کی تعمیل بسر و چشم مگر اس میں وقت لگے گا۔ "واکہوس" مصنفہ استاد تجمل حسین، استاد راجہ امیر علی خاں مرحوم، امیر الدولہ، دبیر الملک والی محمود آباد تلاش سے انشاء اللہ تعالیٰ مل جائے گی۔ کاش یہ مسودات یا کم سے کم خطوط کے مسودات میں دیکھ سکتا۔ خیر کوئی حرج نہیں۔ آفاق کوشش کر رہے ہیں کہ تمھارے حکم کی تعمیل جلد ہو جائے۔

اسما اور اس کی لڑکی کو سب کی دعا کہہ دینا۔ ڈم پلاٹ کیا کرتا ہے قیصر دعا، بدرل دعا کہتے ہیں۔ آفاق تسلیم کہتے ہیں۔

ہاں بیٹی آج کل یہاں مشہور ہے کہ...... کسی ڈرائیور کو لے کر کہیں غائب ہوگئی۔ یہ خبر بے تکی سی معلوم ہوتی ہے۔ تم کو حالات معلوم ہوں تو وہ لکھو۔ میرے خیال میں کاظم اس کی خبرگیری ہر حال میں کرتے۔ اور وہ خود اتنی بے وقوف نہیں تھی کہ ایسی حرکت کر گزرتی۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ہے کہ اس راہ کے مقامات کچھ ایسے مشکل گذار اور ہر شخص کے لیے نئے نئے مصائب پیش کرتے ہیں کہ کچھ کہا نہیں جا سکتا۔

دعا گو

محمد علی عفی عنہ

---

(۱۰۸)

عباس ہاشمی کے نام

ردولی　　　　۲۱؍جون ۱۹۵۵

نورِ چشم عباس سلمہ، دعا! ایک سرٹیفکیٹ جیسا مجھ سے لکھتے بنا ارسال ہے۔ میں نے پیش گوئی کی ہے اور دست بدعا ہوں کہ تم دنیا میں کامیاب ہو اور کافی ترقی کرو۔ آمین! مگر بیٹا ہر معاملے میں تنگ نظری چھوڑ دو۔ سفارش اٹھوانا، دوسرے کے بل بوتے پر کام چلانا یہی کم نظری ہے۔ اس میں اگر کامیابی ہوگئی تو اسی کے ساتھ ایک طرح کی چالاکی بھی آجائے گی اور اس مردانہ خودداری سے محروم رہ جاؤ گے جو کام کرنے والے محنتی انسان کا زیور ہے۔ عموماً سرٹیفکیٹ میں انگریزوں کے وقت میں لکھ دیا جاتا تھا کہ یہ شخص اپنے افسران کو خوش رکھنے کی قابلیت رکھتا ہے۔ انگریز ایسی باتوں کو پسند بھی کرتا تھا۔ یعنی ہندستانی میں خودداری نہ پیدا ہونے پائے۔ سفارش اٹھوانا اور ''رفتن بپائے مردئ ہمسایہ در بہشت'' کم ہمتی کی بات ہے جو انسان کو ذلیل کرتی ہے۔ اگر تم بغیر مغرور ہوئے خوددار ہونے کی کوشش کرو تو تم کو معلوم ہوگا کہ اس میں زیادہ فائدہ ہے۔ اگر خودداری کے ساتھ انکسار نہ ہوا تو غرور تمھارا دماغ آسمان پر پہنچا دے گا اور انسان تحت الثریٰ میں دم لے گا۔ اگر بیٹھ کر غور کرو تو تم کو معلوم ہوگا کہ انکسار خودداری کا تمغہ ہے اور ایک اوسط کا راستہ ہے۔ جو ہر بالغ، عاقل کے لیے بہت سہل ہے۔ یعنی آدمی اپنی محنت پر بھروسہ رکھے۔ مگر غرور کس بات پر کرے گا۔ کیونکہ ہزاروں آدمی ہیں جنھوں نے محنت کی ہے اور اللہ میاں نے ان کی محنت کا صلہ ان کو دیا ہے۔ سفارش اور سرٹیفکیٹ سے کامیابی ہوجائے مگر اسی کے ساتھ ایک چھوٹا پن اور چالاکی طبیعت میں آجاتی ہے جس سے بچنا بہت ضروری ہے کیونکہ پھر انسان احسان لینے سے نہیں ڈرتا، اور یہی وہ چیز ہے جس کے لیے حکماء فرما گئے ہیں۔

حقا کہ از عقوبتِ دوزخ برابر است
رفتن بپائے مردئ ہمسایہ در بہشت

میرا دماغ مفلوج ہے اور نہیں لکھ سکتا۔ اسی کو غور سے پڑھنا اور اگر پسند آجائے تو کاربند رہنا۔

دعا گو

محمد علی عفی عنہ

سرٹیفکیٹ

عباس ہاشمی میرا نواسہ ہے۔ یعنی میرے ماموں زاد بھائی مرحوم سید حافظ محمد حیدر کا نواسہ ہے۔ خاندانی احتشام بیان کرنے سے کچھ فائدہ نہیں اور احتشام کچھ ایسا ہے بھی نہیں۔ ''میراثِ پدر خواہی علم پدر آموز۔'' ذاتی صفات ماشاء اللہ اس قابل ہیں کہ پڑھنے والا ان سے متاثر ہو اور تجربے کے بعد ان کی قدر شناسی کرے۔

بچپن سے لے کر آج تک مشکلات کی کمی نہیں رہی مگر جو کام پیش آیا اس کی صحیح اہمیت کا اندازہ کرلیا۔ ایسے آدمی کا پاؤں انشاء اللہ پیچھے نہیں پڑ سکتا۔ B.Com اور اس سے پہلے ہر امتحان اچھے انداز سے پاس کیا اور مختصر زمانۂ ملازمت میں ہر بیدار مغز افسر کی نظر میں ہونہار تلا۔ الحمدللہ رب العلمین۔

محمد علی عفی عنہ

ردولی، اودھ، بھارت

۲۱ر جون ۱۹۵۵

---

(۱۰۹)

ہما بیگم کے نام

رودولی ۲۶رجولائی ۱۹۵۵

میری جان دعا! نہ معلوم کس کس کے خطوط بغیر جواب کے پڑے ہیں اور یہاں جواب کے خیال سے جاڑا جوڑی آتا ہے۔ تمھارا خط کل شام کو ملا تھا۔ آج 26رجولائی کی صبح کے وقت جواب لکھ رہا ہوں۔ آج کل میں دل و دماغ کی طرف سے بہت لاحال ہوں۔ موت کا ڈر نسبتاً کم ہوگیا ہے مگر تب بھی اعمال اور دنیا چھوڑنے کا ڈر بڑھ گیا ہے۔ اب کی سال برسات ایسی ہوئی کہ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ میری عمر میں نہیں ہوئی۔ کوئی گھر نہیں جو کم و بیش گرا نہ ہو۔ غریبوں کے گھر تو بالکل صاف ہوگئے۔ امیروں کے گھر ایسے گرے کہ وہ زمینداری جانے کے بعد کبھی بھی نہیں بنوا سکتے۔ نام نہاد امیر تھے، ورنہ امیری اب کہاں۔ ہمارے یہاں کوٹھے پر دیوار پردے کی پچھم کی طرف گری، رواق کی چھت الا اللہ کے زور پر رکی ہے۔ زنانے مکان کی کھڑکی اور دو بالا خانے، باورچی خانہ سب پھٹ گئے۔ بی قیصر اسی فکر میں ہیں کہ سہاگ تو جا ہی رہا ہے۔ اب بیٹھنے کی چھت بھی نہ رہے گی۔ اچھا چھوڑو اس قصے کو۔ رضا کی لڑکی کا ہماری طرف سے منہ چوم لو۔ جب رتی کا لڑکا آوے تو اس کی بھی دیدہ بوسی کریں۔ بی بی خدا تجھ کو اچھا رکھے اور کیا عرض کروں۔

افوض امری (الی اللہ) پڑھتا ہوں۔ آفاق تسلیم کہتے ہیں۔ بدرل اور قیصر دعا کہتے ہیں۔ میاں جابر ابھی تک نہیں آئے۔ جابر کا سفرنامۂ پاکستان تم ہی لکھو کیونکہ ع

اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست

دنیا اور عقبیٰ کا بے پر تمھارا باپ عفی عنہ

---

(۱۱۰)

ہما بیگم کے نام

ردولی ۱۷راگست ۱۹۵۵

سلمک اللہ۔ ابھی ابھی تمھارا لفافہ آیا۔تمھارا خط کیا ہے جیسے جواہر مہرہ ایک خوراک کھا لیا۔ اللہ تم کو اس کا اجر دے۔ اب ہما میں اپنے کو کچھ کمزور پاتا ہوں، مگر بیماری میں کوئی اضافہ نہیں ہے۔ وہ اور بات ہے کہ یکبارگی دورہ پڑ جائے۔

برسات اب کی عذاب خدا۔ قہر الٰہی کی صورت میں آئی۔ ہر گھر گر گیا یا گرنے پر تیار ہے۔ غریب تو کچا گھر رفتہ رفتہ اٹھا لے گا۔ جو امیر کہلاتے تھے وہ اب بالکل فقیر ہو گئے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار! ان کو ٹپکتی چھت ہی بنوانا دشوار تھا۔ انشاء اللہ تعالیٰ تم نے اپنے آنے کا ذکر کیا ہے۔ معلوم نہیں مرضی خدا تب تک مجھ کو زندہ رکھنے کی ہے بھی یا نہیں۔ خیر دنیا بہ امید قائم۔ سطر میں سباق دیکھتی ہو؟ ہر بات سے ذرہ ذرہ بکھرنے والا معلوم ہوتا ہے۔

یہ خط آج تیسرے دن پھر لکھ رہا ہوں۔ کوئی خاص وجہ اس دیر کرنے کی یاد نہیں آئی۔ ہاں شاید اس دن ڈاک کا وقت نکل گیا تھا اور پھر تعطیل تھی۔ چھٹی ہو تو تعجب نہیں۔ تمھارے بچوں کے لیے تو دعا ہے ہی۔ تمھارے بچوں کے بچوں کے لیے دعا ہے۔ اللہ میاں ان بچوں کو سلامت رکھ اور ہما کو ان کے سر پر سلامت رکھ! آمین! ثم آمین!

آج 17 بدھ ہے یہ خط پھر پڑھا تو نشست الٹی ایسی معلوم ہوئی جیسے کسی کا دم اکھڑ گیا ہو۔ خیر بیٹی اللہ کرے تمھارے آنے تک زندہ رہوں۔ سب کو دعا۔

نجات کا طالب

محمد علی عفی عنہ

111

ہما بیگم کے نام

ردولی ۱۱؍ستمبر ۱۹۵۵

ہما پیاری! دعائیں۔ ایک کارڈ مری پہنچا تھا۔ اس کے بعد حسامی صاحب کے خط سے معلوم ہوا کہ تم لاہور آگئی ہو۔ میں سمجھا کہ مری سے میرا کارڈ لاہور آگیا ہوگا۔ معلوم نہیں کیا ہوا۔ ممکن ہے تمھارا خط ڈاک میں ہو۔ یہ خط اوپر سے چلے اور تمھارا پیارا خط ڈاک کے مراحل طے کرتا ہوا عنقریب میری آنکھوں کی ٹھنڈک بڑھانے کو آجائے۔ ہما بیگم! دل بہت گھبراتا ہے۔ اعمال کا خیال اور زیادہ گھبرائے دیتا ہے۔ اللہ اپنا رحم کرے۔ رحم تو وہ ہر وقت کرتا ہی رہتا ہے۔ اچھا تم اپنا حال کہو، اپنے بچوں کا حال کہو یعنی رتی اور رضا کے بچوں کا۔

ہمارے خطوط صلاح الدین احمد نے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیے یا غلط سلط مسخ شدہ صورت میں چھپ رہے ہیں؟ آج کل ہمارا آفاق بے چارا اپنے افکار میں بہت پریشان ہے۔ میاں جابر اچھے ہیں۔ خیال کرتا ہوں کہ میرے بعد ان کا کیا حال ہوگا۔ میں کیا بے وقوف ہوں۔ بھلا کوئی یہ تو پوچھے کہ میرے بعد خود میرا کیا حال ہوگا۔ قیصر غریب آج کل بیمار ہے۔ تم کو دعا کہتی ہے۔ سعید الہ آباد میں ہیں۔ سب کو دعا۔ ہما بیگم! بڑھاپا اور مختلف باتیں جو پراگندگی دماغ کی ہیں کرو۔

بہار پیشہ خوانے کہ غالبش نامبند......
کنوں ببیں کہ چہ خوں می چکد ز ہر نفسش

راقم تمھارا عاشق زار
تمھارا باپ عفی عنہ

ہما بیگم کے نام

ردولی　　　　　　　　　　　　　　　　　　　پہلی اکتوبر ۱۹۵۵

ہما پیاری! دعا۔ اللہ اللہ کرتے کرتے کل صبح کو پارسل ملا۔ نہتا، لولا، اپاہج کیا کرسکتا تھا۔ نہ معلوم کس کس قسم کی غلطیاں پائیں۔ ایک ڈپٹی صاحب تھے۔ ذری عمدہ شاعر۔ ان کا خط ایسا خبط ہوا ہے کہ سمجھ ہی میں نہیں آتا۔ اس کے علاوہ ایک خط اور ہے جس میں الیکشن کا ذکر ہے۔ اس میں لوگوں کے نام بہت آگئے ہیں۔ وہ سب نکال کر صرف ڈیش دے دیا جائے۔ خبردار خبردار جہاں کسی کی تعریف ہو۔ جہاں کسی کو خط بھیجا گیا ہو وہاں کوئی ہرج نہیں۔ لیکن جہاں تعریض ہو وہاں تو بڑی بُری بات ہوگئی۔ میں اپنے امکان بھر ایک دن کی بھی دیر نہ کروں گا، یوں موت اور قسمت سے چارہ نہیں۔ آفاق تسلیم کہتے ہیں۔ بدرل اور قیصر دعا کہتی ہیں۔ بچوں کو دعا۔

دعا گو

محمد علی عفی عنہ

ہما بیگم کے نام

ردولی ۱۴؍اکتوبر ۱۹۵۵

ہما پیاری دعا۔ ایک ٹوٹکا ہے یعنی جب کسی کا خط بہت دنوں تک نہ آوے تو اس کو خط لکھو۔ اس خط کے پہنچنے سے پہلے ادھر سے خط آجائے گا۔ چنانچہ میں نے دوسرا تار تمھاری بہو کے نام دریافتِ حال کا لکھا تھا۔ ویسے ہی تمھارا تار آگیا۔ میں نے آدمی دوڑا کر وہ تار واپس منگوایا۔ چنانچہ انشاء اللہ تعالیٰ آج ہی شام کی ڈاک میں تمھارا خط آتا ہوگا۔ بڑا مجرب ٹوٹکا ہے مگر دونوں طرف سے دلی تعلق ہو۔ ظاہرداری میں یہ لٹکا نہیں چلتا۔ اچھا سنو! میں نے خطوط کی پروف کاپی بذریعہ رجسٹری بھیج دی تھی اور خط بھی بھیج دیا تھا۔ بہت دن ہوگئے اللہ کرے بخیریت پہنچ گئی ہو۔ اس لیتھو کی لکھائی چھپائی میں ایسے ہی کنویں جھانکنا پڑتے ہیں۔ رہی رجسٹری کی رسید سو وہ ڈاک خانے والے از راہ بے تکلفی کبھی نہیں بھیجتے۔ کہتے ہیں کہ جہاں خلوص یگانگی ہو وہاں ان تکلفات کی کیا ضرورت ہے۔

آج کل میاں آفاق چرائی پر گئے ہیں اس لیے میں بہت گھبراتا ہوں۔ قیصر دعا کہتی ہیں۔

دعا گو

تمھارا باپ عفی عنہ

---

(۱۱۴)

ہما بیگم کے نام

ردولی　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　پہلی نومبر ۱۹۵۵

میری جان دعائیں قبول فرماؤ۔ تمھارا خط آیا۔ جیسے درد سر میں صندل لگایا جاتا ہے۔ اسی طرح تمھارا خط ہوتا ہے اور نہیں تو کاہے کو خطوں کی بھرمار کیے رہتا ہوں۔ جانتا ہوں کہ تم کمزور ہو۔ بیٹھ کر خط لکھنے میں پیٹھ میں درد ہونے لگتا ہوگا اور تھک جاتی ہوگی، مگر میں کچھ پرواہ نہیں کرتا، جب تمھارا خط آجاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے خود ہما بیگم آگئیں، اور میرے پلنگ پر بیٹھی ہیں۔ ایک ہاتھ سر پر رکھے ہیں اور ایک سینہ پر اور آہستہ آہستہ کچھ پڑھ رہی ہیں۔ نہ معلوم وظیفہ ہے۔ یا لیٹین ہے۔ مگر اچھا ہی اچھا ہے، جو کچھ ہو، ہاں بی بی میں نے رجسٹری کی رسید ڈاک خانے کو بھیج دی ہے اور ان لوگوں سے پوچھ گچھ شروع کی ہے۔ دیکھو کیا ہوتا ہے۔

خیال پڑتا ہے کہ ایک دوست میرے ہیں، نقی صاحب۔ انھوں نے ''میرا مذہب'' پر مجھ کو لکھا تھا کہ تم اپنی کتاب میں جناب سیدہ سلام اللہ علیہا کے مصائب بالکل ہی نظر انداز کر گئے۔ اس کا جواب جو میں نے ان کو لکھا تھا شاید اس کی نقل تم کو بھجوائی تھی۔ وہ خط پروف میں نہیں تھا۔ کچھ تم کو خیال ہے؟

تمھاری پیدائش صبح کے وقت ہوئی تھی۔ ٹھیک وقت تو یاد نہیں شاید سات آٹھ بج رہے ہوں گے۔ کمرے میں شاید دو آدمی رہے ہوں، ایک لیڈی ڈاکٹر اور شاید ایک اس کی مہری یا ہندستانی دایہ۔ نام دونوں کا بھول گیا ہوں اور کیا عرض کروں۔ سب بچوں در بچوں کو پر بچوں کو دعا۔ سلّو سے اگر ایک خط اور تصویر بھجوا دو تو جانیں۔ جتنی تصویریں سب کو بھیج سکو بھجواؤ۔ پھر کہاں ہم اور کہاں یہ تصویریں۔ واضح ہو کہ ہم بہک رہے ہیں۔ دیکھیے یہ رنگ بھی کب تک چلے۔

دعا گو، محمد علی عفی عنہ

(۱۱۵)

ہما بیگم کے نام

ردولی ۱۲ر نومبر ۱۹۵۵

جانِ پدر، دعاہائے فراواں۔ کل پھر تمھارا خط آیا۔ تفریح قلب، سرورِ جاں ہوا۔ باوجود کاروبار اور بیگار کے چھ سومیل پر بیٹھی ہوئی میری تیمارداری کیے جاتی ہو۔ خدا تم کو اس کا اجر دے۔ آمین۔ سلّو کے خط اور تصویروں کے پارسل کا انتظار کروں گا۔ بہت سی چیزوں کا آسرا لگائے ہوں، ان میں سے ایک اور کا اضافہ سہی۔ اسد کا عنفوان اور اٹھان کی دلچسپ کہانی سنی، اللہ مبارک کرے اور ترقی ہر پہلو سے ہر چاہنے والے کو دیکھنا نصیب کرے۔ مگر جب میاں سلمان کا ذکر آجاتا ہے تو دل پر ایک دھچکا ہی لگتا ہے کہ ہم نے تو میاں سلمان کے ساتھ کبھی بھی ایسا نہ کیا تھا کہ وہ میاں جان کو ردولی دیکھنے آنے کی دھمکی دیتے۔ بھلا ہما تم ہی بتاؤ کہ ہم سے کون سا قصور ایسا ہوا ہے کہ جس پر وہ ہم کو دیکھنے آنے سے ڈراتے۔ اگر وہ آگئے اور میں اس وقت تک زندہ ہوا تو مجبوراً خوش ہو لوں گا، کیونکہ فطرت کا تقاضا ہوگا مگر یہ بات ان کی تقسیم ملک کے شروع میں جو خوں خواری ہوئی اس سے بعید ہوگی۔ خیر صاحب وہ صاحب اختیار ہیں تم نے میرا حال دریافت کیا ہے۔ سنو! میرا بایاں ہاتھ بالکل بیکار ہے۔ مگر خفیف سی جنبش اختیار میں ہے۔ بایاں پاؤں اٹھ جاتا ہے لیکن اگر کوئی طاقتور آدمی مجھ کو پکڑے نہ رہے تو میں گر پڑوں۔ یعنی مفلوجِ محض ہوں۔ کرسی پر سے خود ہل نہیں سکتا۔ دیر تک بیٹھ نہیں سکتا۔ اس کارڈ کے لکھنے میں دو تین بار درمیان درمیان آرام کرسی پر لیٹ چکا ہوں تب لکھ سکا۔ موٹا ہوگیا ہوں یعنی نوکروں کو اٹھانے میں اور تکلیف ہوتی ہے۔ فرنچ داڑھی رکھوا لی ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں اچھی معلوم ہوتی ہے۔ معلوم نہیں اللہ میاں کو بھی اچھی لگے گی یا نہیں۔ میری مجبوریوں کا حال نہ پوچھو۔ یہ کارڈ تب لکھ سکا ہوں جب دوسرا آدمی اس کے کونے پکڑے ہے۔ اگر آرام کرسی پر چھپکلی گر پڑے تو میں مجبور محض ہوں۔ خود نہیں اٹھ سکتا۔ انتہا یہ ہے کہ طہارت دوسرا کراتا

ہے۔ جانے دو اس قصے کو میرے لیے دعائے مغفرت کرو۔ دنیا کی حالت بھی ہزار ہزار قابل شکر ہے۔ دوسروں کی مجبوریاں مجھ سے بہت زیادہ ہیں۔ ہما بیگم کارڈ میں اتنی جگہ خالی رہی جاتی ہے، اس کا افسوس ہے مگر اب کوئی مضمون نہیں سمجھ میں آتا۔ خیام کی ایک رباعی ہے ''خویش من است، اور بداندیش من است۔ مگر وہ یاد نہیں آتی۔ اتنا کہے دیتا ہوں کہ آفاق میرے ساتھ وہ کر رہا ہے جو دس بیس سلمان نہ کر سکتے۔

تمھارا دعا گو

محمد علی عفی عنہ

---

(۱۱۶)

ہما بیگم کے نام

رودولی ۲۶/نومبر ۱۹۵۵

ہما پیاری، دعا! نہ معلوم میرا خط تم پر فاضل ہے یا تمھارا مجھ پر۔ اس کی پرواہ نہیں۔ حساب دوستاں در دل۔ اچھا سنو ادھر اخبار میں نکلا ہے کہ ہندستانی ہائی کمشنر کے دفتر سے ویزا اسی دن مل جایا کرے گا جس دن درخواست دی جائے گی۔ اب کہو کیا ارادہ ہے؟ اور سلّو کو بحیثیت چھوٹی خالہ جان کے کیا مشورہ بتاؤ گی۔ گجن کے آنے میں بقول تمھارے ابھی دیر ہے۔ رہے سلمان ان کا جب جی چاہے تشریف لائیں۔ ہمارے جانے کی ابھی کوئی تاریخ نہیں ہوئی ہے۔ یوں جس وقت اٹھ کھڑے ہوں۔ تصویروں کے پارسل کا انتظار ہے۔ اسی کے ساتھ خطوط کا بھی خیال آتا ہے، مگر وہ اللہ میاں اور اس سے اتر کر صلاح الدین صاحب کے ہاتھ میں ہے (ہما! کلمۂ کفر تو نہیں ہوا) چونکہ مفلوج ہوں اور ہر وقت پابہ رکاب ہوں، اس لیے اللہ میاں کی خوشامد کا خیال ہر وقت رکھتا ہوں۔ حالانکہ ان اللہ یغفر الذنوب جمیعاً واللہ غفورالرحیم سے انشاء اللہ تعالیٰ دل مضبوط ہے۔ تمھاری اشعار والی کتاب کا کیا حال ہے؟ آفاق ہر طرح سے اس کتاب کے اوپر کام کرنے کو تیار ہیں، مگر کشتی درچمین و ملاح درفرنگ یہ بڑی مشکل ہے۔

اچھا میری جان، تم سطروں کی احتیاط سے دیکھتی ہوگی کہ ابھی اور لکھنے کا ارادہ تھا مگر اب بیٹھے بیٹھے کچھ پیٹھ میں درد سا شروع ہو رہا ہے اور حق بات تو یہ ہے کہ کوئی مضمون بھی سمجھ میں نہیں آرہا ہے، اس لیے ختم کرتا ہوں۔ آفاق تسلیم کہتے ہیں۔ نوشاد دعا کہتے ہیں۔ جابر بے چارے جس قابل ہیں ہر وقت خدمت کو تیار رہتے ہیں۔ تم کو تسلیم عرض کرتے ہیں۔ قیصر لکھنؤ گئی ہیں۔ صوفیہ کے لڑکی ہوئی ہے۔ وہاں سب بچوں کو دعا۔

راقم

دعا گو، تمھارا باپ عفی عنہ

(۱۱۷)

ہما بیگم کے نام

ردولی یکم دسمبر ۱۹۵۵

ہما پیاری دعا! تم کو خط لکھنے کا کوئی معقول عذر ڈھونڈھ رہا تھا۔ حسن اتفاق سے بڑا عمدہ حیلہ ہاتھ آیا۔ امریکہ کا مشہور میگزین ریڈرز ڈائجسٹ (Reader's Digest) جو مختلف زبانوں میں ہر ماہ اٹھارہ ملین سے زیادہ چھپتا ہے۔ وہ انشاء اللہ تعالیٰ دسمبر کے مہینے سے لاہور سے نکلے گا۔ اس کی سالانہ قیمت یوں تو اٹھارہ روپے ہے لیکن اگر پہلے سے بھیج دیے جائیں تو بارہ روپے ہیں۔

اتنا لکھ کر نہ معلوم کیوں چھوڑ دیا تھا۔ کفایت شعاری کی نظر سے آج پھر شروع کرتا ہوں۔ رب یسر و لاتعسر و تمّم بالخیر۔

واہ پیاری ہما بیگم واہ جب مکان تمھارا معماروں، مزدوروں، مستریوں کا پابند اور تم اس کی پابند تو مجھ بوڑھے خرف کو کیوں الو بنایا کہ منتظر رہو ہم آتے ہیں اور سلو کو بھی ساتھ لاتے ہیں۔ آج تم نے تصویریں بھیج دیں۔ کچھ اشک شوئی ہوگئی مگر سوختی کی تکلیف ہے۔ بھلا خیال تو کرو پچھتر برس کا آدمی دو برس سے فالج میں مبتلا۔ تمھارا نام لے لے کر جیتا ہوں اور تم یہ سلوک کرتی ہو۔ بار الٰہا ہما کو اس مکان میں تادیر راج رجنا نصیب کرے۔ اپنی اولاد کا کھیل دیکھنا نصیب کرے۔ اپنے سہاگ کا راج تا بہ مرگ نصیب کرے۔ آمین! مگر یہ حرکت کیا تھی۔ مکان ماشاء اللہ بہت دنوں میں ہر پہلو سے پورا درست ہوگا، میں کہاں تک اس انتظار میں بیٹھا رہوں گا۔ سلو کی آس لگی تھی وہ بھی نہ پوری ہوئی۔ خیر بی بی خدا تم کو اور تمھارے بچوں کو سلامت رکھے۔ ہم یوں بھی خوش ہیں۔ ریڈرز ڈائجسٹ اردو دیکھیں کس رنگ کا ہوتا ہے۔ اگر ترجمہ اسی درجے کا ہوا جیسی انگریزی

وغیرہ ہوتی ہے تو اردو میں لاجواب چیز ہوگی۔ صرف یہ عیب ہے کہ ایک یا دو مضامین پروپیگنڈہ کے ہوتے ہیں۔ خیر ان سے ہوشیار رہیں گے۔ اخلاق سے میری دعا کہنا کہ تم بلرامپور ہسپتال لاہور سے مجھے دیکھنے آئے تھے۔ اگر میاں بی بی مل کر ایسی راہ نکالو کہ میں ہما کو ایک مرتبہ اور دیکھ لوں تو تم کو دعائیں دوں گا۔

راقم

محمد علی عفی عنہ، مفلوج مجبور دعاگو

(۱۱۸)

ہما بیگم کے نام

ردولی　　　　　　　　　　　　　　　　　　پہلی جنوری

ہما پیاری دعائیں قبول کرو۔ تمھارے خطوط سے زندگی بڑھ جاتی ہے یا موت پیچھے ہٹ جاتی ہے۔ پوری طور سے سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہوتا ہے مگر ہوتا ہے کچھ ایسا ہی۔ اَلّن، کِجّن، چھبّن کے خطوط سے بھی کچھ نفع اسی طرح کا پہنچتا ہوگا۔ مگر وہ بہت دیر دیر میں پہنچتا ہے اور شاید بالکل تمھارے والے خطوں والا نہ ہو۔ بعض پہلوؤں سے ممکن ہے زیادہ آرام ملتا ہو مگر تمھارے خطوں کی کچھ اور ہی بات ہے۔ آئرلینڈ میں ایک Belarmy Stone ہے جو اس کو بوسہ دے آتا ہے وہ عورتوں کو خوش کرنے کی باتیں خوب کرنے لگتا ہے۔ کوئی اس پتھر کا بوسہ لینے کے بعد بیاہ کرتا ہو، ہم تو اپنی بیٹی سے Belarmy کی باتیں کرتے ہیں۔ کسی کے باپ کا اجارہ، اچھا بیٹی ''من چہ می سرائم وتنبورۂ من چہ می سراید'' تم خط میں کچھ باتیں لکھتی ہو اور ہم کچھ لکھتے ہیں۔ لہٰذا آج تمھارا خط سامنے رکھ کر لکھ رہا ہوں۔

آفاق کو تمھارا خط دکھا دیا۔ آج 6 / تاریخ ہے اور ان کے یہاں عرس ہوتا ہے چاند کی 15 کو۔ بھولی ہوئی باتوں کی یاددہانی کی ضرورت نہیں۔ جابر اب بالکل اچھے ہیں ماشاء اللہ جب سے علاقہ گیا آٹھ آنے روز پاتے ہیں مگر ان کا دل چاہا کرتا ہے کہ اور ہوتا۔ داڑھی والی تصویر اب شاید مشکل سے ملے۔ تم پھر تلاش کرو اور کھنچوا کر بہت سی بھیج دو۔ ماشاء اللہ رضا(73) کی کامیابی پر چھاتی پہاڑ ہوتی ہے۔ مگر ان کے موٹر کار کے شوق پر جب یاد آتے ہیں تو ان کو امام ضامنؑ کی ضمانت میں اور چہاردہ معصومینؑ کی امان میں اور خدا کی حفاظت میں سونپتا ہوں۔

ریڈر ڈائجسٹ کے بابتہ میں چاہتا ہوں کہ جب تمھارا امکان ہوگا تو مجھ کو بھیج دوگی۔

انشاء اللہ تعالیٰ۔ صلاح الدین اور خطوط کی وجہ سے تم کو خدا واسطے کو یہ پریشانی ہوگئی ہے۔ انھیں طرح کی باتوں پر تو میکالے (Macaulay) یاد آتا ہے جس نے بنگالیوں کو خصوصاً اور ہندستانیوں کو عموماً گالیاں دی ہیں۔

ہ ں میری جان سب باتوں کا جواب شاید ہوگیا ہو۔ اور ابھی جگہ باقی ہے، بچوں کو چھوٹے بڑے سب کو درجہ بدرجہ دعا اور پیار، قیصر بھی دعا کہتی ہیں۔ جابر اور سعید دعا اور تسلیمات درجہ بدرجہ کہتے ہیں، آفاق بھی، تجّے سے ملاقات ہوتی ہے؟ میری دعا کہنا۔

دعا گو

تمھارا باپ عفی عنہ

---

(۱۱۹)

ہما بیگم کے نام

ردولی

۴؍جنوری ۱۹۵۶

میری جان دعاہائے فراواں اور دعاہائے اشتیاق دیدار۔ کل شام کو تمھارا تیسرا خط آیا۔ میں دو خطوط بھیج چکا ہوں۔ پیٹ کی خرابی کو تو میں بھول گیا مگر موت کی یاد ویسی ہی ہے۔ قلب کی یہ حالت ہوگئی ہے کہ جیسے کوئی پرانا ستار تانپورہ ہو جس کے تار اترے ہوئے کھونٹیاں ڈھیلی ڈھالی پڑا ہو اور چوہا بھی اس پر سے دوڑ جائے تو تمام تار بے سرے جھن جھن کرنے لگیں۔ یہ حال ہمارے قلب سلمہ کا ہے۔ چنانچہ رات بہت کم سوئے، مُنَوِّم دوا جو عورتوں کو ہسٹریا میں دی جاتی ہے وہ بھی پی مگر یہ حال رہا کہ ہم سمجھے کہ ہم جاگ رہے ہیں۔ اور گھڑی دیکھی تو معلوم ہوا کہ تقریباً چار گھنٹے ہوئے۔ یہ حال ہے بی بی کہ سوتا بھی ہوں تو معلوم ہوتا ہے جاگ رہا ہوں۔ اس وقت بحمد للہ بالکل اچھا ہوں۔ رات ارادہ تھا کہ صبح کو ڈاکٹر کو بلواؤں گا۔ اب اس وقت کوئی وجہ فضول خرچی کی نہیں معلوم ہوتی۔ تم کو یہ تمام باتیں اس واسطے لکھتا ہوں کہ فی الجملہ مطمئن ہو جاؤ مگر مفارقت عظیم کے لیے تیار رہو، نہ ہو تو بہت دن نہ ہو اور ہو تو بقول پنجابن مرحومہ کے بل دے آنکھی کاڑھ وس، پھٹر وے پران نکس گوا۔'' چھبن کو میں نے خط لکھ دیا ہے، مگر ان کے خط میں یہ گلفشانیاں کہاں کر سکتا تھا۔

والدعا

محمد علی عفی عنہ

ہما بیگم کے نام

ردولی ۲۵؍جنوری ۱۹۵۶

ہما پیاری۔ تم میرا دل پہچانتی ہو، کسی نہ کسی طرح ہم کو خوش کرنے کا سر انجام کرلیتی ہو۔ اللہ میاں اس کا اجر تم کو اِس دنیا میں اور اس دنیا میں دے۔ آمین ثم آمین۔ میاں کھدّن کو خوشخبری دے دی۔ اب پارسل کا انتظار ہے۔

اخلاق کی کتابیں میرے پاس کوئی نہیں۔ اخلاق حسنہ ہی کبھی نہیں رہے کتاب کہاں سے رہنے پاتی۔ اس معاملے میں اگر زندہ رہا تو بعد کو کچھ عرض کروں گا۔ ماسویہ کی ایک کتاب ہے 'کتاب الطہارت' اس کا ترجمہ اردو میں سید ظفر مہدی صاحب تعلقہ دار جرَول نے کیا تھا۔ وہ کتاب اب شاید راجہ صاحب محمودآباد کے کتب خانے میں ہو۔ مگر للّن صاحب کا دسترس اس پر نہ ہوگا۔ میاں سلمان کے بارے میں معلوم ہوا کہ اب پاکستان نہیں آرہے ہیں ہم کو کچھ تکلیف نہیں ہوئی۔ جیسے سیّاں گھر رہے ویسے ہی رہے بدیس۔ ان کی یاد سے ایک گونہ تکلیف سی ہوتی ہے اور کچھ نہیں۔ میں نے ان کے خط کا جواب تم کو بھیجا تھا۔ اللہ کرے تم کو پہنچ گیا ہو اور تمھارے کچھ آنوں کا میں اور قرض دار ہوگیا ہوں۔

راقم

تمھارا باپ عفی عنہ

ہما بیگم کے نام

ردولی ۹؍فروری ۱۹۵۶

ہما پیاری دعا۔ تم کو آج کئی دن سے خط نہیں لکھا۔ وجہ یہ کہ میں صبح ہی کو لکھ سکتا ہوں۔ اتنے دن خط نہیں لکھا تو زندگی کیوں کر کٹی۔ معلوم ہوا کہ زندگی ہر طرح کٹ جاتی ہے۔ اسی کوشش میں روز ارادہ کرتا تھا مگر چونکہ آفتاب چہرے اور آنکھ پر چمکتا تھا۔ اس لیے ہمت کر کے رہ جاتا تھا آج نئی دریافت ہوئی کہ اگر ٹھنڈے میں بیٹھوں اور اسباب مناسب ہوں تو تیسرے پہر کو بھی لکھ لیتا ہوں۔ اس وقت بدرل بیٹھے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ عسکری حسن صاحب نے حیدرآباد سے تم کو بھی سوانح عمری حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور تاریخ آل محمدؐ بھیجی ہے۔ نہ معلوم پہنچی یا نہیں۔ تمھارے میاں کے پتے سے بھیجا تھا۔ وہ کتاب جو بہلول بہجت نے لکھی ہے بڑی زبردست کتاب ہے اور دوسری کتاب بھی اچھی ہے۔ مگر مترجم صاحب بیچارے کچھ سادہ دل اور نیک نیت معلوم ہوتے ہیں۔ مگر ان کی شکایت کہ لوگ ان کو بے تعصب نہیں مانتے، کچھ بے جا سی معلوم ہوتی ہے۔

دعا گو

محمد علی عفی عنہ

ہما بیگم کے نام

ردولی　　　　　　　　　　　　　　　　　۳؍مارچ ۱۹۵۶

ہما پیاری دعا۔ آج جمعہ ہے۔ منگل کو قریب دو بجے کے سلّو[74]، شبّر اور ان کی لڑکی روّمین اچانک آ گئے۔ عجیب طرح کی خوشی ہوئی۔ کل وہ لوگ شام کی گاڑی سے مرادآباد گئے۔ سیدین صاحب کی چھوٹی لڑکی کے بیاہ میں دہلی آئے تھے۔ اسی سلسلے میں مزید تکلیف اٹھا کر ہم لوگوں کو بھی خوش کر دیا۔ رات کچھ نیند کم آئی صبح کو اٹھ کر ایک خط اللّن کو لکھا۔ ابھی کجّن سے کچھ باتیں میاں سلمان کی ہونے لگیں تو میں نے کہا کہ لاؤ تم سے پوچھ لوں کہ جو خط سلمان کے نام لکھ کر تم کو بھیجا تھا وہ تم نے سلمان کو بھیج دیا تھا نا؟ کجّن بھی پہلی مارچ کو جارہی ہیں۔ ہم ابھی سے گھبرا رہے ہیں۔ حالانکہ امام زین العابدینؑ کی دعائیں بہت کچھ سنبھال لیتی ہیں۔

قیصر دعا کہتی ہیں۔ جابر سعید تسلیم کہتے ہیں۔ دوسری طرف کجّن نے لکھا ہے۔ ادھر اپنی جگہ ہم ہی پوری کر دیں۔ تمھارا ذکر خیر اکثر ہوتا رہتا ہے نہ معلوم اخلاق حسنہ پر جو کتاب تم لکھنے والی تھیں وہ شروع ہوئی یا نہیں؟ کتاب کا شروع کرنا تو سہل ہے مگر مطبع والوں سے ختم کروانا مشکل ہوتی ہے۔

دعا گو

تمھارا باپ عفی عنہ

ہما بیگم کے نام

ردولی

۱۴/مارچ ۱۹۵۶

ہما پیاری دعا! تمھارے لفافے کا جواب لکھ رہا ہوں۔ خدا کرے توکل اور اللہ میاں پر بھروسہ کرنے کی اوگت مجھ کو آجائے پھر کیا کہنا ہے۔

خطوط کی کتابت جو تم چھپوا رہی ہو اس کو تو میں بھول ہی گیا تھا۔ بہرحال اس میں کسی کا نام اس طرح نہ ہونا چاہیے کہ دنیا میں کسی کو بھی ناگوار ہو۔

ہما بیگم ہم آج کل کچھ پریشان زیادہ ہیں۔ ادھر بجن تھیں، پھر سلّو شبّر آگئے۔ اب میاں آفاق باہر جانے والے ہیں۔ معلوم نہیں ہماری طلبی کب ہوگی۔ قیصر ایک دن کے لیے لکھنؤ گئی ہیں۔ بچوں کو دعا۔

دعا گو

محمد علی عفی عنہ

ہما بیگم کے نام

ردولی ۱۸؍مارچ ۱۹۵۶

ہما پیاری، دعائیں! نہ معلوم کتنے خط لکھنا ہیں، نہ معلوم کیا کیا دھواں ایسا دماغ میں بھرا ہے مگر صرف تم کو خط لکھ کر جی خوش ہوتا ہے۔ میاں سلمان آئے ہیں۔ خدا تم لوگوں کو مبارک کرے۔ ہم نہ معلوم ان کو دیکھیں بھی یا نہیں۔ اگر دیکھیں تو شکایتیں کر کے خود اپنا بھی مزاج بدمزہ کر دیں اور ان کا بھی یا نہیں۔ یہ صرف اللہ میاں جانیں۔ ہاں بیٹی میں نے عام بات کہہ دی تھی کہ سب نام نکال ڈالے جائیں۔ کوئی نام بھی خطوط میں نہ چھپے۔ ہم مرتے دم تک کسی کو رنج یا تکلیف خدا کے واسطے کو کیوں دیں۔ بی بی اس کا لحاظ رکھنا خدا کرے تم لوگ خوش اور اچھے ہو۔ پوتی مبارک، سب کو دعا کہنا، قیصر دعا کہتی ہیں اور مبارک باد۔

دعا گو

محمد علی عفی عنہ

---

(۱۲۵)

ہما بیگم کے نام

ردولی ۲۶/مارچ ۱۹۵۶

ہما پیاری دعائیں لو! جی چاہتا تھا تمھارا خط کراچی سے آتا تو وہ آگیا۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ اس وقت بہت جی گھبراتا تھا۔ اب بھی گھبراتا ہے۔ مگر کم۔ ہاں بیٹی میاں سلمان آئے۔ حال معلوم ہو۔ انشاء اللہ تعالیٰ ردولی بھی آئیں گے اور زیادہ دل خوش ہوگا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ محمود اور عابد کا حال سن کر شگفتہ ہوا۔ اللّن کا حال سن کر جی بحال ہوا۔ چھبّن کا حال سن کر دل کچھ بیٹھ سا گیا۔ خدا ان کو اچھا رکھے۔ آمین ثم آمین۔

جابر کے کم و بیش ورم معدہ ہے۔ جب وہ کراچی گئے تھے تب ہی تھا۔ اپنی والی کوشش تو کرتا ہے مگر بالکل صحت نہیں ہے۔ تب بھی میری دل دہی اور میرا کام ہر وقت کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ آج کل آفاق پیٹ کے لیے کچھ اپنے معتقدین کے یہاں گئے ہیں۔ ہم ہُڑک رہے ہیں حسبی اللہ و نعم الوکیل نعم المولیٰ و نعم النصیر۔ کا ورد کرتا ہوں۔ ڈھارس سی ہوتی ہے۔

ایک شخص ہیں مولانا محمد خاں صاحب شہاب۔ مالیر کوٹلہ کے رہنے والے ہیں۔ مذہبی آدمی ہیں اور لائق آدمی ہیں میرا دل چاہتا تھا کہ تمھاری کتاب بھولی ہوئی باتیں وہ دیکھ لیتے مگر مفت تمھارے ڈھائی روپے جائیں گے۔ وہ بے چارے مولوی قسم کے آدمی ہیں مگر روسی خیال، تمھاری تحریر میری بابت نقوش میں پڑھ چکے ہیں اسی وجہ سے میرا مذہب مجھ سے منگوایا اور باوجود احتیاط کے بہت جی کھول کے اس کی تعریف کی۔ اگر تمھاری والی کتاب لیں گے تو یقیناً تمھارے عقیدت مند ہوجائیں گے اور اس طرح میں بہت خوش ہوں گا۔ ان کا پتہ حسب ذیل ہے:

مولانا مہر محمد خاں صاحب شہاب 4/13.B.I.T.Block Nileay 3.13 ابراہیم رحمت اللہ روڈ۔

ارے میری جان تم کو پوتی کی مبارک باد دے چکا ہوں، مگر وہ خط لاہور بھیجا تھا۔ قیصر اور ہم سب کو دعا کہتے ہیں جابر اچھے ہیں۔

دعا گو،

محمد علی عفی عنہ

(۱۲۶)

ہما بیگم کے نام

ردولی　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　پہلی اپریل ۱۹۵۶

ہما پیاری دعا! بے عیب ذات خدا کی۔ جس طرح چاند میں دھبے ہیں اسی طرح تم میں بھی ایک آدھ خامیاں ہیں۔ یعنی باتیں زیادہ کرتی ہو اور اکثر باتیں کہہ جاتی ہو اگر نہ کہی جاتیں تو اچھا تھا۔ تمھاری بہنیں اکثر یہ عیب تمھارا بیان کرتی رہتی ہیں اور میں اس طرح سنتا ہوں گویا مجھ سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔ حالانکہ میرا ضمیر مجھ کو ٹہوکے دیا کرتا ہے کہ یہ عیب تم کو میری طرف سے ملا ہے۔ اس کی تازہ سے تازہ مثال یہ ہے کہ تم نے سلمان کا پروگرام لکھ مارا کہ وہ ۲۵ کو لاہور کے لیے ریل پر چڑھیں گے۔ یہ پہلے ہی لکھ چکی تھیں کہ ردولی جلد آئیں گے تو میں نے یہ حساب لگایا کہ ۲۶ کو لاہور پہنچیں گے اور ۲۷ کو دوپہر کے قریب لکھنؤ۔ لہٰذا شام و شام ردولی پہنچ جائیں گے۔ گو انھوں نے وہ برتاؤ کیا ہے کہ مجھ کو بڑی بیتابیِ آخری دیدار کی نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی اولاد ہیں اس لیے ریل کے وقت ہر روز انتظار ہی ہے اور یہ شعر اکثر یاد آتا ہے۔

رہ گئی بات کٹ گئی شبِ ہجر
تم نہ آئے تو کیا سحر نہ ہوئی

اچھا بیٹی اللہ کرے تم لوگ سب کے سب خوش رہو، اور اللہ ہم کو بھی بخشے۔ بحق محمدؐ و آلِ محمدؐ صلوٰۃ اللہ علیہم اجمعین۔ قیصر اور ہماری سب کو دعا پہنچے۔ ہم کو بڑی تکلیف ہے آج کل آفاق کے نہ ہونے سے۔ ہم ہڑک رہے ہیں۔

محمد علی عفی عنہ

---

(۱۲۷)

ہما بیگم کے نام

ردولی ۱۰/اپریل ۱۹۵۶

میری جان! دعا۔ تمھارا معذرت نامہ آیا۔ تمھاری معذرت قبول ہوئی اگر کوئی اتہام تم لگاتیں تو وہ بھی قبول ہوتا۔ ع

ہر چہ از دوست میرسد نیکوست

اس وقت سوا آٹھ بجے ہیں۔ سلمان بال کٹوا رہے ہیں۔ مُنّن(75) اور ہم بیٹھے خاندان کے تمام لوگوں کی تصویریں کھینچ رہے ہیں۔ بی مُنّن نہایت اطمینان سے عمدہ عمدہ خاکے مختلف چہروں کے کھینچ کر ہمارے سامنے پیش کر رہی ہیں۔ ہم اپنی عادت کے مطابق کسی کی ناک ٹیڑھی بنا رہے ہیں، کسی کا دہانہ بہت چوڑا دکھا رہے ہیں، کسی کی آنکھیں بھینگی بنا رہے ہیں۔ قصہ مختصر اپنی سیہ درونی کی وجہ سے عیب زیادہ اور ہُنر کم دکھائی دے رہے ہیں۔ مگر تمھاری تصویر میری جان! ایسی بنا رہے ہیں کہ لیونارڈو ڈانچی کی ''مونا لیسا'' اور ''رفیل کی'' ''ماڈانا'' مات ہیں۔

بس میری جان اب نہیں لکھنے کو دل چاہتا۔ گو میں بالکل اچھا ہوں بحمد اللہ۔ مگر یہ جان لو کہ مورا دِن دِن بڑھت سُہاگ جاؤ سکھی سیاں کو لے آؤ۔'' سلمان کو دیکھنے کے لیے سعید کو اسکول سے بلوا لیا تھا۔ دل تو ان کا سونے کا ہے مگر بچپن کی تربیت اپنا رنگ دکھا رہی ہے۔ دل کو دبا کر کام کرنے کا شوق نہیں ہے۔ اچھا بیٹی خدا حافظ۔ مُنّن تم کو تسلیم کہتی ہیں، اور سلمان دعا کہتے ہے۔ اے لو یہ غلط ہوگیا۔ سلمان ہما اپیا کی خدمت میں تسلیمات عرض کرتے ہیں۔

دعا گو

تمھارا باپ عفی عنہ

ہما بیگم کے نام

ردولی — ۳۰/اپریل ۱۹۵۶

ہما پیاری۔ دعا! تم کو نہ معلوم کب سے خط نہیں لکھا۔ یقیناً یہ اس وجہ سے ہوا ہوگا کہ تم نے خیال کیا ہوگا کہ میاں جان، سلمان کی وجہ سے بہل گئے ہوں گے اس لیے ہمارے خط کی ضرورت نہیں اور یہ بھی خیال رہا ہوگا کہ میاں جان کا خط آتا ہوگا تب جواب لکھ دیں گے۔ قصہ مختصر ہماری ذہنیت ایسی انانیت کی ہے کہ سب کچھ ہمارے ہی لیے ہے اور سب ہمارے ہی خیال میں غرق رہتے ہیں۔ گویا ہم بقول جناب امیر کے وہ کھونٹی ہیں جس پر چکی گھومتی ہے۔ حالانکہ ہم وہ کھونٹی ہیں جس میں دھوبی پہلے گدھا باندھتا تھا مگر اب اتنی بوسیدہ ہوگئی ہو کہ گدھے نے توڑ ڈالا ہو اور دھوبی نے پروا نہ کی ہو۔

نہ معلوم مہر محمد خاں صاحب کو تم نے بھولی ہوئی باتیں بھیجی یا نہیں؟ اگر نہ بھیجا ہو تو جانے دو۔ وہ بے چارے صرف مولوی ٹِتا معلوم ہوتے ہیں مگر واقعی نیک آدمی ہیں میں تم کو اکثر فرمایش کر کے پریشان کرتا ہوں چنانچہ اب کی بار میں نے اُلّن کو لکھا ہے کہ مجھ کو کلیات اکبر الہ آبادی'' اور'' امراؤ جان ادا''۔ بھیج دو یہ تقریباً کوئی تیس روپے کا لٹکا ہے مگر لکھا ہے کہ یہاں جس کو کہو وہ رقم دے دوں۔ مگر میرے خیال میں اگر یہ کتابیں بھیجیں تو یہ بھار جا انھیں پر پڑے گا۔ ہاں بیٹی اب کون باتیں کریں۔ سلمان تو کراچی میں براج رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اب بس باپ سے دور ہی کی دوستی اچھی ہے۔ تم میری جان اپنا حال لکھو۔ کیا کر رہی ہو؟ کیا مشغلہ آج کل ہے؟ مکان کی تعمیر ماشاء اللہ مکمل ہوگئی ہوگی۔ میاں جابر دُبلے ہوتے جاتے ہیں۔ ظاہراً تندرست ہیں۔ علاج ہوتا ہے مگر وہ خود مٹھائی گھی اور گڑ سے علاج کرتے ہیں کہ دوا اور ڈاکٹر دونوں بھاگ نکلتے ہیں۔

راقم تمھارا باپ عفی عنہ

(۱۲۹)

ہما بیگم کے نام

ردولی　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　۷؍مئی ۱۹۵۶

ہما پیاری! اس گنہگار کی دعائیں نہ معلوم کہ قبول ہوں گی کہ نہیں مایوسی کا نام خدا کے ماننے والوں میں نہیں ہے۔ اس لیے امید ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ قبول ہوں گی۔ فلہٰذا میری دعائیں اپنے لیے سنو۔ بار الٰہا میری اولاد میں ایک ایک کو ان کے دلی مقاصد میں کامیاب کر اور سب کو یہ توفیق دے کہ میری خبر سن کر روئیں کم اور اس گناہ گار کے لیے دعائے مغفرت زیادہ کریں۔ بار الٰہا جو کمی ان کے حق دینے میں مجھ سے سرزد ہوئی ہے وہ تو اس طرح معاف کر کہ ان کے حقوق سے زیادہ دے کر میرے اوپر سے یہ دَین اٹھا لے۔ بار الٰہا سب کو خوش حال رکھ۔ اور ہما کو دنیا میں تا دیر قائم رکھ اور جب اپنے حضور طلب کر تو اس کے خدمات کا بدلہ۔ نیک ترین بدلہ ایسا دے جو تو ہی دے سکتا ہے! آمین رب العلمین! ہما پیاری! ملاّ کی دوڑ مسجد تک جب دل گھبراتا ہے تو تم یاد آتی ہو۔ اور تمھیں خط لکھتا ہوں۔ میرے خیال میں بقول امام زین العابدین علیہ السلام کے اللہ میاں نے اپنے اس بندے کی بیماری طولانی صرف اس واسطے کی ہے کہ اس سیاہ کار کے گناہ کچھ کم ہو جائیں۔ ورنہ اب ہمارے جینے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ لوگوں پر جسمانی اور روحانی بار۔ کام کے نہ کاج کے، دشمن اناج کے۔ کب تک یہ سلسلہ رہے گا۔ اس کو خدا ہی جانتا ہے۔ جو لوگ محبت کرنے والے تھے وہ تھک گئے ہیں۔ جو خدمت کرنے والے تھے وہ خیال کرتے ہیں کہ فرمائشیں زیادہ کر دو۔ نوکر تو کہیں ملتا نہیں ہے۔ میاں کے مختلف طریقوں سے جونک لگاؤ۔ بیماری کی وجہ سے بدمزاجی بڑھ گئی ہے۔ اس کو لوگ بجائے بیماری کے بدنفسی پر محمول کرتے ہیں۔ اب نہ لکھیں گے بیٹی۔ چاہتے تھے کہ اس طرح دل ہلکا ہو جائے مگر مناسب یہی ہے کہ:۔

آہ بہ دل نہفتہ ایم. نالہ بہ لب شکستہ ایم
دولتیاں ممسک ایم. زر بہ خزانہ کردہ ایم

تمھارا شیدائی
تمھارا باپ عفی عنہ
۳ مئی۔ بست و یکم رمضان المبارک

جناب امیر علیہ السلام کا پُرسہ لو:۔

بریں زیستم ہم بریں بگندم
تو گوئی غلامِ شہ قنبرم

مکرر آنکہ صبح کو عموماً ایک خط لکھ لیتا تھا، مگر آج وہ بھی نہ لکھا گیا۔ مولانا محمد حسین آزاد مرحوم و مغفور کی۔'' سپاک رنماک'' پڑھی ہے؟ آخر عمر میں مرحوم سڑی ہو گئے تھے۔ تب یہ کتاب لکھی تھی۔ کہاں وہ مرحوم اور کہاں یہ راقم جاہل۔

ہما بیگم کے نام

رودولی ۲۱؍مئی ۱۹۵۶

ہما پیاری! ایک خط اور ایک تار دو مختلف آدمیوں کو لکھ چکا ہوں۔ تار تو صلاح الدین کو ہے جن کی لڑکی کا بیاہ ہے۔ وہ بھی پوسٹ کارڈ ہی تھا مگر مطالب بہت تھے۔ اب لکھنے کو جی نہ چاہتا تھا مگر ہما بیگم صاحبہ کے خط کا جواب بتاؤ کیوں کر نہ لکھتا۔

بی بی اپنے مونہہ سے اپنی تعریف کچھ اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ مگر زندہ ہوں کمال کر رہا ہوں۔ دوسری آفت یہ آئی کہ میاں سعید اپنے اسکول میں درخت سے گر پڑے۔ ان کا پاؤں دو جگہ سے فریکچر ہوگیا۔ پاؤں پر پلاسٹر چڑھا ہے۔ اللہ کا شکر ہے۔ بی بی تھک گیا ہوں۔ انشاء اللہ تعالیٰ پھر لکھوں گا۔

تمھارا خادم دعا گو محمد عفی عنہ

ہما بیگم کے نام

ردولی ۲۶/جون ۱۹۵۶

ہما پیاری! روز روز انتظار رہا کہ اب ہما کا خط آوے۔ اب آتا ہوگا، آج ضرور آئے گا۔ مگر وائے ناکامی۔ مختصر دن عمر کے گزر رہے ہیں، اور تمھارا خط نہیں آیا۔ آج اختلاج ہوا کہ کہیں خدا نخواستہ۔ نصیب دشمناں مزاج نادرست نہ ہو۔ اس لیے یہ خط لکھا۔ تار بھیجنے کو جی چاہتا تھا۔ مگر حسن کی علالت کی خبر سنتا ہوں۔ نماز کے بعد جب بچوں کے لیے دعا مانگتا ہوں تو سرسری دعا میں بالخصوص خیال چھبن کا آجاتا ہے۔ اس کے بعد دماغ میں آپ کی سواری آتی ہے۔ اسی کے ساتھ اختلاج ہونے لگتا ہے۔ دو دو تار بھیجنا کھلتا ہے۔ اس لیے رہ جاتا ہوں۔ یہ اکثر ہوا ہے کہ ہمارے تمھارے خطوط، دلوں کا تقاضا جو بیک وقت ہوتا ہے۔ اس کے اثر سے راستے میں ساتھ مل جاتے ہیں۔ یہ امید بھی لگی ہے۔ بہرحال خط آنا چاہیے۔ عجلت کرو۔ عجلت کرو، اس کے پیشتر کہ اجل آوے۔

تمھارا خادم۔ مشتاقِ دیدار

تمھارا باپ عفی عنہ

ہما بیگم کے نام

ردولی ۴؍ جولائی ۱۹۵۶

ہما پیاری! دعا۔

اپنے دماغ میں تم کو اکثر خط لکھا کرتا ہوں۔ معلوم نہیں خیالی خط لکھا ہے یا سچ مچ کا۔ یقیناً خیالی خط رہا ہوگا۔ اول تو بات اس طرح یاد آتی ہے جیسے کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ دوسرے تمھارا ہمیشہ کا دل دوز خط پا کر یہ بھی خیال دل میں جما ہوا تھا کہ ابھی ہما ایک اور خط کی قرض دار ہوں گی نہ معلوم واقعی یا ہمارے خواب و خیال میں اچھا ہوگا۔ آج کل میں نئی لائبریری لاہور کی ''امراؤ جان ادا'' پڑھ رہا تھا۔ بیچاری الّن کو خدا خوش رکھے، اس نے میری فرمائش پر کراچی بھر میں تلاش کر کے بھیج دی۔'' کلیات اکبر'' بھی مانگا تھا۔ ان کو صرف پہلا حصہ دستیاب ہوا۔ مگر نہ معلوم کن مشکلوں سے دوسرا حصہ حسن اتفاق سے میرے یہاں نکل آیا۔ تیسرے حصے کی آرزو ہے۔ میرا مکمل ''کلیات اکبر'' نہ معلوم کون لے گیا۔ اس میں سینکڑوں جگہ پسند کے نشانات میں نے لگائے تھے۔ اِدھر اُدھر کے سادہ اوراق پر نہ معلوم کون کون تنقیدی۔ تقریظی اور تعریفی باتیں لکھی تھیں۔ اب اگر دوسرے دیوان ملے بھی تو وہ تحریریں کہاں سے آئیں گی۔ مگر ہوس اب بھی کہتی ہے کہ تیسرا حصہ مل جائے تو پھر سے کلیات مکمل ہو جاتا۔ قبر میں پاؤں لٹکائے ہوں۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ میری آنکھیں بند ہونے کے بعد میری کتابیں نہ معلوم کس نخاس[1] میں ٹھکانے لگیں۔ مگر ہائے ہوس۔ بھاڑ میں جائے ہوس۔ پھر بھی وہی شوق ہے جیسے ہم ہمیشہ یہی کتابیں پڑھا کریں گے۔ حالانکہ وہاں اعمال نامہ پڑھنا پڑے گا۔ جس سے دل ہل رہا ہے۔

اچھا بیگم سنو! ہمارا جی سب بچوں کو دیکھنے کو چاہتا ہے مگر تم کو سب سے زیادہ۔ بالکل

---

[1] لکھنؤ کا وہ بازار جہاں پرانی چیزیں فروخت کی جاتی ہیں۔

بچوں ایسا دل ہوگیا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ مچل جائیں کہ ہم تو ہما کو لیں گے۔ تم بی بی اس کا بالکل خیال نہ کرنا۔ یہاں آفاق وغیرہ ہیں۔ کوئی مٹی کا کھلونا وغیرہ دے کر ہم کو بہلا لیں گے۔ بھلا تم اپنے فرائض کا دھندا چھوڑا کر کہاں آؤ گی۔ تم ہما اِن سٹھیانی باتوں کا کچھ خیال نہ کرنا۔ سعید کا پاؤں جو ٹوٹ گیا تھا ابھی تک پلاسٹر میں ہے۔ اچھے ہیں۔ جابر اچھے ہیں صرف دُبلے ہیں۔ قیصر سب کو دعا کہتی ہیں، اور جابر سعید بھی تسلیم عرض کرتے ہیں۔ اے لو! میں نئی ''امراؤ جان ادا'' پر تنقید کرنے والا تھا۔ کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ خیر انشاء اللہ کسی آئندہ خط میں لکھوں گا۔

تمھارا باپ

محمد علی عفی عنہ

''...... اللہ تعالی کی شان رحمت سے پوری توقع ہے کہ وہ ان کی مغفرت فرمائے گا۔ جس طرح ان کی زندگی میں شیعہ وسنیوں سے ان کے یکساں تعلقات تھے اسی طرح ان کی وفات کے بعد بھی ان کی وصیت کے مطابق دونوں نے الگ الگ ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔ چودھری صاحب جس تہذیب کے یادگار تھے اب وہ تہذیب مٹ چکی ہے اس لیے ان کی موت سے ایک پورے دور کا خاتمہ ہوگیا۔ اور اب ایسے نمونے پیدا نہ ہوں گے۔

یادگار زمانہ تھے یہ لوگ　　سن رکھو تم فسانہ تھے یہ لوگ

(شاہ معین الدین: ''معارف نمبر۴، جلد۸۴ ۔ اکتوبر ۱۹۵۹)

ہما بیگم کے نام

ردولی　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　۱۰/اگست ۱۹۵۶

ہما پیاری! دعا۔

آج کل آنکھیں آئی ہیں۔ دنیا میں اندھے اور عاقبت میں بھی اندھے۔ جی ڈرتا ہے کہ کہیں یہ اس کا پیش خیمہ نہ ہو۔ مگر ہما خط لکھیں اور حتیٰ الامکان ہم جواب نہ دیں یہ کیسے ممکن ہے۔ خطوط گئے اپنی ایسی تیسی میں۔ ہم اگر ہما کو دیکھ پاویں تو واہ وا۔ تم اپنا ہرج کر کے فوراً آنے کا پاتراب نہ کر دینا۔ بچے چاند کے لیے نہیں روتے ہیں؟ مگر لوگ اسی پر خوش ہوتے ہیں۔ لچھو سے میری دعا کہنا۔ اللہ کرے وہ اچھی ہو جائیں، آمین! اچھا بیٹی اب خط ختم کرتا ہوں۔ میں اچھا ہوں بحمد اللہ۔

دعا گو

تمھارا باپ عفی عنہ

ہما بیگم کے نام

ردولی ۱۲/ اگست ۱۹۵۶

ہما پیاری! دعائیں لو۔ تم بھی کہتی ہوگی کہ دعائیں لو۔ دعاؤں کے مارے جان عذاب میں ہے۔ اچھا خیر جانے دو۔ میری آنکھیں خراب تھیں۔ اس وجہ سے جواب میں دیر ہوئی۔ اب بحمد اللہ بہتر ہیں جو میں بہتر رہنے دوں۔ جگہ سے ہل نہیں سکتا۔ کتاب، اخبار دیکھنا بھی ایک نعمت ہے، وہ کیسے چھوٹے۔

اچھا سنو! ہمارے ایک نئے دوست پیدا ہوئے ہیں: ڈاکٹر احمد بشیر ایم. اے. پی. ایچ. ڈی لنڈن۔ کراچی یونیورسٹی شعبہ تاریخ۔ ان کو ہم نے اپنی کتابیں ان کی بڑی اچھی فرمائش کے خط پر مُعَن کے ہاتھ بھیجی تھیں۔ وہ آج تک ان کو نہیں دی گئیں۔ نہ مجھ کو کچھ لکھا گیا۔ بھلا یہ کوئی انصاف ہے۔

خیر بھئی اس وقت جی اُلجھ گیا۔

دعا گو

تمھارا باپ عفی عنہ

---

(۱۳۵)

ہما بیگم کے نام

ردولی ۱۴/اگست ۱۹۵۶

ہما پیاری! دعا۔

خط لکھنے میں بڑی دقت ہونے لگی ہے۔ یوں صبح کو دماغ تازہ ہوتا تھا اور دو ایک خطوط لکھ لیتا تھا۔ اب ایک کارڈ لکھنے میں اندھی روگ لگتا ہے۔ نہ معلوم کتنے الفاظ بیچ میں چھوڑ جاتا ہوں جو بعد میں سطر کے اوپر لکھتا ہوں۔ اس وقت ابر گھرا ہوا ہے۔ صبح کے آٹھ بجنے والے ہیں۔ اتنا لکھ گیا اور ابھی تک بیچ میں شاید چھوٹا نہیں۔ اوّل تو صبح کا وقت، دوسرے تمھارا تصرف اور پھر بھی دوبارہ پڑھوں تو معلوم ہو۔

کل میں نے طفیل صاحب کو کارڈ لکھا کہ ''نقوش'' کا غزل نمبر مجھ کو بھیج دیجیے۔ (دیکھیے شروع ہوا۔ ایک جگہ کاٹنا پڑا) ابھی تو صرف ایک 'ؤ' پر آفت آئی۔ اور طفیل صاحب کا کارڈ معلوم ہوتا تھا کہ میدانِ جنگ میں کشتوں کے پشتے لگے ہیں، اچھا خیر میں نے ان کو لکھا ہے کہ اس کے دام ہما سے لے لینا۔ بٹی ان کو جو اس کے دام ہوں دے دینا اور جس کام میں کہنا میں تمھاری طرف لگا دوں گا۔ یا جو کہنا۔ خطوط والی کتاب خوب ہے۔ میں دن رات اس کو پڑھتا ہوں اور جی نہیں بھرتا۔ غلطیاں لیتھو کی چھپائی میں ہوتی ہیں۔ میری کتابیں دیکھو۔ آجاد ملکوں میں میاں کاتب بھی آجاد ہیں اس کا رونا بے کار ہے۔

اچھا اور سنو بیل نہ کودا کو دی گون، یہ تماشا دیکھے کون۔ میاں بدرل خفا ہوگئے۔ اور ایک دن وہ آئے نہیں۔ خیر بھائی سہیل بیچ میں پڑے میں نے لجاجت سے معافی مانگی تب جا کر راضی ہوئے۔ وجہ یہ ہوئی کہ خواجہ حال کے فقیر والے خط میں میاں کاتب نے از راہِ محبت بھائی بدرل کا نام رہنے دیا تھا حالانکہ پہلی کاپی جو آئی تھی اس میں ان کا اور دوسروں کا نام کاٹ دیا گیا تھا اور تم کو صاف صاف لکھ دیا تھا کہ سب کے نام نکال ڈالے

جائیں۔ خیر بھئی ہوگا۔ ہما اور کاتب صاحب مل کر جو آفت ڈھائیں وہ کم ہے۔ اِدھر کی طرف بہت احتیاط سے لکھ رہا تھا کہ جگہ وافر رہے اور بہت سی باتیں جو دماغ میں ہیں وہ سب آجائیں۔مگر کچھ یاد نہیں ہے۔لہٰذا دعاؤں پر ختم۔

ہاں بیٹی وہ ہدایتیں جو نام کاٹنے کے لیے لکھی گئی تھیں وہ میاں بدرل نے بھی دیکھا تھا۔

دعا گو

تمھارا باپ عفی عنہ

ہما بیگم کے نام

ردولی ۳۱/اگست ۱۹۵۶

میری پیاری ہما! دعائیں قبول کرو۔ تم کو نہ معلوم کے دن سے خط نہیں لکھا۔

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

اچھا سنو! جس طرح چاند میں دھبے ہیں، اسی طرح تم لُوتری[1] ہو۔ وہ لوتری نہیں جو فساد کروا دے۔ خون خچر کروا دے۔ مگر ہو لُوتری۔ چھوٹی موٹی قسم کی۔ محبت لیے ہوئے قسم کی، مگر لُوتری ہو ضرور۔ یہ میرا ایمان ہے۔ تم نے مُنّن کو کتابوں والی بات کیوں لکھی؟ سلمان نے وہ کتابیں شاید تمھارا خط پہنچنے سے پہلے ہی بھیج دی تھیں۔

اچھا سنو! ادھر میری آنکھیں خراب ہوگئی تھیں، اس لیے اور تکلیف ہوگئی تھی مگر اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اب اچھی ہیں، گو اچھا ہوں، مگر موت کا انتظار ہر وقت ہے۔ ''سیّاں آون کی بھئی بیریاں درد جوا اٹھاری ہوں۔'' ابھی آدھا پوسٹ کارڈ اُدھر باقی ہے اور دو تین سطریں ادھر۔ مگر لکھتے نہیں بنتا۔ قیصر دعا کہتی ہیں۔ جابر تسلیم کہتے ہیں۔ سعید علی گڑھ گئے ہیں۔ خدا کرے وہاں لے لیے جائیں۔ آمین۔ آفاق کی تسلیم قبول ہو۔ وہ خط خود لکھیں گے۔ بچوں کو دعا...

راقم تمھارا باپ عفی عنہ

۳۱/اگست ۱۹۵۶

---

[1] پیٹ میں بات نہ رکھ سکنے والی، فوراً کہہ دینے والی۔

(۱۳۷)

ہما بیگم کے نام

ردولی　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　۸؍ستمبر ۱۹۵۶

ہما پیاری! دعا۔

''گویا دبستاں کھل گیا'' موصول ہوئی۔ پہلا گُل یہ کھلا کہ بدُّرل رُوٹھ گئے۔ ہم نے ان سے بہت بہت معافی مانگی تب کچھ سیدھے ہوئے ہیں۔ تم کو شکایت کا خط بھیجا ہوگا۔ ابھی دیکھیے کس کس سے معافی مانگنا ہو۔ اللہ کو معلوم ہے سب تمھاری کرامات ہیں۔

چند دیوانہ بہ گیسوئے تو گردند اسیر　　　صد ہزاراں دِل مجموع پریشاں شدنیست

یہ بھی ایک قسم کا لتراپن سمجھو۔ مطبع والے ایسے ہی حرامزادے ہوتے ہیں۔ نہ معلوم کیا کیا لکھ جاتے ہیں۔ اچھا بی بی ایک جلد حُسامی صاحب کو ضرور بھیجنا۔ اور بعد کو لکھوں گا۔ عینی کو ضرور ضرور بھیجنا۔ میری دُعا لکھ دینا۔ روز چاہتا ہوں کہ تم کو کتاب کی رسید بھیج دوں مگر صرف صبح کو لکھ سکتا ہوں۔ اب کمر میں درد ہونے لگا۔ ڈاک کا وقت نکل جائے تو تعجب نہیں۔ کل انشاء اللہ دیکھا جائیگا۔

وہ خواجہ حال کے فقیر احمد والا خط جو ہے جس پر بدرُل خفا ہوگئے تھے، ابھی اور رنگ لاوے تو تعجب نہیں۔ آج کل میرے کان میں ایک پھنسی نِکل آئی ہے۔ گھر بھر کو خدا کے واسطے کو پریشان کیے ہوں۔ خدا مجھ کو اور گھر والوں کو روز روز کی پریشانیوں سے چھٹی دے۔ نہ معلوم کیا کیا لکھنے والا تھا۔ مگر رات نیند کی دوا لی، صبح کو دیر سے اٹھا، اس لیے اب ختم کرتا ہوں۔ اچھا بی بی بس۔ تم کو اور تمھارے والوں کو خدا کی امان میں سونپا۔

دعا گو تمھارا باپ عفی عنہ

ہما بیگم کے نام

ردولی

۱۵/ اکتوبر ۱۹۵۶

میری جان! دعا ہائے فراواں۔ میں جانتا تھا کہ جب تم اصل خیر سے گھر واپس آؤ تو تم کو کم سے کم ایک خط میرا ملے۔ مگر بیٹی مجبوری ہوگئی۔ اب آہستہ آہستہ فالج نے یہ کیا ہے کہ سوائے صبح کے وقت کے اور نہیں لکھ سکتا۔ اگر کوئی پاس نہ بیٹھ جائے اور مجھ کو بھول چوک نہ بتاتا جائے تو ظہر، عصر کی نمازیں گڑ بڑ کر جاتا ہوں۔ برسوں عصر کی چھ رکعت نماز پڑھی ہوں گی۔ نہ معلوم کتنے خطوں کے جوابات پڑے ہیں۔ کچھ آنکھ بھی فالج کی طرح گڑ بڑ کر رہی ہے۔ قصہ مختصر The less said the better اس وقت اس انگریزی کا مترادف کوئی یاد نہیں پڑتا۔ ''گویا دبستاں کھل گیا۔'' کا آموختہ ہر وقت پڑھا کرتا ہوں اور نہ معلوم کتنا مزا مجھ کو آتا ہے۔

ابھی ابھی ایک مجلس چہلم کا اشتہار موصول ہوا۔ قاضی سراج الدین علی مرحوم کو تم جانتی بھی نہ ہوگی مگر دل توڑ دینے والا واقعہ تھا کہ بے واسطہ بے غرض مرحوم کی والدہ کو پُرسے کا خط لکھنے لگا۔ اس وجہ سے اگر تمھارا خط ڈاک میں نہ جاسکے تو تعجب کی بات نہیں۔ خیال کرو ہما! بڈھی ماں ابھی زندہ ہیں اور یہ اٹھارواں اور آخری لڑکا تھا جو خدا کو پیارا ہوا۔ اب اس خاندان کا نام بھی مٹ گیا۔ جوان مگر لاولد بی بی اور بڈھی ماں رہ گئیں۔ اب تحریر میں فالج کا اثر ہوگیا۔ اب انشاء اللہ تعالیٰ پھر لکھوں گا۔

تمھارا باپ

---

(۱۳۹)

ہما بیگم کے نام

ردولی ۱۶؍اکتوبر ۱۹۵۶

ہما پیاری! دعا۔ کل ایک خط لکھ چکا ہوں۔ جو بات جس وقت یاد آتی ہے وہ دوسرے وقت بھول جاتی ہے۔ دماغ بہت تیز دوڑتا ہے۔ جیسے باؤلہ کتا کسی کے پیچھے دوڑتا ہوا۔ اور قلم وہی اپنی دن بھر میں چلے اڑھائی کوس کی چال" سے چلتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بیچ بیچ میں الفاظ چھوٹ جاتے ہیں۔ اچھا خیر۔ میں نے طفیل صاحب سے غزلیات نمبر مانگا تھا اور کہا تھا دام بیگم اخلاق حسین سے لے لیجیے گا۔ انھوں نے مجھ کو شخصیات نمبر بھیج دیا، اور غزلیات نمبر نہیں بھیجا۔ بیٹی ان سے غزلیات نمبر بھجوا دو اور جو دام دونوں نمبروں کے ہوں ان کو دے دو۔ اور مجھ کو اطلاع دے دو اور جس کو حکم دو وہ دام ادا کردوں۔ یا جیسا کہو وہ کروں۔ میں دیکھنے میں ویسا ہی ہوں مگر تم اس دھوکے میں نہ رہنا۔ صرف صبح کے وقت کچھ عقل ٹھیک رہتی ہے۔ علاوہ اس کے دماغ کوڑا گھر ہو جاتا ہے۔ جس میں کاغذ بنانے کے لیے ٹھیکدار مہتر چیتھڑے ڈھونڈا کرتے ہیں، اور اس پر بھی نگاہ رہتی ہے کہ شاید کوئی اچھی چیز مل جائے۔

آج کل صوفیہ یہیں ہیں۔ بے چاری بیمار ہے۔ میاں اس کا غریب حرامزادہ اور کچھ سڑی بھی ہے۔ اس کی چھوٹی سی لڑکی خوب کھیل کرتی ہے۔ دن میں دو تین مرتبہ میرا دل گھڑی بھر کے لیے بہل جاتا ہے۔ باقی اور کیا لکھوں۔ اللہ کرے ڈاک سے مل جائے۔ سب کو دعا۔ صوفیہ تسلیم کہتی ہیں۔ قیصر دعا کہتی ہیں۔ آفاق بھی تسلیم ضرور کہتے مگر وہ ابھی آئے نہیں۔ تمھارے دونوں خطوط پہنچے۔ دل بہت فرحت میں ہوگیا۔

محمد علی عفی عنہ

---

(۱۴۰)

ہما بیگم کے نام

رودولی ۶ رنومبر ۱۹۵۶

میری جان۔ دعائیں۔ تمھارے دو خط کل شام کو آئے۔ مدّ وسلمہٗ کی تکلیف کا حال معلوم ہوا۔ خدا کا شکر بھیجنا نہ ہمارے امکان میں۔ مگر بہر حال شکراً شکراً کہنا ہے اور عفواً عفواً بھی کہے جانا ویسا ہی ضروری ہے۔ مگر اس کی عنایات کا بدلہ کیسے ممکن ہے مجبوراً جو کچھ ہے وہ حاضر ہے۔ آج قیصر لکھنؤ گئی ہیں۔ آفاق بھی جا رہے ہیں۔ نوشاد گاؤں جا رہے ہیں۔ میری آنکھیں آئی ہیں۔ کان میں بھی گڑ بڑ ہے۔ ایک آنکھ بالکل بند ہوگئی ہے دوسری صرف آدھی کھلی ہے مگر تم کو خط لکھنے پر دل مجبور ہے۔ خیال تو کرو کتنی سوئے اتفاقیاں یک جا ہوگئی ہیں۔ لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اب شکر کے مواقع اتنے زیادہ شکوے کے مواقع ایک بھی نہیں ہیں۔ اللہ میاں کا کیسے شکر کروں اور حق عبودیت کہاں تک عرض کروں سوا اس کے کہ حسبی اللہ ونعم الوکیل نعم المولیٰ ونعم النصیر کہہ کر پھر دنیا کے مکروہات کے کیچڑ میں لوٹنے لگوں۔ ابھی آدھا پوسٹ کارڈ باقی ہے اور دماغ مختل ہے۔ کیا لکھوں، اور کیا نہ لکھوں۔

اسماء طیب کی بی بی کا پتہ کاش کہ معلوم ہوتا۔ خطوط کے تقسیم کرنے کا حال تو معلوم ہوا۔ بکنے کا کچھ پتہ چلا کہ تم نے سعادت مندی سے جو روپیہ لگایا ہے اس کے ملنے کی بھی کوئی صورت ہے یا صرف اللہ میاں کا بھروسہ ہے۔ ان خطوط سے نہ معلوم اِغواء زیادہ ہوگا یا ہدایت۔ یعنی وہاں بھی بدلہ ملنا یقینی نہیں ہے۔

ایک جلد محبوب عالم صاحب کو بھیج دو۔ وہ بارہ تاریخ تک لاہور پہنچیں گے بہتر ہوگا کہ ہدیہ لکھ کر لاہور ہی میں ان کو کرنل سلامت اللہ کے ذریعہ سے بھجوا دو۔ ہمارے سفر آخرت

کے بہت دن معلوم نہیں ہوتے۔ گو دنیا کی ہوس بڑھتی جاتی ہے۔ تمھارے دونوں خطوط میں نہ معلوم کتنی باتوں کا جواب رہ گیا۔ مگر کیا کروں۔ سب کو دعا۔ مدّو کا حال پھر لکھو۔

راقم تمھارا باپ عفی عنہ

تخلیق بخلیق۔ نقوش پقوش کے بابتہ لکھنے کا تیہا[1] کہاں سے لاؤں!

---

[1] طاقت۔

(۱۴۱)

ہما بیگم کے نام

ردولی ۴؍دسمبر ۱۹۵۶

میری جان۔ دعائیں۔ تمھارا ہمیشہ کا ایسا اچھا خط آیا۔ دل پر مرہم سا رکھ گیا۔ ادھر آنکھیں پکڑی گئی تھیں۔ اب بھی حوالات میں ہیں۔ اور اگر عنقریب دوامی نظر بند ہونے کا حکم صادر ہو جائے تو تعجب نہیں۔ گناہ کی میزان بہت بیٹھتی ہے۔ اگر ہوگئی تو سستے ہی چھوٹے، عمر بھر کا غرور۔ عمر بھر کا غصہ۔ اگر 76، 77 برس کی عمر میں اندھے ہوگئے تو سستے ہی چھوٹے مگر مراحم ربیا نہ میں سزا کم کر دی گئی تو تعجب نہیں۔ تم نے جنوری میں آنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ اللہ سب کو اپنی امان میں رکھے، اور جنوری میں دیدار نصیب ہو۔

کل کا وعدہ کیا ہے پھر اس نے آج ایک دن اور بھی جئے ہی بنی

الف نے کل مجھ کو بڑی نصیحت کی۔ قاضی کے گھر کے کے چوہے سیانے۔ یہ اللہ میاں کی حکمت بالغہ نہیں تو اور کیا ہے اور سب خیریت ہے۔

۴؍دسمبر ۱۹۵۶

دعا گو

محمد علی عفی عنہ

بی بی حواس باختہ رہتے ہیں۔ تم نے اخلاق کے بلڈ پریشر کا حال لکھا تھا۔ اپنے بلڈ پریشر کو خفیف کر کے دکھلایا تھا۔ خدا سب کو اپنی امان میں رکھے۔ قیصر دعا اور جابر تسلیم کہتے ہیں۔ بدرل اچھے ہیں، اور آفاق بھی اچھے ہیں۔ ان لوگوں کی طرف سے دعا۔ نیابتاً لکھتا ہوں۔ خدا کرے مدّو اب اچھے ہوں۔ سب کو دعا۔

---

(۱۴۲)

ہما بیگم کے نام

ردولی ۸؍دسمبر ۱۹۵۶

ہما بیگم! دعا۔ کل تم کو ایک کارڈ لکھ چکا ہوں۔ آج پھر باتیں کرنے کو جی چاہا۔ سوا تمھارے کس سے باتیں کروں۔

کس زبانِ مرانمی فہمد
پہ عزیزاں چہ التماس کُنم

آج کل بحران تھا وہ ختم ہوگیا۔ اب کچھ اثر اس کا خفیف سا باقی ہے میری آنکھیں ابھی تک کام دیتی ہیں۔ بائیں آنکھ میں موتیا بند شروع ہے۔ آج قیصر لکھنؤ گئی ہیں۔ اس وجہ سے دماغی اور دلی ورزش کم ہوگئی۔ بے چاری اپنی افتادِ طبع سے مجبور ہے جس طرح میں اپنی افتادِ طبع اور افتادِ الٰہیہ یعنی فالج سے مجبور ہوں۔ اعصاب کی بے انتہا جھنجھناہٹ کی وجہ سے غصہ ناک ہی پر دھرا رہتا ہے، اور ہاتھ پاؤں نہ چلنے کی وجہ سے زبان زیادہ چلتی ہے۔ خدا مجھ کو معاف کرے اور غریب قیصر کی ماں کا ترکہ اس کو کم نصیب ہو۔

تم نے دسمبر کے بعد آنے کو کہا ہے۔ اس ارادے کو اپنا ہرج کر کے پورا نہ کرنا۔ حالانکہ اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ تم مل جاؤ تو دنیا مل جائے۔ اور عقبیٰ کے بھی ملنے کا سامان ہو جائے۔ مگر یہ فقط خیال ہی خیال ہے۔ جو کچھ مقدر ہو چکا ہے اس میں تم کیا تمھارے باپ بھی فرق نہیں ڈال سکتے۔

کتابیں موصول ہوئیں—— کو ایک جلد دینے کو دل کسی طرح نہیں چاہتا۔ اُن کے خدا نے دن پھیرے ہیں۔ جس پر میں بعد نماز شکراً شکراً روز کہتا ہوں مگر پھر بھی ان کا غرور اور احسان فراموشی اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ اچھا خیر خدا ان کو معاف کرے کیونکہ وہ بھی میاں... کے محسن ہیں اور—— کا غصہ ان کے اوپر مجھ سے بھی زیادہ ہے بلکہ میرے اوپر تو

وہ غصہ ظاہر نہیں کرتے صرف آنا بند کر دیا ہے۔

تم نے میری ہدایت کے برخلاف نسخوں پر گاندھی کی تاریخ میں پہلا شعر جو چھوٹ گیا ہے اس کا اضافہ نہیں کیا۔ صفحہ 60 پر شروع اس شعر سے کرتیں تو اچھا تھا۔

گاندھی مرحوم حق آگاہ مرد
خود بخفت و ہند را بیدار کرد

بی بی اگر یہ شعر سب سے اوپر ہوتا تو تاریخ مکمل ہوتی۔ خدا کرے تمھارا مزاج اور اخلاق کا مزاج اچھا ہوا اور بچے خوش ہوں۔ آمین۔

دعا گو

تمھارا باپ عفی عنہ

---

(۱۴۳)

ہما بیگم کے نام

ردولی

۱۲؍دسمبر ۱۹۵۶

میری پیاری ہما۔ دعا۔ کوئی کہتا تھا کہ تم ماشاء اللہ بالکل اچھی ہو۔ صرف پاؤں میں ایک خفیف سی تکلیف باقی ہے۔ اللہ کرے وہ بھی مٹ جائے اور کمزوری بھی جائے۔ آمین ثم آمین۔ ''دبستان'' پڑھا کرتا ہوں اور ابھی تک آموختہ نہیں ہوا۔

نہ پوچھ نامہ اعمال کی دلآویزی

تمام عمر کا قصہ لکھا ہوا پایا

تمام کتابیں بٹ گئیں۔ صرف ایک رہ گئی ہے۔ وہ بھی میں عنقریب کسی کے سرمنڈھوں گا۔ میاں... کو کتاب نہیں دی۔ اللہ نے ان کے دن پھیرے ہیں اور خود انھوں نے اپنا دماغ پھیرا ہے۔ پہلے پھیر پر شکراً شکراً۔ دوسرے پھیر پر ہات تیرے کی۔ ردولی میں ہر شخص سے لڑ جاتے ہیں۔ چنانچہ میرے بہت مشکور ہیں مگر کہہ گئے ہیں کہ تمھارے گھر میں نہیں آسکتا کیونکہ یہاں نوشاد رہتے ہیں۔اور نوشاد سے مجھ کو نفرت ہے۔'' حالانکہ نوشاد غریب نے جب وہ بھوکے تھے تو اپنا کھانا ان کو کھلایا اور اپنی جیب سے نقد بھی دیا۔ مگر وہ خفا ہوگئے۔ اچھا خیر غیبت کا گناہ اللہ معاف کرے۔

تمھارے مہمان کب آئیں گے؟ اور کون کون ہوں گے؟ اور تم یہاں کب تک آؤ گی؟ اگر نہ آنا چاہو تو میں تم کو مجبور نہیں کرتا، صرف اس وجہ سے کہ تمھارے قلم سے بر سبیل تذکرہ نکل گیا تھا کہ تم آنے کا ارادہ رکھتی ہو۔ اچھا بیٹی اب ڈاک کا وقت قریب ہے اور ہم مختل الحواس بھی ہوتے جاتے ہیں اس لیے دعا پر ختم۔

''گویا دبستاں کھُل گیا'' کی کچھ جلدیں اور بھیج دو۔ دام جس طرح سے کہو ادا کروں۔ یہ تصنع نہیں ہے بلکہ واقعی کہتا ہوں۔ کیونکہ اس میں اگر نقصان ہوا تو میں سمجھوں گا کہ مجھے ہتھیا لگی۔ میاں جابر تسلیم عرض کرتے ہیں۔

راقم دعاگو عفی عنہ

ہما بیگم کے نام

ردولی ۹ رجنوری ۱۹۵۷

ہما پیاری۔ دعائیں۔ ''گویا دبستاں کھل گیا'' کی جیسی مانگ تھی ویسا ہی توڑا بھی تھا۔ آج دس کتابیں آگئیں مگر اس طرح آئیں جیسے لوٹا پٹا قافلہ آتا ہے ڈاک والوں نے اس کی گت بنا دی۔ مگر صرف جلد ہی کو نقصان پہنچا۔ مغز کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ ایک جلد کپڑے والی پر لکھا ہے۔ بخدمت گرامی مشفق خواجہ صاحب وہ رہ گئی ہے۔ اگر سیّدین صاحب کو بھیجنا تھا تو میں بھیج دوں یا تم بھیج دوگی صرف ایک کاپی تھی وہ للّن صاحب کے نذر کی ہے اور خوش ہوں کہ قدر دان کے ہاتھ پڑی گوتم نے دس جلدیں بھیجنے کا وعدہ کیا تھا مگر پارسل کو دیکھ کر جی دَھک سے ہوگیا کہ کہیں خدا نہ خواستہ اس کے معنی یہ نہ ہوں کہ تم نہ آسکو۔ حالانکہ اس کی آس لگائے تھا۔

بی بی اگر گھر کے انکار کی وجہ سے ہو تو خیر اگر خدانخواستہ علالت کی وجہ سے ہو تو خدا جلد شفا بخشے۔ آمین۔ بی بی اس کا جواب جلد دینا۔ بہت کچھ اس درخواست میں اختلاج کا جزو ہے، مگر پھر بھی خدا کرے تم کو دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی اور دل مسرور ہو۔ اچھی بی بی اللہ کرے ڈاک مل جائے۔ دیر بہت ہوگئی ہے۔

دعا گو

محمد علی عفی عنہ

ہما بیگم کے نام

ردولی ۱۱ر جنوری ۱۹۵۷

ہما پیاری۔ دعا۔ تم نے آنے کا وعدہ کرکے اپنی جان عذاب میں ڈال دی۔ ایک طرف وہاں کے فرائض، دوسری طرف مجھ سے وعدہ کرنے کی لاج۔ خود ہماری حالت جھونکو بھاڑ میں۔ کیونکہ عنقریب بھاڑ میں جانے والا ہوں اگرارحم الرّاحمین نے رحم فرمایا۔ کیونکہ اعمال کے حساب سے تو سوا جہنم کے اور کہیں ٹھکانا نہیں ہے۔ البتہ اگر میری جسمانی اور روحانی تکلیفیں خیرالراحمین نے کفارے کی صورت میں ڈالی ہیں تو اس کا شکر اس قدر ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیسے ادا کروں۔ بہر حال تم مطلب سمجھنے کی کوشش کرو۔ میرے قلم میں طاقت نہیں ہے۔ وقل ربّی اغفر وارحم و انت خیرالراحمین۔ ایک جلد ''گویا دبستاں کھل گیا۔'' کی حسب ذیل پتہ سے بھیج دو۔

ڈاکٹر احمد بشیر صاحب ایم.اے پی.ایچ.ڈی (لندن)

ریڈرانِ ہسٹری، یونیورسٹی۔ کراچی۔ تکلیف کرکے اس کو رجسٹری کروا دینا۔

خیر تم لوگ تو اپنے بچے ہو۔ میں تو غیر لوگوں کو آج کل اتنی تکلیف دے رہا ہوں کہ کچھ انتہا نہیں ہے۔ مگر واقعی سوا شکر کے اور کچھ نہیں کہتا۔ حالانکہ عفواً عفواً زیادہ کہنا چاہیے۔

راقم تمھارا دعا گو گنہگار سیہ کار

محمد علی عفی عنہ

---

(۱۴۶)

ہما بیگم کے نام

ردولی ۱۴ر جنوری ۱۹۵۷

ہما پیاری۔ دعائیں۔

آج کئی دن سے تم کو خط لکھنے کو دل چاہتا ہے مگر صبح کے وقت لوگ برآمدے میں بیٹھا دیتے ہیں۔ جہاں صبح کو سنہری اور بعد کو روپہلی جاڑوں کی دھوپ ہوتی ہے۔ مگر یہ عارضہ مجھ کو تندرستی کے زمانے سے ہے اگر سر دھوپ میں ہوا تو خیالات بکھر جاتے ہیں اور دماغی کام سے معطل ہو جاتا ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ جب دوائیں بانٹتا تھا تب بھی بعض اوقات پورب طرف کا برآمدہ چھوڑ کر پچھم طرف کے برآمدے میں بھاگ آتا تھا۔ آج میں باہر نہیں گیا۔ گاؤن پہن لیا اور پاؤں پر رضائی ڈال لی کہ جاڑے سے بچوں مگر وہی سلمان والے بڑے کمرے میں بیٹھا ہوں۔ یہ اہتمام اس واسطے کیا ہے کہ شاید آئندہ خط نہ لکھ سکوں۔ یہ میں نے احتیاطاً کہا ہے ممکن ہے سنبھل جاؤں۔ ادھر دو چار دن سے ٹماٹر کی چٹنی دوپہر کے کھانے پر کھایا کیا اور چونکہ برسوں کے بعد ڈاکٹر نے نمک کی اجازت دی تھی۔ اس لیے خوب خوب چٹخارے بھرے۔ پرسوں پلاؤ کے ساتھ رائیتہ بھی تھا۔ اس سے حلق خراب ہوگئی۔ قصہ مختصر جلدی کرو جلدی کرو۔ اس سے پہلے کہا اجل آوے۔ جیسا کہ امام حسینؑ نے اپنے دوستوں کو لکھا تھا اسی طرح میں تم کو لکھتا ہوں کہ تم نے بھی آنے کا وعدہ کیا۔

خدا کرے تم اچھی ہوا اور اسباب زمانہ اجازت دیں۔ کیونکہ ہم بھی آس لگائے ہیں۔ بہر حال دیکھو کیسی اکھڑی پکھڑی باتیں کرتا ہوں۔ اچھا بیٹی اب دھوپ میں جاتے ہیں اس لیے خط ختم کرتا ہوں۔ سب کو بہت بہت دعا۔

لاحول ولا قوۃ مرنے کا انتظار ہے اور زندگی کا سامان کر رہا ہوں اگر تمھارا آنا ہوا تو اکبر الہ آبادی کے دیوان لیتی آنا۔

دعا گو، محمد علی عفی عنہ

(۱۴۷)

جناب سید اخلاق حسین صاحب کے نام

ردولی — ۲۴؍فروری ۱۹۵۷

مائی ڈیئر اخلاق!

تمھاری سیر چشمی اور وسعت خلوص ایسی ہے کہ جب کسی کے کام آتے ہو تو دل سے قریب ہو جاتے ہو۔ مجھ کو منظور مرحوم کا آخری وقت یاد ہے۔ نیز بھاگن مرحومہ کی موت یاد ہے جب تمھاری ماں آڑے وقت میں کام آئیں تھیں ماننا پڑے گا کہ یہ صفات تم لوگوں میں قابل ستائش اور قابل غبطہ ہیں۔ مجھ نحیف کی دعائیں اور شکریہ قبول کرو۔ مگر بیٹا میں اپنے میں سکت نہیں پاتا کہ تمھارے بلاوے سے فائدہ اٹھاؤں۔ موت اور زندگی دونوں ایسے نازک مواقع پر پہنچے ہیں کہ ایک ٹھیس میں دونوں میں سے کسی کا بھی کام ہو جائے۔ بہرحال زیادہ لکھنے کی طاقت اپنے میں نہیں پاتا۔ کم لکھا بہت جانو۔

سب کا دعا گو

محمد علی عفی عنہ

ہما بیگم کے نام

ردولی ۲۰؍ مارچ ۱۹۵۷

ہما پیاری! دعا

میرے مضمون کی نقل سے دل خوش ہوا۔ ریڈیو والی تقریر کی نقل سے بڑی مسرت ہوئی۔ صرف انانیت کو مزا ملا ہے۔ مگر مسرت کیوں اس قدر ہوئی۔ اس کے بعد تمھارا خط تھا جس نے دل کی کلی کھلا دی۔ مگر تم نے یہ کیا بیوقوفی کی بات لکھی۔ اگر میں یونہی بیٹھا رہا اور تمھارے مرنے کی خبر آئی تو میں کیا کروں گا۔ ہم چشموں میں شرمندہ ہوں گا۔ دنیا سے آنکھ نیچی ہوگی۔ زندگی سے پشیمانی ہوگی اور موت سے بھی حجاب آئے گا۔ میں جانتا ہوں کہ ریڈیو پر میری تعریفیں سُن کر تم کو اتنی خوشی ہوئی کہ محبت کا توازن بگڑ گیا جیسے میرے دلی لگاؤ کا توازن اونچا نیچا ہوگیا، اور میں بیوقوفی کا لفظ استعمال کر بیٹھا۔ جو شاید میں نے کبھی نہ کیا ہو۔ نہ معلوم کتنے الفاظ اس کے مترادف تھے، مگر دل دماغ، ہاتھ، انگلیاں اور قلم سب نے ایک زبان ہو کر یہی بھونڈا بدقوارہ لفظ پسند کیا خیر جانے دو۔ میں نے معاف کیا۔ تم بھی معاف کر دو۔

تم نے لکھا ہے کہ خود میرے ہاتھ کا لکھا ہوا خط دیکھ کر جی ٹھہر گیا۔ افسوس میری جان، میری بیٹی، میری پیاری، یہ دل کا ٹھہراؤ کب تک۔ وہی ٹھہراؤ بہتر ہے جو تم نے بہت دنوں سے اپنے لیے ٹھہرایا ہے۔ ریڈیو والی تقریر نے پارہ اونچا کر دیا اور کچھ نہیں۔ اب پھر وہی "وہم مقتصد" والا توازن آگیا ہوگا۔ اتفاق سے اب میاں بنّے چودھری نعمت اللہ صاحب کے داماد حمیدہ کے میاں آگئے۔ اس لیے ختم کرتا ہو ورنہ بہت کچھ لکھتا۔ میں اچھا ہوں الحمد للہ۔ قیصر دعا کہتی ہیں۔ بچوں کو دعا۔

خادم

محمد علی عفی عنہ

(۱۴۹)

ہما بیگم کے نام

ردولی ۱۹/اپریل ۱۹۵۷

ہما پیاری! دعائیں۔

تمھارا خط کل شام کو ملا۔ دوسرے سے پڑھوایا۔ خود میری آنکھیں ایسی بگڑی ہیں جیسے کوئی حوالات میں ہو۔ یعنی چھوٹ جانا اور دائم الحبس دونوں کا امکان ہے۔ مگر اس وقت تو مجھے تمھاری پڑی ہے۔ استخارہ دکھلا کر لیکسس دوا تجویز کی ہے۔ اس کو ایک دن میں تین خوراکیں کھا کر جیسا کہ تار میں لکھا گیا ہے اس کے اثر کا انتظار کیجیے۔ اگر بیچ بیچ ایسا معلوم ہو کہ دوا کا اثر ختم ہوگیا تب بھی انتظار کیجیے۔ کیونکہ اس دوا کا reaction درمیان درمیان ہوتا رہتا ہے۔ اگر انشاء اللہ تعالیٰ اس دوا نے فائدہ کیا تو پھر بعد کو زیادہ قوت کی دی جائے گی۔ تمھاری بیماری بیٹی تکلیف دہ ضرور ہے مگر میں نے بی بی اس عارضے میں مرتے نہیں دیکھا۔ اب آگے مجھ اندھے نیم جان کی تقدیر۔ بلکہ کسی عمدہ ایلوپیتھ کو جو وقتاً وقتاً تمھارا بلڈ پریشر وغیرہ دیکھ لے، دکھاتی رہنا۔ میں لاہور کے ڈاکٹروں کو کیا جانوں۔ مگر ڈاکٹر شبیر حسن کا ایسا کوئی آدمی ہو جو علاوہ ڈاکٹر کے انسان بھی ہو تو غنیمت ہے تم اپنے استخارے پر مضبوط رہنا مگر بی بی خدا کے لیے علاج میں باپ کمبخت کی محبت نہ آنے دینا میں یہاں بیٹھا ہوا کون خدمت کرسکتا ہوں۔ سوائے حسبی اللہ و نعم الوکیل نعم المولیٰ و نعم النصیر پڑھنے کے۔

میری بیٹی تیرا باپ
عفی عنہ

---

(۱۵۰)

اڈیٹر ماہنامہ 'نقوش' کے نام

ردولی
ضلع بارہ بنکی
۲۸/اپریل ۱۹۵۷

نادم خادم محمد علی عفی عنہ۔ عریضہ نگار ہے کہ صرف بڑھاپا نہیں بلکہ موت کا پیش خیمہ اندھاپن بھی گھور رہا ہے۔ خود لکھنے سے معذور ہوں۔ ناچار اپنے ادبی جانشین میتب عباس شارب ردولوی(76) سلمہ سے لکھوا رہا ہوں۔ یہ میرا پوتا بھی ہے اور خدا نے چاہا تو میرا ادبی نام بھی روشن کرے گا۔ اس کا تعارف قبول کیجیے اور جو احکامات صیغۂ ادارت سے جاری کرنا ہوں وہ شارب سلمہ کے نام جاری کیجیے ۔

اگر پدر نتواند پسر تمام کند

جہاں یہ نحیف ناکام رہا ہے وہاں انشاء اللہ تعالیٰ یہ کامیاب رہے گا۔

مغفرت کی دعا کا طالب
محمد علی عفی عنہ

---

(۱۵۱)

ہما بیگم کے نام

ردولی — پہلی مئی ۱۹۵۷

میری جان دعائیں۔

دو دن کے سخت انتظار کے بعد تمھارا نیم تشنہ خط پہنچا۔ دوران سر، اختلاج قلب کی وجہ سے تم سے خط لکھوانا محبت کی زبردستی ہے مگر کیا کروگی جب تک جیتی ہو اور باپ مر نہیں چکتا یہی حال رہے گا۔ باپ پر کیا موقوف ہے، جب تک محبت کا راج ہے، اسی طرح کی آرام اور اسی طرح کی تکلیف کی تلچوری بٹی جایا کرے گی اور بے بس انسان کٹے کنکوے کی طرح ''حسبی اللہ و نعم الوکیل نعم المولیٰ و نعم النصیر۔'' پڑھتا ہوا کہیں نہ کہیں ٹھکانا پاوے گا۔ اچھا خیر۔ اب واقعات سنو۔ تمھاری بیماری کی خبر سن کر میں نے تم کو تار دیا تھا کہ لیکسِس دن بھر میں تین بار کھا کر چھوڑ دو۔ نہ معلوم تم نے وہ دوا کھائی یا کوئی ڈاکٹری نسخہ پیا۔ ایک تار تعزیت کا اخلاق کو بھیج دیا تھا، اور ایک خط اشفاق کے ذریعہ سے ان کی ماں کو دتی بھیجا تھا۔ میاں بدرل نے بھی ایک تار اور ایک خط بھیجا تھا۔ اس کا جواب پا کر بھائی بدرل کچھ جزبز، کچھ متحیر، کچھ ہکا بکا۔ ہر شخص کو اشفاق کا خط پڑھوا کر پوچھتے ہیں کہ اشفاق کے خط سے غصّے کی جھلک نہیں معلوم ہوتی؟ اور میں نے تعزیت نامہ لکھ کر کچھ گناہ تو نہیں کیا تھا۔ خیر یہ تو بھائی بدرل کا سٹھیاناپن ہے۔ اس میں میرا الّترا پن بھی شریک ہوگیا ہے۔ حالانکہ اشفاق کے خط میں مجھ کو کوئی بات ایسی نہیں دکھائی دیتی۔

ہاں بیٹی! سلمان کے بارے میں جو اخلاق لکھنا چاہتے تھے، اس کا منتظر ہوں۔ میں حتیٰ الامکان سب کچھ کروں گا لیکن ان کے حضور میں مجھ تابعدار اور بے بس جابر کا سلام بھی قبول ہو جو غلطی ان کے ماں باپ سے ہوئی اس کو معاف ہی کر دیتے تو اچھا تھا۔

واضح ہو کہ حسب ضرورت لیکسِس 30 کی ایک گولی دورانِ سر وغیرہ کے لیے کھا سکتی ہو، مگر زیادہ نہیں۔ جابر سلمہٗ، سلام، نوشاد تم سب کو دعائیں کہتے ہیں۔ قیصر دعا کہتی ہیں۔

نیم جان۔ نیمکور۔ تمھارا باپ عفی عنہ

ہما بیگم کے نام

ردولی ۱۳ر مئی ۱۹۵۷

ہما پیاری! دعا۔

ایک کارڈ بھیج دیا تھا۔ مگر شاید تم کو نہیں پہنچا۔ اس میں تحریر تھا کہ میری کتابوں کا مجموعہ اگر سُویڈ کے یہاں چھپے تو یقیناً بہتر ہوگا مگر صلاح الدین صاحب کے احسانات، ان کی مروّت درمیان میں دیوار بنی کھڑی ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہوگا کہ استخارے پر بھی نہ کرو۔ تمھارے استخارے سے سب ڈرتے ہیں۔ اگر سویڈ کے نام آوے تو صلاح الدین صاحب کو تسبیح کے دو دانے دکھلا دینا۔ مگر یہ یاد رہے کہ ''گویا دبستاں کھل گیا'' کو بغیر ان کی اجازت کے شاید تم نہ چھپوا سکو۔ تاج توڑ کی نقل بھی انھیں سے ملے گی۔ یہاں بھی تھی مگر شاید ملے نہ ملے۔ ''اتالیق بی بی'' ''صلاح کار'' ''پردے کی بات'' تمھارے پاس ہیں یا نہیں؟ ''نقادی کے نقطے'' کہیں نہیں ہے۔ آگے تم جانو۔ تمھارا کام۔ میں زندہ ہوں، مگر کیسے زندہ ہوں یہ تعجب ہے۔ اب نہیں لکھ سکتا۔ شاید نوشاد کچھ اور لکھیں۔

تمھارا باپ

عفی عنہ

ہما بیگم کے نام

ردولی　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　۲۴رمئی ۱۹۵۷

ہما پیاری! دعا۔

تمھارا خط کل شام کو ملا۔ جتنا حال اس میں لکھا تھا اس سے زیادہ معلوم ہوا۔ میرے خیال سے تم اپنی بیماری کو ہلکی کرکے دکھاتی ہو۔ برخلاف اس کے میں بیماری کی تکلیف کو enlarge کرکے دکھاتا ہوں۔ آنکھوں کی بیماری مُزمن ہوگئی ہے۔ پہلے تم کو خط لکھتا تھا تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ تم سے باتیں کر رہا ہوں۔ اب یہ معلوم ہوتا ہے کہ تم کو سنانی[1] بدپیشگی دے رہا ہوں۔ تم میری خاطر سے ڈاکٹر کو دکھلاتی رہنا۔ افوض امری الی اللہ۔

میاں سلمان کا خط جس کی دھمکی تم نے دی ہے۔ ابھی تک نہیں آیا۔

ہمہ آہوانِ صحرا سرِ خود نہادہ برکف
بہ امید آنکہ روزے بہ شکار خواہی آمد

قیصر دعا کہتی ہیں۔ جابر، سعید تسلیم عرض کرتے ہیں۔ وہاں معہ اخلاق کے ایک ایک کو دعا۔ اخلاق کے خط کا جواب ابھی تک نہیں جا سکا۔ ان کی محبت اور ہمدردی کا دل سے مشکور ہوں۔

دعا گو

محمد علی عفی عنہ

---

1. موت کی خبر

ہما بیگم کے نام

ردولی ۲۵رمئی ۱۹۵۷

ہما پیاری! دعا۔

اس وقت بدرل والا خط نوشاد نے پڑھ کر سنایا۔ بلڈ پریشر خود کوئی بیماری نہیں ہے۔ البتہ بڑھاپے اور انحطاط کی نوٹس ہے حسبی اللہ ونعم الوکیل نعم المولیٰ و نعم النصیر۔ اس کی کافی و شافی دوا ہے۔ خوش ذائقہ بنانے کے لیے لاحول ولاقوۃ اِلّا باللہ العلی العظیم۔ وقتاً فوقتاً مِلا لیا کرو۔ ان باتوں کو تم مجھ سے بہتر سمجھتی ہو۔ عقلمنداں را اشارہ کافی است۔ اللہ میاں کی خوشامد تم مجھ سے بہتر کرتی ہو۔ اس میں بیچ بیچ امام زین العابدین علیہ السلام کی سفارش صحیفۂ کاملہ والی کر لیا کرو۔ انشاء اللہ تعالیٰ بیڑا پار ہے۔ نیوٹن نے کوئی نقشہ برسوں کی محنت میں تیار کیا تھا۔ ان کے کتے Diamond نے لیمپ اُلٹ دیا، وہ نقشہ جل گیا، برسوں کی محنت خاک مل میں گئی۔ نیوٹن نے کہا میاں Diamond تم کو کیا خبر کہ تم نے کیا کیا۔ سوا اس ترکیب کے اور کوئی ترکیب غصہ روکنے کی نہیں ہے۔ بس بیٹی دعائیں اور التماس دعا۔

محمد علی عفی عنہ

---

(۱۵۵)

خواجہ غلام السیّدین کے نام

ردولی

دامت فضلکم وفیضکم

تسلیم و دعا

میرا ایک قریب ترین عزیز ہے "مُسیّب سلمہ" اس نے اس سال اردو میں ایم.اے. پاس کیا ہے۔ بدقسمتی سے اور خلاف امید سیکنڈ ڈویژن آیا ہے۔ باوجود اس کے پھر بھی آپ کو لکھنے کی جرأت کر رہا ہوں۔ کیونکہ یہ یقین ہے کہ پرکھنے والے جوہری کا سامنا ہے جو آدمی دیکھے گا اور ڈویژن کی پرواہ نہ کرے گا۔ فلہٰذا یہ درخواست ہے کہ اس کے لیے جو بہتر مشورہ اور بہترین امداد ہوسکتی ہوگی، اس سے دریغ نہ کیجیے گا۔ صرف یہ استدعا ہے کہ ہمیشہ کی طرح دل بڑھانے والا مشورہ دیجیے گا اور اس نیم کور مفلوج کی دعائیں لیجیے گا اور آس نہ توڑیے گا۔

کیا کہیں خواجہ صاحب۔ موت اور زندگی کے درمیان جھول رہے ہیں۔ اگر اعمال کی سزا ہے تو مالک یوم الدین کا عدل ہے اور اگر تخفیف عذاب کی صورت ہے تو الحمد للہ رب العٰلمین الرحمٰن الرحیم۔

آپ اور آپ والوں کا دلی دعاگو

محمد علی عفی عنہ

ردولی، ۲۶ر مئی ۱۹۵۷

---

(۱۵۶)

بنام چھبّن سلمہا

ردولی　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　مورخہ ۳۱ مئی ۱۹۵۷

میری بیٹی دعا۔

تمھارا حکم نامہ موصول ہوا۔ نیم اندھا ہوں، مفلوج ہوں، مفلوج کے معنی یہ ہیں کہ جب کوئی کچھ کہتا ہے۔ قیصر، سعید یا کوئی اور تو جسم بھر میں اعصاب اس طرح ہلنے لگتے ہیں جیسے پیپل کا پتّا ذرا سی ہوا میں۔ کاغذات کا کہاں پتہ ہے۔ دفتر جو کبھی دفتر تھا اب نخاس[1] میں رڈی کی دکان ہے جہاں پھٹی کتابیں نوچے، کھرونچے رجسٹر، پراگندہ اوراق سب بارہ آنے سیر پنساریوں کا سودا ہے۔ کھیوٹ، کھیتونی، کاغذات متعلق سیر وگذارہ سب وہاں بائیس پنسیری۔ حسد کرنے والے آج بھی حسد کرتے ہیں۔ وہ وقت دور نہیں کہ میں بجائے محسود کے خود حاسد ہو جاؤں۔ اگر مر نہ گیا۔ اللہ تم کو تمھارے مقاصد میں میرے جیتے جی کامیاب کرے مگر بیٹی میں مجبور ہوں۔ میاں نوشاد بیمار پڑے ہیں۔ ہلتے کانپتے جو کچھ کہو وہ کریں۔ روپے پیسے کا یہ حال ہے کہ سعید ہمت کرکے مجھ کو اٹھاتے ہیں۔ آدمی کا کال روپے سے بھی سخت ہے۔ بس بیٹی مجھ کو معاف کرو۔ یگاں یگاں کو میری دعائیں، معہ سبط کے۔ اگر کوئی صورت نکلی جو تلاش ممکن ہوئی اس سے دریغ نہ کروں گا۔ مگر بیٹی امید نہ لگانا۔ البتہ اودیس سب کاغذات تم کو دے سکتے ہیں۔ مگر وہاں پیچ ہیں۔ اس کے اندر پیچ ہیں، اس کے اندر چرخ۔ اس کے اندر کمانی۔ اللھم احفظنا۔ سبط اور سب بچوں کو بہت بہت دعائیں۔

محمد علی عفی عنہ

---

[1] پرانی چیزوں کی بازار جو لکھنؤ میں ہے۔

"گویا دبستان..." پڑھنے کے بعد شہاب الدین صاحب کا خط چودھری صاحب کے نام

11 مال روڈ۔ حضرت گنج لکھنؤ　　　　　　　　　　۴؍ جون ۱۹۵۷

نازِ نیاز مندان وفخرِ مُخلصاں۔ دامت فعلکم تسلیم۔

واللہ کہ آج دو دون کے بعد اس قابل ہوا ہوں کہ سر اٹھاؤں۔ آپ پوچھیں گے "ارے میاں تم ہو کون؟ اور سر جھکائے کیا سر مار رہے تھے؟ سنیے تعارف کی مجھے عادت نہیں اور یاد آوری کا میں قائل نہیں۔ میرا نام دیکھ کر آپ کو یاد ہو تو فبہا۔ ورنہ کسی سے پوچھ لیجیے گا کہ جن صاحب نے یہ اپنا نام اور پتہ لکھا ہے وہ ہیں کون ذاتِ شریف۔ ع

تم ہی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

ارے بھئی سر مار نہیں رہے تھے سر دھن رہے تھے۔ وہ ایک کتاب چمرو میاں کی "گویا دبستاں کھُل گیا" ہتھے چڑھ گئی تھی۔ پھر ہم تھے اور وہ۔ ہم نہ تھکے کتاب ہی ختم ہوگئی۔ جس طرح سرکس میں میاں جوکر کا گھوڑا ختمت بالخیر ہو جاتا ہے اور وہ دُم کی طرف سے پھسل پڑتے ہیں۔ مگر نہ پیاس بجھی نہ سیری ہوئی۔ جی چاہتا تھا کہ شیطان کی آنت ہو جاتی۔ مگر اونٹ کے منھ میں زیرا ہوگئی۔ اب بتائیں کہ ملی کیسے؟ عطیہ لاہور گئی تھیں اور وہاں سے یہ تحفہ ساتھ لائیں۔ عطیہ تو معہ بال بچوں کے صاحب کے دیس کی ہوگئی ہیں۔ ع

مسلم ہیں ہم وطن ہیں سارا جہاں ہمارا

یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ آپ کے خطوط پڑھے اور خوب جی لگا کر پڑھے۔ کہیں پر روئے، کہیں پر ہنسے، کہیں پر اپنے حال پر خجل ہوئے، کہیں آپ کو دعائیں دیں۔ ہما پر بڑا

رشک آیا، کاش ہم بھی کسی کی ہما ہوتے یا ہمارے کوئی ایسی عنقاء ہما ہوتی۔ پھر یہ سوچ کر صبر کر لیا کہ پہلے محمد علی بنو پھر اس کی تمنا کرو۔ مگر یہ تمنا بھی ویسی ہی ہے جیسے لیت الشباب۔ خطوں کو پڑھ کر اندازہ ہوا کہ محمد علی کے ایسے دنیا میں گئے ہوتے ہیں اور ہمارے ایسے تو استنجے کے ڈھیلے کی طرح مارے پھرتے ہیں۔ زبان کتنی پاکیزہ اور شستہ، محاورات اور روزمرہ کا کتنا برمحل برجستہ استعمال پڑھ کر جی چاہتا ہے پھر دہرایئے۔ خط کیا ہیں وسیع تجربات اور معلومات کا ایک خزانہ ہیں اور علم و فضل کی ایک کان جس میں سے ڈھلے ہوئے جواہرات اور ہیرے اُبلے پڑے ہیں۔ جس کا جی چاہے حسب توفیق دامن بھر لے۔ میرے پلّے بھی بہت کچھ پڑ گیا۔ اگر بغیر پڑھے مر جاتا تو ایک نعمت سے محروم رہتا۔ صفحہ 158 پر اللہ میاں سے آپ کا معاملہ ''ضرب کلیم'' سے کم نہیں۔ اور حضرت موسیٰ کے روائتی قصوں سے ٹکر لیتا ہے۔ مجھے اس لیے اور بھی پسند آیا کہ اپنے خیالات کا عکس بجنسہٖ اس میں نظر آ گیا۔ دعائیں مانگتا تھا مگر مانگنا نہیں آتی تھیں۔ جس طرح کوئی بیچارہ کم علم اپنی عرضی نہ لکھ سکے نہ اپنا مدعا حاکم کے سامنے بیان کر سکے۔ جی چاہتا ہے کہ آپ کی جو بھی کتابیں مل سکیں، پڑھ ڈالیں۔ آپ کہیں گے یہ حسن طلب ہے۔ اچھا ہے! آپ کے پاس نہیں ہیں تو ملنے کا پتہ بتا دیجیے۔ ''میرا مذہب'' پڑھنا چاہتا ہوں۔ نیاز فتحپوری کے ڈرانے سے نہیں ڈرتا۔ لا مذہب ہو جانے کا انشاء اللہ اندیشہ نہیں ہے۔ نیاز صاحب کی خدمت میں مجھے نیاز حاصل ہے۔ وہ میرے استاد رہ چکے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ میں یہ گن بھرے ہیں۔ آپ تو چھپے رستم نکلے۔

آپ کی خیرت عرصے سے نہیں ملی تھی۔ اب ایک دم سے یاد آ گئے ردولی کچھ دور نہیں مگر۔

چُنانت دوست میداوم کہ وصلت دل نمی خواہد

کا مضمون ہے۔ کئی سال سے تقریباً خانہ نشین ہو گیا ہوں۔ کمرے پھاٹک تک جانا معرکہ سر کرنا ہے۔ کبھی بلڈ پریشر بڑھ جاتا ہے۔ تو ڈاکٹر لِٹا دیتے ہیں، ورنہ خود ہی زیادہ تر چارپائی کے بانده توڑا کرتا ہوں۔ جاؤں کہاں اور ملوں کس سے؟ مبشر تھے وہ بھی خدا کو پیارے ہو گئے سڑک پر نکلتا ہوں تو کوئی شناسا صورت آشنا نظر نہیں آتا۔ آنکھیں پھاڑ کر سب کی

شکلیں دیکھتا ہوں، اور پھر نیچی نگاہ کیے اپنی راہ لیتا ہوں۔ نئی نئی قسم کی بولیاں سُنتا ہوں۔ سندھی، پنجابی، بنگالی اور نئے ٹھاٹھ کی ہندی۔ اپنے ہی دیس میں اجنبی ہوگیا ہوں۔

چمن میں جا، نہ صحرا میں ٹھکانا
کہاں اڑ جائیں لے کر آشیانا

میرے بچے، دوست، احباب، محبت کرنے والے اعزّہ آپ ہی کے موتیوں کی طرح پاکستان میں بکھرے ہیں۔ وہ نہیں آتے۔ میں خود ہی تیسرے سال ایک چکّر لگا آتا ہوں۔ بیوی میرے ساتھ ہیں مگر دو سال سے صاحب فراش۔ ایڑی کی ہڈی پر ناسور ہوگیا ہے، اور باوجود ہر امکانی تدابیر کے اچھا نہیں ہو رہا ہے۔ آپ بفضلہٖ خوش نصیب ہیں کہ تفریح اور وقت گزاری کے لیے چند پُرخلوص، ہم مشرب اور ہم خیال احباب کی صحبت حاصل ہے۔ ہم اِس سے کلیتًا محروم ہیں۔ اور بڑی محرومی ہے۔ بس میں ہوں اور میرا کمرہ جس کا نقشہ یوں کھینچا ہے:۔

یہی ایک کمرہ یہی ایک مسکن — یہیں میر کونے میں حسب لیاقت
یہیں لکھنا پڑھنا یہیں لیٹ رہنا — یہیں شاعری اور خط و کتابت
نہ ملنا کسی سے نہ جانا کہیں پر — بس اب دور کی سب سے صاحب سلامت
جو نکلیں بھی گھر سے تو جائیں کدھر — کہ ہے پائے رفتن نہ جائے اقامت
یہ جینا بھی جینے میں جینا ہے کوئی — کہ بس جی رہے ہیں بہائم کی صورت
طبیعت شگفتہ نہ دل شادماں ہے — نہ تفریح کوئی نہ دل چسپ صحبت

غرض

آرزوئے موت میں مرتے ہوئے
اک زمانہ ہوگیا جیتے ہوئے

عطیہ نینی تال گئی ہیں۔ آپ کو سلام لکھا گئی ہیں۔ واپسی پر آپ کی زیارت کا ارادہ رکھتی ہیں۔ میں بھی گھِسَٹ آؤں تو تعجب نہیں۔ اسلام احمد صاحب نے بھی سلام لکھوایا ہے۔ بیگم حبیب اللہ تزئین سلمہا کے پاس کراچی گئی ہیں۔ مکرر یہ کہ تصویر میں آپ میر انیس کے زمانے کے کوئی مرثیہ گو معلوم ہوتے ہیں۔ مختصر یہ کہ اس کتاب کے ساتھ نہیں

جاتی۔ آپ نے اس کو چھپوا کر اپنے چاہنے والوں پر ظلم کیا ہے۔ ہم نے نہ کبھی آپ کو ایسا دیکھا نہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ کیا کریں آنکھوں میں تو وہ تیس سال پہلے کی تصویر پھر رہی ہے اس کو کیسے انگیز کریں۔ مگر واہ رہے ہم۔ ذرا ہماری خود کی شکل تو ملاحظہ کیجیے۔ شاید آپ پہچان نہ سکیں۔

نہ دنداں دہن میں نہ آنتیں شکم میں
پچکنے سے گالوں کے کیا شکل و صورت

خیریت کا طالب

عقیدت کیش نیازمند

شہاب الدین

"...... چودھری محمد علی کے خطوط (ہما بیگم کے نام) کسی علمی تصنیف یا محض ادب نگاری کا حیلہ و بہانہ نہیں اور پھر بھی عین ادب قرار پاتے ہیں۔ پُر لطف اور دل آویز ہونے کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں فکر انگیز بھی ہیں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کی اپنی شخصیت ان میں پوری طرح جھلک جاتی ہے جو خود ان تحریروں سے کم دل آویز نہ تھی..."

(شان الحق حقی: "گویا دبستاں کھل گیا"۔ دوسرا ایڈیشن)

(۱۵۸)

شہاب الدین صاحب کے خط کے جواب میں
چودھری صاحب کا خط

ردولی

واہ شہاب الدین صاحب آپ نے یہ خط اب لکھا۔ پہلے نہ لکھا کہ اس کو سامنے رکھ کر میں ہما کو لکھا کرتا اور ''گویا دبستاں کھل گیا'' میں چار چاند لگ جاتے۔ نظم میں باتیں، نثر میں باتیں۔ بڑھاپے کا حال عبرت کا سبق دیتی ہیں۔ اور اس کے ساتھ دل کو پُرکشش حال سے تقویت بخشتی ہیں۔ عطیہ سلمہا کا آنا اور ان کے ساتھ آپ کا تشریف لانا ایسا مژدہ ہے کہ اپنی قسمت دیکھ کر یقین نہیں آتا۔

دوست راگر سر پُرسیدنِ بیمار غم است
گو بیاخوش کہ ہنوزش نفسے می آید

بڑھاپے کا قبضہ جب آپ کی صورت پر ہو جائے تو اس مردہ متحرک کا کیا پوچھنا۔ جُوبنوا چار دناں دینو ساتھ۔ جوبن رُت جاتے ہی سبھی مُکھ موڑ لیو کدَر نہ پوچھیں بات۔ جُوبنا چار دناں دینو ساتھ۔

کل آنکھوں میں سرخی کم ہوگئی تھی۔ چار مہینوں سے ڈاکٹر نے لکھنا پڑھنا سب بند کر دیا تھا۔ آپ کا خط پڑھ لیا۔ آج پھر آنکھیں سرخ ہوگئیں۔ لے بھائی شہاب الدین ای کا کیہو۔ ہمرا کیا لراوا سب مٹی کر دیہیو۔'' اگر مجھ کو بالکل اندھا کرنا ہے تو دو ایک خط ایسے ہی اور بھیج دیجیے تا کہ آنکھیں پھوٹیں، پیر جائے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ مرتے مرتے دنیا دیکھوں تو عطیہ سلمہا کو سمجھا بجھا کر کسی طرح ردولی تک لے آیئے۔ لیجیے صاحب! عطیہ کے نام پر غریب رضیہ سامنے آکھڑی ہوئی ہیں۔ لٹی پھٹی ذکیہ آگئیں۔ اے لو شاہد بھائی بھی آگئے۔ ہمارے ساجد آگئے۔ ارے کوئی اس مفلوج کو تعظیم کے لیے اٹھائے۔ ڈپٹی

واحد حسین چچا تشریف لائے ہیں۔ اور دیکھو پیچھے پیچھے مقبول بھائی، مشیر بھائی۔ ارے مبشر آؤ میری چھاتی سے لگ جاؤ۔ کیا کہیں شہاب الدین صاحب اختلال حواس نے زندوں مُردوں کو اکٹھا کر دیا۔ لیجیے میں دعا مانگتا ہوں۔ آپ آمین کہیے۔ بار الہا! جو زندہ ہیں ان کو آرام سے رکھ، اور اپنے اپنے بچوں کا سُکھ دیکھنا نصیب کر! آمین رب العٰلمین! اور جن کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دی ہے ان کو قربت اللہ کی دولت دن دن نصیب کر۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

آپ نے میری تصویر کو مرثیہ خواں کا خطاب دیا ہے۔ خط واقعی مرثیہ ہوگیا۔ کیا کروں خوشی خواب ہوگئی سوا موت کے اور تعبیر نہیں خدا آپ کو زندہ اور سلامت رکھے۔ آپ کے گھر میں خدا صحت بخشے اور آپ کو صحیح و توانا کرے۔ میرا حال بھی قابلِ شکر ہے۔ جگہ سے اٹھ سکتا نہیں۔ سوا صبح کے دماغ سے کام لے سکتا نہیں مگر اتنا اچھا ہوا ہے کہ خدا نے کم و بیش اپنی یاد کی نعمت بخشی ہے۔ **حسبی اللہ و نعم الوکیل نعم المولیٰ و نعم النصیرا۔**

شہاب الدین صاحب! اس کے مراحم کا کیا پوچھنا۔ ہم ملحد بے ایمان بھی، اس کی عنایات کی آس لگائے ہیں جس نے فرمایا ہے:۔

قُل یا عِبَادِیَ الَذِیْنَ اَسْرَفُوا عَلیٰ اَنْفُسِهُمْ لَا تَقْنَطُوا من رَّحمۃِ الله اِنَّ الله یَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمیْعاً اِنَّه هُوَالْغَفُورُالرَّحِیْم.

میرے پاس صرف ''گناہ کا خوف ہے'' وہ حاضر ہے۔ ''صلاح کار'' بُڑھیا ہوگئی۔ آپ بھی پیش از وقت بڈھے ہوئے۔ جنسی معاملات کو خیر باد کہیے۔ ''کشکول محمد علی شاہ فقیر'' صدیق بک ڈپو میں ملے گی۔ شاید ''اتالیق بی بی'' بھی مل جائے۔ ''میرا مذہب'' دیمک چاٹ گئیں۔ اللہ بخشنے والا ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

محمد علی عفی عنہ

---

(۱۵۹)

ہما بیگم کے نام

ردولی　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　یکم ستمبر ۱۹۵۷ء

میری جان! دعا۔

دو دنوں سے چاہتا رہا کہ خط نوشاد سے لکھوا دوں۔ مگر موقع نہ ملا۔ اب خود لکھتا ہوں۔ اللھم تمتہ بالخیر۔ مدّو کی صحت اللہ تم کو مبارک کرے۔ رتی کی دلداری۔ اللہ میاں تمھاری عمر بھر قائم رکھیں! آمین! ثم آمین! میرے حواس میں پوری طرح اختلال آچکا ہے۔ صرف صبح کو ذری حواس درست رہتے ہیں۔ چاند کے حساب سے اٹھہتر واں سال ہے۔ پھر اب اور کیا چاہتی ہو۔ موت کا ڈر بہت ہے، عذاب کا ڈر اُس سے زیادہ ہے۔ مگر پھر بھی رحم و کرم کی آس ہے۔

اچھا سنو! میری تمام تصنیفیں یکجا چھپیں۔ یہ آرزو دل میں تھی اور ہما بیگم اس کا انتظام کریں۔ یہ ہماری آرزو تھی۔ خدا کی قدرت اور رحمت دیکھیے کہ ایک سوئیڈن کے ذریعہ سے جناب باری نے یہ امید دلائی۔ حسبی اللہ ونعم الوکیل نعم المولیٰ ونعم النصیر۔ احسان مندی اور مراسم کا تقاضہ ہے کہ یہ کام صلاح الدین صاحب کے سپرد کیا جائے۔ تجربہ اور دور اندیشی کا تقاضہ ہے کہ سوئیڈ کے سپرد کیا جائے۔ لیکن تم نے سوئیڈ کے ذریعہ چھپوایا تو سب سے زیادہ کامیاب کتاب یعنی گویا دبستاں کھل گیا۔'' تم نہ چھپوا سکوگی۔ پھر اس کمپنی کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ میرے خیال میں ہما! تم افوض امری الی اللہ پر چھوڑ دو اور استخارہ دیکھو۔ تمام باتیں انشاء اللہ ہو جائیں گی۔ اگر چھپوانا تو ''آسکر وائلڈ'' والا ڈرامہ بھی شامل کر لینا۔ تمھارے پاس ''اتالیق بی بی'' ''پردے کی بات'' ''میرا مذہب'' وغیرہ ہیں یا نہیں؟ دیباچے میں لکھنا پڑے گا کہ سب کتابیں بہت غلط چھپی ہیں۔ کیونکہ والد مرحوم ہمیشہ اس کا رونا رویا کیے۔

تم لوگوں کو اگر مرنے سے پہلے دیکھ لیتا تو اچھا تھا۔ ورنہ کچھ ایسا ہرج نہ ہوگا۔

دعا گو، محمد علی عفی عنہ

میں دیکھنے میں بالکل اچھا ہوں مگر کیا کہوں اعصاب کا تماشہ نہ بیان کرنے کے قابل ہے نہ سمجھنے کے قابل ہے۔ بحمد اللہ سب خیریت ہے۔ اختلال حواس کا تماشا دیکھو ہما کا پتہ میاں محمد علی بھول جائیں اور میاں جابر اتفاق سے آجائیں تو یاد دلائیں۔ شکراً شکراً۔ عفواً عفواً عفواً یا اللہ یا رباہ! یا سیداہٗ الحمد للہ رب العلمین۔

جابر تسلیم عرض کرتے ہیں۔ سعید علی گڑھ میں ہیں۔ قیصر اندر ہیں۔ اگر یہاں ہوتیں تو دعا کہتیں۔ ارے آج اتوار ہے۔ جابر غریب کو فضول ڈاک خانے تک دَوڑ پڑی۔

دعا گو

محمد علی عفی عنہ

---

(۱۶۰)

ہما بیگم کے نام

ردولی   ۵ فروری ۱۹۵۸

ہما بیگم! دعا۔

نہ معلوم کس کس کو خط کے جوابات دینے ہیں مگر خط لکھنا میاں فرہاد کا جوئے شیر لانا ہے۔ جب اپنی کوتاہ قلمی اور بے بسی کا خیال آتا ہے تو سب سے پہلے تم یاد آتی ہو۔ اگر کوئی ضرورت پاکستان کی ذہن میں آتی ہے تب بھی سب سے پہلے بی ہما سامنے کھڑی ہوتی ہیں۔ ابھی ابھی چھبّن کا خط آیا ہے۔ اب یہ کارڈ تمام کروں یا چھبّن کا خط شروع کروں۔ خیر اب تو کسی کو نہ لکھوں گا۔ اگر ہو سکا تو کل انشاء اللہ تعالیٰ دیکھا جائے گا۔ اب آگے تمھارے نوشاد چچا لکھ رہے ہیں۔ مجھ کو یاد آ گیا کہ ''نقوش'' کا مکاتیب نمبر دو جلدوں میں نکلا ہے۔ کوئی صاحب مالک رام(77) ہیں۔ انھوں نے میرے خطوں کی بڑی تعریف کی ہے۔ مرتا دم ہے مگر اپنی تعریف سے جی خوش ہو جاتا ہے۔ طفیل صاحب کو لکھو کہ اب کی بار مجھ کو محروم کر دیا۔ واقعی کہاں تک صدقہ خیرات کیا کریں۔ تم بیٹی دس روپے ان کو دے دو، اور دونوں جلدیں مجھ کو بھجوا دو۔ جس کو حکم دینا میں روپے یہاں دے دوں گا۔ دیکھنے میں ابھی اچھا ہوں مگر گھڑی گھڑی بے بسی بے اختیاری بڑھتی جا رہی ہے۔ اختلال حواس بھی زیادہ ہوتا جا رہا ہے۔ موت اتنی عام چیز مگر ''کھول گھونگھٹ جب پیا مکھ دیکھی ہیں'' سے نہ معلوم کیسا ڈر معلوم ہوتا ہے۔ اچھا بھئی ہوگا اور باتیں کریں۔ تم اپنا حال اور میرے ذریات کا حال جس قدر لکھ سکتی ہو لکھو اور سب سے کہہ دو کہ ہم کو خط لکھنا اور جواب کی امید نہ رکھنا۔ جنت کا پروانہ راہ داری حاصل کرنا ہے۔ کیونکہ اصل خیرات وہی ہے جس میں لا یزید منکم جزاءً ولا شکوراہ کی شرط پوری ہو۔ الّن کا ایک خط میرے معذرت نامے کے جواب میں آیا تھا کہ قالین تم ہی رکھو۔ اس کا جواب آج تک نہ گیا، بس اب نوشاد لکھیں گے۔ سب کو دعائیں۔ آخر میں سب کے بعد پتہ پھر میں نے لکھا۔

محمد علی عفی عنہ

(۱۶۱)

بجناب قاضی سید محمد طاہر صاحب (ایڈوکیٹ) سیتاپور

ردولی ۱۲ر فروری ۱۹۵۸

خلاصۂ اخفاد طاہر صلوٰۃ اللہ علیہ محمد طاہر صاحب کو اس گناہ گار سیہ کار کا سلام پہنچے۔ معلوم نہیں کہ مجھ سے نادانستہ کون سی نیکی ہوگئی ہے کہ خداوند تعالیٰ کے اکثر نیک بندے اپنے دل میں میری جگہ رکھتے ہیں۔ میرے گناہوں کی ایک سزا یہ ہے کہ اپنے ہاتھ سے خط نہیں لکھ سکتا۔

''رحمت حق بہانہ می جوید''

بڑے بڑے گناہ اور اس کی یہ معمولی سزا۔ سوا اس کے اور کیا ہے۔'' سبقت رحمۃٗ علیٰ غضبہٖ''

اس وقت صبح کے نو بجے ہیں۔ جو جو دن بڑھے گا۔ اختلال حواس بھی بڑھتا جائے گا۔ یہاں تک کہ زوال آفتاب کے ساتھ زوال عقل بھی ہوتا جائے گا۔ خط لکھنا کیا، خط لکھوا بھی نہ سکوں گا۔ موت آہستہ، آہستہ بڑھتی چلی آتی ہے۔ بقول شاعر کے۔''چلی آوَ دھیرے دھیرے۔'' خیال تو کیجیے کیسے افضالِ الٰہی ہیں کہ موت ایسی ناگوار چیز کس خوبصورتی سے رفتہ رفتہ گوارا کروائی جا رہی ہے کہ عنایت فرماؤں سے مغفرت کی دعائیں استدعا ہوتی رہیں اور شاید کوئی ایسا بھی موقع مل جائے کہ چشم محتاں روئے حبیاں دیکھ کر مسرور ہوجائیں۔

مولانا کاظم دام فضلہٗ کی پامردی سے یہ بھی موقع ہاتھ آگیا۔ ورنہ نہ معلوم کتنے خطوط دعائیہ لکھ چکا ہوں کہ قلم اور کاغذ کے شرمندہ نہیں ہوئے۔ لیجیے صاحب حواس اپنی راہ لگے، لہذا دعا کے اوپر ختم کرتا ہوں۔

نجات کا طالب نیم جاں
محمد علی عفی عنہ

(۱۶۲)

ہما بیگم کے نام

ردولی ۱۴ر فروری ۱۹۵۸

میری جان! دعا۔ نہ تو نوشاد ہیں نہ آفاق۔ مجبوراً میں خود لکھ رہا ہوں گھبراؤ نہیں اچھا ہوں۔ زندہ ہوں۔ مگر بے بسی بے اختیاری زیادہ ہو رہی ہے۔ نہ معلوم کیا کیا لکھنا چاہتا ہوں مگر نہ معلوم اس وقت کیا بھول گیا اور کیا یاد ہے۔ بہر حال مجھ کو بتاؤ کہ ''اتالیق بی بی'' تمھارے پاس ہے یا نہیں۔ اور اس کو میری کتابوں کے ساتھ دوسری طبع میں چھپواؤ گی یا نہیں؟ میرا دل تو یہی چاہتا ہے کہ وہ بھی چھپتی۔ اس کے علاوہ ''نقوش'' کا مکاتیب نمبر میرے پاس نہیں پہنچا۔ اگر طفیل صاحب بے قیمت عنایت کریں تو ان کی مرحمت ہے۔ اگر قیمت لیں تو دے دو۔

آج کل آفاق باہر گئے ہیں۔ میں بہت گھبراتا ہوں۔ اللہ میاں رفتہ رفتہ تکلیف دینی شروع کر رہے ہیں تاکہ تخفیف عذاب عقبیٰ اور گناہگار پر موت کم گراں رہ جائے۔

ہما پیاری! میرا خط لکھنا جوئے شیر لانا ہے مگر تم کو لکھ سکتا ہوں۔ دوسرے کو لکھنا ہوتا تو قریب قریب ناممکن تھا۔ اور سب خیریت ہے۔ بچوں کو یگاں یگاں دعا۔ قیصر دعا کہتی ہیں۔

دعا گو

محمد علی عفی عنہ

۲۲ر رجب المرجب

۲۲ر رجب کے کونڈوں کی تاریخ جانتی ہو؟

اگر نہ جانتی ہو تو جان لو۔ مولوی بھی کیا دھوکے دھڑی کا آدمی ہے مگر کبھی کبھی مذاق بھی کر لیتا ہے۔

محمد علی عفی عنہ

(۱۶۳)

شاہ آفاق احمد کے نام

ردولی ۲۹؍فروری ۱۹۵۸

آفاق بیٹا۔ دعائیں قبول کرو۔ تمھارا 24 کا لکھا ہوا خط شاید 27 کو آیا تھا۔ آج پہلی ہے اس کے پہلے جواب نہ لکھ سکا۔ صبح کا وقت ہے اس لیے نسبتاً حواس بجا ہیں ایک تسبیح درود کی پڑھی اس لیے خط لکھنے میں فی الجملہ آسانی ہے۔ تمھاری دلی تکلیف کا حال سن کر الجھن سی ہوئی مگر کیا بس ہے جب جی گھبراتا ہے تو تسبیح اٹھا کر پڑھنے لگتا ہوں۔ صحیفہ کاملہ کے دیباچے میں کل علامہ محمد کامل حسین پروفیسر جامعہ مضمون پڑھنے لگا۔ اس میں امام زین العابدین علیہ السلام سے خوش عقیدگی کے ذیل میں دعا کا حوالہ نکلا جس نے میری ندامت کم کر دی۔ یعنی میں عموماً جب کسی طرح دل نہیں بہلتا تو صحیفۂ کاملہ پڑھنے لگتا تھا۔ یا تسبیح اٹھا لیتا تھا۔ اس دعا میں نکلا کہ بار الہا بیکاری میں میرے......؟ درست کیا کر۔ یعنی اللہ میاں ایسے وقت میں بھی ہماری مدد کرتے ہیں۔ جب ہم خالی دل بہلانے کے لیے بھی تسبیح گھمانا شروع کرتے ہیں۔ بیٹا تمھارا دل نہ معلوم کیوں اندر سے پریشان ہے۔ تم بھی یہی ترکیب کرو اور اگر نہیں تو ایک دانے پر سبحان ربیّ الاعلیٰ۔ سبحان ربیّ العظیم پڑھا کرو۔

معلوم نہیں تم پہلے آؤ گے کہ موت پہلے آئے گی۔ مگر اتنا جانتے ہیں کہ اللہ میاں جس کو پہلے بھیجیں گے۔ مبارک ہوگا۔

قلم خراب ہوگیا ہے اس وجہ سے لکھنے میں الجھن ہوتی ہے۔ تمھارے گھر میں بحمد اللہ خیریت ہے۔ تمھارا سلام سب کو پہنچا دیا گیا۔ ہمارا سلام ہمارے جاننے والوں کو دعا کے ساتھ پہنچا دو۔

قیصر اور سب دعا و تسلیم وغیرہ وغیرہ کہتے ہیں۔

دعا گو

محمد علی عفی عنہ

ہما بیگم کے نام

ردولی ۳/ مارچ ۱۹۵۸

ہما پیاری! تمھارا کراچی والا خط آیا۔ حال معلوم کرنے کی خوشی ہوئی۔ اور فی الجملہ تسکین ہوئی۔ ''اتالیق بی بی'' مل گئی۔ اچھا ہوا۔ اس میں اتالیق بی بی کے میاں کا نام میں نے اللہ بخش رکھا تھا۔ دوسری طبع میں کسی نے اس میں اصلاح دے کر محمد حسین کر دیا تھا۔ کلب والے باب میں ایک جگہ تھا ''فرح بخش وہی اللہ بخش موئے کے جوڑ کا نام۔'' اب وہ بعد اصلاح ہوگیا ہے۔ ''فرح بخش وہی محمد حسین موئے کے جوڑ کا نام ہے۔'' ان چیزوں کو تم کاپی تصحیح کرتے وقت یا پہلے ہی بتا دینا۔ مجھ سے صلاح مشورہ لینے کے لیے نہ اٹھا رکھنا۔ تا توبہ من میری۔ من بہ خدا میرسم۔ صلاح الدین صاحب کا پاؤں جہاں درمیان ہو وہاں جلد کام شیطان کا۔ قیصر تم کو دعا کہتی ہیں، اور ہم بھی تم کو دعا کہتے ہیں۔

محمد علی عفی عنہ

---

(۱۶۵)

ہما بیگم کے نام

ردولی ۳۰؍جولائی ۱۹۵۸

ہما پیاری! دعائیں۔

نہ معلوم کب سے تم کو ایک خط لکھنا چاہتا ہوں مگر آنکھوں کی وجہ سے نہیں لکھ سکتا۔ گویا بالکل اچھی نہیں ہوئی ہیں، مگر ایسی ہوگئی ہیں کہ یہ کارڈ لکھ سکتا ہوں۔ سعید علی گڑھ گئے۔ نوشاد ان کو داخل کروانے لے گے ہیں آفاق الہ آباد گئے ہیں۔ آنے جانے والے کوئی ہیں نہیں۔ ہم آرام کرسی پر پڑے قید تنہائی بھگت رہے ہیں۔ قیصر ضروری تیمارداری کرتی ہیں مگر گھر کا دھندا اتنا ہے کہ اس میں ہمارا حصہ اچھا خاصہ لگاتی ہیں۔ مگر پھر بھی تنہا پڑے پڑے تخفیف عذاب کی صورت اللہ میاں نکال ہی دیتے ہیں۔ چھبّن کا ایک خط آیا تھا اس کا جواب ابھی تک نہ لکھا۔ لکھنے کا ارادہ تھا مگر لکھتے ہی پیٹھ میں درد ہونے لگتا ہے، اس لیے کل لکھوں گا۔ بھاڑ میں جائے ہمارا دُکھڑا یہ تو جے گھڑیاں زندگی کی باقی ہیں ہوتا رہے گا۔ تم اپنا حال لکھو اپنے بچوں کا حال لکھو۔ اخلاق اور دوست احباب اور اپنی ذریات کا حال لکھو۔ ہم کو صبر کرو۔ اگر کراچی کسی کو خط لکھنا تو مرنے کی معذرت سب کو لکھ دینا۔ قیصر دعا کہتی ہیں۔ جابر تسلیم عرض کرتے ہیں۔ بچوں کو میری بہت بہت دعا۔

راقم

تمھارا باپ عفی عنہ

---

(۱۶۶)

ہما بیگم کے نام

ردولی　　　　　　　　　　　　　　　　　　۱۲/اگست ۱۹۵۸

میری جان! دعائیں۔ دعائیں۔ دعائیں۔

تمھارا خط عین انتظار میں آیا۔ انتظار تو ہمیشہ ہی رہتا ہے۔ کبھی تمھارا کبھی موت کا۔ یہ تو پرانا راگ مالا ہے۔ نہ معلوم کتنے دنوں سے ایک خط الّن کو لکھنا چاہتا ہوں مگر نہ لکھ سکا۔ اور تمھارا خط کل ہی آیا اور آج ہی جواب لکھ رہا ہوں۔ یہ کون انصاف کون حق پرستی ہے۔ حالانکہ تم جانتی ہو میں سب کو برابر چاہتا ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ تم سے دل ملا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ میں کہوں؟ تم اپنی بوبو[1] مرحومہ سے بہت زیادہ خوب صورت ہو مگر کچھ جھوئیں[2] تم سے دور تم میں ان کی اوروں سے زیادہ ہے۔ اچھا خیر محبوب عالم استعفیٰ دے کر پاکستان کو جا رہے ہیں۔ مجھ کو یہ معلوم ہوتا ہے جیسے میرے پیچھے سے کوئی گاؤ تکیہ گھسیٹے لیے جا رہا ہے۔ قیصر ان کو رخصت کرنے گئی ہیں۔ نوشاد کسی مقدمے میں بارہ بنکی گئے ہیں۔ میں گھر میں حوالات میں بند ہوں۔ آنکھیں آدھی اندھی آدھی ڈھٹیاری[3] اور میں یاقوت رقم خوانی کر رہا ہوں۔ چھوٹے چھوٹے موتی پرو رہا ہوں اس وجہ سے کہ پوسٹ کارڈ لفافہ ہو جائے۔ میری حوالات آرام کرسی ہے۔ جیسا کہ تم جانتی ہو خط لکھنے میں اٹھ کر بیٹھنا پڑتا ہے۔ لکھنے میں سر جھکانا پڑتا ہے۔ کمر میں درد، گردن میں درد، پیٹھ میں درد معلوم ہوتا ہے فقرہ فقرہ الگ ہو جائیگا۔ مگر

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمھارے نام کے

اچھا اور سنو۔ یہاں لیڈی ڈاکٹر نئی آئی ہے۔ بڑی خوبصورت ہے مگر سب سے بڑی

---

1. ہما کی والدہ۔　　2. شباہت۔
3. اچھی۔

خوبی ہے کہ آنکھوں کی پتلیوں سے روح کی نفاست جھانکتی رہتی ہے۔ اس کا ایک لڑکا ہے۔ نام تو ابھناش چندر لنک ڈھاون[1] لنک بگاڑن ترپاٹھی رکھا ہے۔ بڑا شریر ہے۔ مگر بچوں کی شرارت ہے، حرامزدے لڑکوں کی ایسی نہیں ہے۔ یہ لوگ جب میں بلاتا ہوں چلے آتے ہیں، اور میرا دل بہل جاتا ہے۔ آج کل قیصر بیگم کا پارہ بہت اونچا ہوگیا ہے۔ مجھ کو بھی بے بسی کی جھنجھلاہٹ چڑھی ہے۔ جھٹک جھٹک کے اتارنے کی کوشش جو کی تو ان کا پارہ اور چڑھ گیا۔ اب لکھنؤ گئی ہیں اور میں استغفراللہ اور درود کی تسبیح پڑھ رہا ہوں کہ کہیں میرا بھی تھرما میٹر نہ ٹوٹ جائے۔ آفاق بیمار تھے مگر بحمد اللہ اب اچھے ہیں۔ اوپر اللہ نیچے ان کی آس ہے۔ جابر اچھے ہیں بچوں کو دعا۔

میرا دل بیتاب تھا کہ یہ خط ڈاکٹرنی کو سناتا۔ اللہ نے ان کو بھیج دیا۔ سوا اس کے اور کا کہوں کہ اللہ میاں نے بن شان گمان میرا دل رکھا۔ شکراً شکراً۔ اللہ میاں یہ گناہ گار بندہ تیرا شکر کہاں تک ادا کرے۔

راقم

تمھارا عاشق تمھارا باپ

محمد علی عفی عنہ

---

[1] یہ ہنومان جی کا نام ہے جنھوں نے لنکا فتح کیا۔

ہما بیگم کے نام

ردولی — ۲۴؍اگست ۱۹۵۸

ہما پیاری! دعائیں۔

تمھارا خط آیا۔ اتنی دور بیٹھی ہوئی تم اپنے باپ کی خبر گیری کرتی رہتی ہو۔ خدا تم کو اس کا اجر دے۔ میری حالت ہر حال میں قابلِ شکر ہے۔ کمزوری بڑھتی جاتی ہے۔ موت قریب آتی جاتی ہے۔ ''چلی آؤ گوریا دھیرے دھیرے۔'' اگر اس کا نتیجہ فالج کا دوسرا حملہ ہے تو معلوم نہیں حساب کتاب فوراً بند ہوگا یا دیر تک لٹکا رہوں گا۔ غریب تفقد مرحوم دو تین دن حواس کھو کر پڑے رہے اور بغیر تکلیف کے چلے گئے۔ محبوب حسین خاں مرحوم دوسرے حملے کی برداشت صرف ایک رات اٹھا کر ختم ہوئے۔ ہماری نہ معلوم کیا گت ہو۔ مہینوں ایڑیاں رگڑا کروں یا چٹ منگنی پٹ بیاہ والی بات ہو۔ بہر حال جو کچھ ہوگا معلوم ہو جائیگا۔ نائی نائی کتنے بال؟ جواب ملا کہ سامنے آتے ہیں۔ گن ہی لینا۔ ابھی تک تو حواس بھی ہیں۔ صبح کو کچھ عقل بھی کام دیتی ہے۔ اس کے بعد سوا سبحان ربی الاعلیٰ و بحمدہٖ سبحان ربی العظیم و بحمدہٖ کے کچھ نہیں سمجھ میں آتا۔ غور کرو کہ اس کارڈ کے شروع میں قلم اختیار میں تھا اور آخر میں قلم بھی منھ زوریاں کرنے لگا۔ نوشاد، آفاق، قیصر پوری تیمارداری، خاطر مدارات کا حق ادا کر رہے ہیں۔ البتہ ہم اللہ میاں کا پورا شکر نہیں ادا کر سکتے۔ سب بچوں کو دعا۔ الّن کا خط آیا تھا۔ اب ان کو اگر زندہ رہا تو کل لکھوں گا۔ گجن کو بہت دنوں سے نہیں لکھا ہے۔ چھٹن کو نہیں لکھا ہے۔ اب اگر زندگی ہے تو آئندہ دیکھا جائیگا۔

دعا گو

تمھارا باپ عفی عنہ

---

(۱۶۸)

شانُ الحق حقی (78) کے نام

ردولی، اتر پردیش ۱۰ر ستمبر ۱۹۵۸

میرے چاند صاحب! کون ایسی دعا دوں کہ سیدھی درِ اجابت پر پہنچے۔ کتابیں آئیں۔ خطوط بھی آتے ہی رہتے ہیں۔ مگر نہ معلوم کس خلوص سے کتاب آپ نے بھیجی ہے کہ جی باغ باغ ہوگیا۔ دماغ روشن ہوگیا۔ دل کی کلی کھل گئی۔ جیسے یہ معلوم ہوا کہ ایک خوراک جواہر مہرے کی کھالی۔ سب سے پہلے وہ ریختی پڑھی اور دل سے دعا نکلی کہ اللہ اس پیاری من موہنی اُردو کو رہتی دنیا تک رکھے۔ اس کے بعد اور غزلیں اور نظمیں پڑھیں۔ جب جب دل پھڑک پھڑک اٹھا ہے تب تب کتاب الٹ کر آپ کی تصویر دیکھ لی، اور دعائیں دینے لگا۔ ایک میرا دوست اور ہم مذاق ہے آفاق سلمہٗ۔ آج کل کچھ بیمار ہے۔ جیسے کوئی مزے کی چیز کھاؤ تو اپنے پیارے یاد آجاتے ہیں۔ اسی طرح ہر مزے کے شعر پر وہ سامنے آکر کھڑے ہوگئے۔ جی نہ مانا وہ کتاب ان کو بھیج دی۔

انھوں نے جلد کتاب واپس کرنے کو کہا ہے۔ کیوں کہ صاحب دل آدمی ہے اور دل پہچانتا ہے۔ آپ کی کتاب پڑھ کر دل میں گزرا کہ اتنے آدمی شعر کیوں کہتے ہیں۔ اگر اردو نہیں جانتے تو غریب اردو کا گلا کیوں گھونٹتے ہیں۔ اگر پڑھنے والوں پر رحم نہیں ہے تو بے چاری اردو ہی پر ترس کھائیں۔ لکھنؤ کی اردو دل کا دامن پکڑ لیتی ہے کہ ابھی آئے ابھی چلے۔ بیٹھو بھی۔ مگر دلّی کی اردو آج بھی تو من موہ لیتی ہے۔ اب اس کے بجائے یہاں لمبی گھونگھٹ والی ہندی، دہلی، لکھنؤ دونوں جگہ چھائی بچھائی ہے۔ گھونگھٹ الٹ کر دیکھا تو سارا منھ طباق چہرہ سیتلاجی [1] کا استھان ہے۔ گہنا پاتا وہ کہ ڈر لگتا ہے کہ بوسہ لینے میں کوئی چیز گڑ نہ جائے۔ ہنومان جی کے ایسے دانت پہلن چُما گال کاٹن سَگری رین کیسے کٹی ہے [2]۔

---

1. چیچک سے بھرا ہوا چہرہ
2. پہلے ہی بوسے میں گال کاٹ لیا پوری رات کیسے کٹے گی۔

آپ کی شاعری میں جدت کی چمک دمک ہر جگہ دکھائی دیتی ہے۔ بہت سے اشعار ہیں جو دل کا دامن پکڑ لیتے ہیں۔ مگر میں تو دلی کی اردو کا فدائی ہوں۔ فالج نے دماغ پر وہ گھمسان اٹھا رکھا ہے کہ بات اِدھر دماغ میں آئی اُدھر گئی۔

شور و ہنگامہ فالج کی مسلسل یورش

سب بھلا دیتی ہے اک آن میں ساغر کی کھنک

اس میں ایک قافیہ ہے ''چھان پھٹک'' جو دل پر پتھر کی لکیر ہوگیا ہے۔ اب کمر ٹوٹی جاتی ہے۔ پیٹھ فقرے کس رہی ہے۔ آنکھیں پتھرائی جاتی ہیں۔ ہاتھ لکھنے سے دست بردار ہو رہے ہیں۔ اس لیے بہت سی دعاؤں پر ختم کرتا ہوں۔ اگر پھر پڑھنے کے بعد ہوسکا تو اور لکھوں گا، نہیں تو دعائے مغفرت سے محروم نہ رکھیے گا۔ آپ کا پتہ اوپر کے پلندے پر رگڑ تگڑ میں گھِس گیا۔ تن بہ تقدیر بھیج رہا ہوں۔ اللھم بلغ بالخیر

دعا گو قدیم

محمد علی عفی عنہ

ردولی، اتر پردیش

۱۰ر ستمبر ۱۹۵۸

۱۶۹

ہما بیگم کے نام

ردولی ۱۷/اکتوبر ۱۹۵۸

ہما پیاری! دعا۔

تمھارا گذشتہ خط ایسا آیا تھا کہ اگر امکان ہوتا تو خط کے بجائے خود آتا۔ مزاجی کیفیت ایسی تھی کہ جو چھوٹا سا خط لکھ سکا تھا وہ بڑا سا کام کرگزرا تھا۔ اندھا کیا مانگے؟ دو آنکھیں۔ اسی لیے ہم اللہ میاں سے کیا مانگیں۔ تمھاری تندرستی۔ آج کل اللہ میاں کے دربار میں تو حاضری صرف باضابطہ ہوتی ہے۔ مگر یوں کبھی بے تکلفی کی بات چیت کی نوبت آجاتی ہے۔ ابھی اسی دن میں پڑھ رہا تھا۔ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب۔ میں پڑھنے میں "تطمئن" پر زور دے رہا تھا فرمانے لگے تم کاٹھ کے الو کے الو رہے۔ ارے "بذکر اللہ" پر زور دو۔ بڑا لطف آیا۔ دوسرے دن پھر وہی حالت کہ نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ بڑی دیر تک پڑھا کیے مگر کچھ نہ ہوا۔ یا بھئی ہوا بھی ہو ہم کو خبر نہ ہوئی ہو۔ وہاں خفیہ خیرات بھی تو ہوتی ہے۔

ہما بیگم! تم نے اپنی بیماری کا حال لکھ کر مجھ کو اپنی بیماری سے چھٹی دی ہے۔ موت کا دھڑکا ہر وقت لگا رہتا ہے۔ مگر اس کے بعد تمھاری بیماری یاد کرکے موت کو بھی بھول جاتا ہوں، اور تمھارے لیے دعا کرنے لگتا ہوں۔

تم نے لکھا ہے کہ میرے کچھ خطوط جمع کر رہی ہو۔ طبع ثانی ہم کو دیکھنا نہیں ہے، اس لیے ہم کو کیا پرواہ کہ تم کیا انتظام ہماری زندگیِ دوام کا کر رہی ہو بچوں کی خیریت لکھو۔ سلّو ابھی گئیں یا نہیں؟ ان کا خط بھی دیکھ کر جیسے جسم میں طاقت آگئی۔ میاں نوشاد نے دو ایک خطوط کی نقلیں رکھ لی تھیں مگر ان کا پتہ نہیں۔ ایک خط شان الحق حقی عرف چاند صاحب دہلوی کو کراچی لکھا تھا۔ اس کی نقل نوشاد نے کر لی تھی۔ شاید وہ مل جائے۔ بس بی

بی خدا تم کو اپنی حفاظت میں رکھے! آمین! اور ہم کو بخش دے! آمین! قیصر دعا کہتی ہیں۔ جابر تسلیم عرض کرتے ہیں۔ سعید علی گڑھ میں ہیں، بڑی محبت کا آدمی ہے۔

تمھارا دعا گو تمھارا باپ عفی عنہ

آج اتوار ہے۔ کل دیر ہو گئی تھی۔ ڈاک کا وقت نکل چکا تھا۔ اس لیے یہ خط پڑا رہ گیا۔ رات نیند کم آئی۔ آج آنکھ دیر کو کھلی۔ صبح کے وقت تمھارا خط پھر کھول کر پڑھنا شروع کر دیا۔

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمھارے نام کے

میں نے کہا لاؤ تم سے دو دو باتیں پھر کر لوں۔ باغ تو جنگل ہو چکا، مگر برسات کی وجہ سے سبزی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔ آج کل اس جنگل میں منگل اس وجہ سے ہے کہ ہرسنگھار[1] مہمان آئے ہوئے ہیں۔ ہرسنگھار کے درخت سے بدصورت سال بھر میں کوئی درخت نہیں رہتا۔ مگر مہینہ بھر کے لیے اور ہی ٹھاٹھ ہوتے ہیں۔ جب پھول مہمان آنے والے ہوتے ہیں تو آخر برسات کے جھالے پتی پتی کو نہلاتے ہیں۔ پورا پیڑ ہریالی کی گیتیں گاتا ہے۔ منھ بند کلیاں بکس جاتی ہیں، چپہ چپہ پنکھڑیوں کے پھول، بانکے ترچھے اپنی بہار دکھاتے ہیں۔ پورا محلہ مہک اٹھتا ہے۔ اسی وجہ سے تو جہانگیر بادشاہ (اللہ بخشے) کہا کرتے تھے کہ ہندوستان میں دو بہاریں ہوتی ہیں۔ ایک پھاگن میں اور دوسری ساون میں۔ انگریز لوگ برف کے ملک کے رہنے والے جاڑوں کے ٹھٹھرے ٹھٹھرائے، ون پتوں کے ڈنڈ سے پریشان تو تھے ہی، یہاں ہرسنگھار کے درخت کا نام Ragged Robin رکھا۔ حالانکہ سال میں ایک مہینہ کا لطف سال بھر کی بدصورتی کا کافی کفارہ ہے۔ جیسے ہمارا پونے پانچ برس کا فالج۔ ہمارے 76 برس کی رنگ رلیوں کا کفارہ ہے۔ لاحول ولاقوۃ۔ ہم بھی چاند صاحب کی اردو سے ایسا پھڑک گئے کہ صفحہ کا صفحہ رنگ گئے۔ جانے بھی دو۔ اب کہاں تک لکھیں۔ بچوں کو اور تم کو پھر سے دعا۔

---

[1] بہت خوبصورت اور خوشبودار پھول۔

ارے میری جان خوب یاد آیا۔ ''کشکول محمد علی شاہ فقیر'' کی کوئی پرانی جلد تو تمھارے پاس نہ ہوگی؟ میری بہترین کہانی ''تیسری جنس'' اس میں تھی۔ صدیق بک ڈپو والوں نے شاید بے ایمانی کرکے اس کو پھر سے چھپوا دیا ہے۔ اس میں ''تیسری جنس'' غائب ہے۔ اگر بغیر جلد بندھی ہوئی تمھارے پاس ہو تو اس کو بڑی حفاظت سے رکھنا ورنہ وہ کہانی معدوم ہو جائے گی۔ مجھ کو مطلع کرو۔

دعا گو

سعید مصطفیٰ علی کے نام

ردولی　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　۱۴؍نومبر ۱۹۵۸

مائی ڈیئر سعید۔ میرا بیٹا۔ ناغہ نہ ہوا کریں۔ شکایت کا خط آیا تھا کہ تم ناغہ بہت کرتے ہو۔ مجھے امید ہے کہ اپنی ذمہ داریوں کا تمھیں انداز ہوگیا ہوگا اور کیا لکھوں۔ موت کا انتظار ہر وقت دیکھا کرتا ہوں۔ ''سیاں آون کی بھئی بیریاں درِ جوا ٹھاڑی رہوں'' عظیم جو تمھارے یہاں تھے۔ اب محکمۂ جنگلات میں نوکر ہیں تم کو سلام کہہ رہے ہیں۔

دعا گو

تمھارا باپ عفی عنہ

(غیر مطبوعہ)

---

(۱۷۱)

شاہ آفاق احمد کے نام

۱۲؍فروری ۱۹۵۹

آفاق بیٹا۔ خدا تم کو اِس دنیا کا اور اُس دنیا کا اطمینان بخشے۔ تمھارے پہلے خط کا جواب آنکھوں کے دکھوں نہیں دیا۔ دل اور دماغ بھی اسی طرح کام کر رہے ہیں۔ جیسے صوفیا نے کی نوحہ خواں کمیٹی۔ آنکھ کا اشارہ کچھ کہتا ہے۔ دل اپنے رنگ میں ہے دماغ ہنڈولے پر مزے کر رہا ہے۔ ہاتھ کاشتکاروں کی طرح ہاتھ سے بے ہاتھ ہوگیا ہے۔ بایاں ہاتھ پہلے ہی سے زمیندار ہو چکا ہے۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔ یہ کیا لغو باتیں میں بک رہا ہوں۔ تمھارے والد ماشاء اللہ لکھنؤ سے آگئے ہیں۔ ابھی مجھ سے ملاقات نہیں ہوئی۔ لوگ صحت کی مبارکباد دینے اس قدر آئے ہیں کہ وہ ہر وقت یہاں آنے کا خیال کیا کرتے ہیں مگر پورا نہیں ہوتا۔ احمد، نیلو اور نوری سَلَمہُنَّ شام کو مجھے دیکھنے آئی تھیں۔ میاں مقصود سید نپوری کا نواسہ ہوا ہے۔

قیصر بیگم دن بھر کا کام کیا کرتی ہیں اور مجھ سے تقاضہ کیا کرتی ہیں کہ تم نے آفاق کو خط کا جواب نہیں دیا۔ باقی جگہ سعید اور قیصر کے لیے چھوڑ دی ہے۔

تمھارا دعا گو

عفی عنہ

ڈاک کا وقت کم ہے اس لیے جابر سعید تسلیم عرض کرتے ہیں۔ قیصر دعا کہتی ہیں۔

(غیر مطبوعہ)

شاہ آفاق احمد کے نام

آفاق بیٹا، دعائیں! دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ تمھارا دل میرے دل کا مقیاس الجذبات ہے۔ مگر دل کی آرزو کے ساتھ ساتھ تم کو میری اس خواہش کو بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اگر مقتضائے وقت یہ ہو کہ دو چار دن زیادہ باہر ٹھہرنا چاہیے تو گھر واپس آنے میں جلدی نہ کرنا۔ چھاتی پر پتھر دبانا بعض اوقات ضروری ہوتا ہے۔ تم جانتے ہو کہ میرا دل کس قدر تم سے باتیں کرنے کو چاہتا ہے مگر ایک کارڈ لکھنا بھی جوئے شیر لانا ہوجاتا ہے۔ قیصر پوسٹ کارڈ پکڑے ہیں میں لکھ رہا ہوں۔ کمر الگ فقرے کس رہی ہے گردن الگ نہیں جھکتی۔ دوسروں کے قلم سے لکھ لکھ کر نب کو الگ ٹیڑھی کر دیا ہے۔ ڈاک کا وقت الگ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ ہم بادشاہ کے بھی کہنے سے نہ رکیں گے۔ اب بیٹا تم ہی بتاؤ کہ کیا کروں کل تعریفل مرحومہ چل بسیں۔ تم اندازہ کر سکتے ہو کہ کیا کیا بھیانک تصویریں عذاب خدا اور مراحم خدا کے وعدوں کی (خوبصورت تصویریں) سامنے آرہی ہیں۔ بار الٰہا سب کو معاف کر اور سب کو اپنے سایۂ عاطفت میں جگہ دے آمین رب العالمین۔ تمھارے گھر میں ماشاء اللہ خیریت ہے۔

بس بیٹا، گاجر کے حلوے پر یاد آیا کہ جب کوئی مزے کی چیز پکتی ہے تو تم یاد آتے ہو۔ مگر میں نے منت مانی ہے کہ گاجر کا حلوہ بغیر تمھارے نہ کھاؤں گا اور قیصر نے منت مانی ہے کہ جب اصل خیر سے انشاء اللہ تم آؤ گے تب گاجر کا حلوہ بناؤں گی۔ تمھارا سلام سب کو پہنچا دیا گیا۔ سب کی دعائیں تم کو روانہ ہیں۔

دعا گو

محمد علی عفی عنہ

۱۲رفروری ۱۹۵۹

سعید مصطفیٰ علی کے نام

ردولی

۱۴؍فروری ۱۹۵۹

میرا بیٹا سعید سلمہٗ۔ دعا۔ تمھاری امی تمھارے لیے بڑی ہو رہی ہیں کہ کسی طرح سے میرا بیٹا پڑھ لکھ جائے، دنیا میں کامیاب ہو۔ تمھاری ماں کو اوپر خدا کا آسرا ہے اور نیچے تمھارا۔ بیٹا اس کا خیال ہر وقت رہے کہ تمھاری ماں کو تمھاری طرف سے رنج اور مایوسی نہ ہونے پائے۔ تم خود دل کے اچھے آدمی ہو اس لیے دوسرے کی تکلیف کا تم کو خود ہی خیال رہتا ہوگا۔ جو حضرات مجھ کو جانتے ہیں ان سے میری تسلیم کہنا۔

تمھاری امی کہتی ہیں کہ سعید کے خطوط دیر میں آتے ہیں۔ بیٹا خط جلد جلد لکھا کرو تاکہ تمھاری ماں کا جی ٹھنڈا رہے۔

دعا گو

تمھارا باپ عفی عنہ

(غیر مطبوعہ)

——

سعید مصطفیٰ علی کے نام

مائی ڈیئر سعید۔ دعائیں۔ تمھارے خطوط آتے ہیں اگر کچھ بھی دیر ہوجاتی ہے تو تمھاری ماں بہت بے چین ہوتی ہیں۔ ادھر عرفان اور پھر محمود آئے۔ تمھاری امی کو ایک گونہ اطمینان ہوا۔ پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ کوئی تمھارے کلاس فیلو ہیں جو نوکری چھوڑ کر پھر سے تمھارے درجے میں آئے ہیں اور تم سے سن میں زیادہ ہیں۔ یہ یقیناً اچھے آدمی ہوں گے۔ تم کو ان سے دوستی بھی تھی۔ اب معلوم ہوا ہے کہ کچھ ملال ہوگیا ہے مجھ کو معلوم نہیں ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی اچھے قسم کے آدمی ہوں گے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ تم ان سے صفائی کر لیتے تو اچھا تھا۔ معافی مانگنے سے اپنا غرور کم ہوجاتا ہے اور معاف کرنے میں خدا (کی) قربت نصیب ہوتی ہے یعنی خدا خوش ہوتا ہے اور کیا لکھوں۔ میرے جاننے والوں سے میری تسلیم کہنا۔ جابر دعا کہتے ہیں۔

دعا گو

تمھارا باپ عفی عنہ

۱۷ر فروری ۱۹۵۹

(غیر مطبوعہ)

---

(۱۷۵)

سعید مصطفیٰ علی کے نام

سعید بیٹا۔ دعائیں ہر طرح کی حاضر ہیں۔ میں انگریزی میں لکھ رہا تھا مگر تمھاری امی نے کہا کہ ایسا لکھوں جو وہ بھی پڑھ سکیں۔ بیٹا میرا ناچیز مشورہ اور اس کو وصیت سمجھو۔ قرض سے ایسا بھاگو جیسا جانی دشمن سے بھاگتے ہیں۔ یہ بات گرہ باندھو کہ قرض آدمی کو خود اپنی نظر میں اور دوسروں کی نظر میں ذلیل اور حقیر کر دیتا ہے۔ جب میں ردولی کے اردو اسکول میں پڑھتا تھا تو دو آنے پیسے میں نے ایک مہاجن کے لڑکے سے ادھار لیا تھا...... سات برس کا سن تھا وہ گھڑی اور آج کا دن جب اُناسی برس کا ہوں اس لعنت کے طوق سے گلو خلاصی نہیں ہوئی تھی۔ ایک بڑا نقصان اس سے یہ ہوتا ہے کہ آدمی کا self respect خاک میں مل جاتا ہے۔ بے تکلف احباب سے آدمی قرض لے لیتا ہے مگر اس میں بھی صرف اس وقت self respect باقی رہتا ہے جب کہ صرف کبھی اتفاق سے یہ ہوا اور تب بھی اس وقت ہوتا ہے جب آدمی دوسرے کے مقابلے میں روپئے والا ہو اور آدمی زیادہ دے اور کم لے......

دوسری بات یہ ہے کہ خدا تم کو امتحان میں کامیاب کرے۔ میں بالکل اچھا ہوں۔ اس کارڈ پر پتہ آفاق بھیا نے لکھا تھا اور تمھاری امی خط لکھنے والی تھیں مگر وہ کہیں گھر کے انتظام میں لگی ہوں گی۔ مجھ کو موقع مل گیا۔ میں نے لکھ مارا۔ سب کو دعا سلام۔

راقم

تمھارا باپ عفی عنہ

۱۴/اپریل ۱۹۵۹

(غیر مطبوعہ)

علی ظہیر کے نام

ردولی ضلع بارہ بنکی

۱۸ر ستمبر ۱۹۵۹

مائی ڈیئر علی ظہیر

ایک زمانہ ہوا کہ عزیزی میتب سلمہٗ (شارب) کے لیے میں نے ایک خط لکھا تھا۔ اب کہتا ہوں، چاہے میری آخری خواہش چاہے وصیت نامہ سمجھو۔ اگر مں یہ جان لوں کہ میتب سلمہ کی محنت ٹھکانے لگی اور یہ کسی ایسی جگہ مامور ہوگئے کہ جہاں خدمت خلق ان سے سرانجام ہوئی اور ان کی علمی قابلیت سے دنیا کو کوئی فائدہ پہنچ گیا تو میری پیٹھ قبر میں آرام سے لگے گی۔ کم لکھ سکتا ہوں مفہوم ادا کرنا چاہتا ہوں کہ زمانہ ان کی قدر کرے۔ امید ہے کہ آپ دل و جان سے کوشش کر کے ان کو برسرِ کار کر دیں گے۔

عالیہ سلمہا کو جواباً دعائیں اور بچوں کو بھی یہی۔

نیم جان مغفرت کا طالب

محمد علی عفی عنہ

(غیر مطبوعہ)

آفاق کے نام

میرا بیٹا آفاق سلمہ۔ دعاہائے اشتیاق۔کل والا خط ہم دونوں نے پڑھ کر چاک کر ڈالا۔تم میرے بارے میں جس قدر پریشان ہو اس قدر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

کار اگر دشوار شد خود را بدست غم مدہ
میشود دشوار عالم زود آساں غم مخور

آج پھر ہم پریشان ہیں۔ رات قیصر سوئیں نہیں۔ہم تو خیر کچھ سوئے۔ اللہ سب خیریت رکھے۔تمھارے یہاں بحمد اللہ سب خیریت ہے۔شاہ صاحب کل بعد نماز جمعہ آئے تھے۔مولود شریف بخیر و خوبی ہوگیا۔

جناب مولانا احمد میاں صاحب دام فضلہ کو تسلیمات۔

واضح ہو کہ خط سے پریشانی کا پتہ چلتا ہوگا لہٰذا جلد آؤ مگر بیٹا کام ادھورا نہ چھوڑا جائے۔

دعا گو

محمد علی عفی عنہ

سنیچر ۲۲/اکتوبر ۱۹۵۹، ردولی

(غیر مطبوعہ)

(۱۷۸)

چھبّن کے نام

چھبّن پیاری دعا! تمھارا ایک خط آیا تھا جس میں تم نے لکھا تھا کہ لوگ جیسے تم کو بھول گئے میں نے فوراً جواب لکھا تھا، نہ معلوم پہنچا یا کھو گیا۔ ادھر ہما ایک ہفتے کے لیے آ گئی تھیں۔ یہ دن بڑے اچھے کٹے۔ تم سب لوگ خوب خوب یاد آئے۔ بڑا لطف رہا۔

یاد اطفال تیری عمر دراز   ہم نے جنت میں دن گزارے ہیں

تم لوگ سب بہت اچھی ہو۔

سب کا ہے رنگ جدا جدا   سب کی ہے بو الگ الگ

خدا تم لوگوں کو خوش رکھے۔ ہم جانتے ہیں دعا قبول وبول نہیں ہوتی مگر تب بھی دعا مانگتے ہیں۔ مزہ ضرور آتا ہے اور دعا مانگ کر عبودیت کا اعتراف بھی ہو جاتا ہے۔ اگر غور کرو یہی بڑی اچھی بات ہے۔ سنو چھبن یہ بھی غنیمت ہے اگر پاس ہوتیں تو کسی بات پر تمھارے خلاف کچھ ہو جاتا۔ کسی بات میں اختلاف ہو جاتا اور اس طرح سوائے اچھے اچھے خیالات کے اور دماغ میں کچھ نہیں آتا۔ تم یہاں ہوتیں تو تمھارے چہرہ کی شکنیں، تمھارے ملتے ہوئے دانت دیکھ کر جی میں کہتا اے لو یہ غضب چھبن ہمارے آگے بڈھی ہو گئیں۔ برخلاف اس کے اب تمھاری تصویر جس طرح کی جی چاہتا ہے سامنے لے آتا ہوں۔ الموڑے میں چھبن گول کبدّی دوڑی چلی آتی ہیں۔ ''بوبو، بوبو! ہم سالن کی پتلی میں راکھی جھونک آین''۔ الموڑے والے گھر میں زینہ تھا۔ ایک طرف دیوار دوسری طرف لکڑی کی پٹریاں لگی تھیں۔ ان پٹریوں کے درمیان تم نے اپنا سر ڈال دیا۔ تم چلائیں ہم سب دوڑے۔ تمھارا سر پٹریوں کے درمیان سے کیسے نکلے۔ کوئی کہتا ہے بڑھئی آوے، ایک پٹری نکال ڈالی جائے۔ کوئی کہتا ہے اب کیا ہو؟ تم خود ایسا سہم گئیں کہ سر سیدھا کر کے نکال لیا۔ فکر و پریشانی خوشی سے بدل گئی۔ تم بوبو کی گود میں سمٹ کر بیٹھ گئیں۔ ہم یہ کہتے

ہوئے بڑی حرامزادی ہے۔ جا کر آرام کرسی پر لیٹ گئے پھر کتاب پڑھنے لگے۔ اپنی بوبو مرحومہ کی تصویر دیکھو سہ دری میں پردہ پڑا ہے۔ ہم پلنگ پر لیٹے ہیں۔ تمھاری بوبو چھڑے پہنے ہوئے انگنائی سے سہ دری کی طرف آرہی ہیں۔ چال میں ایک لے نکلتی ہے ہم کو تمھارے دادا مرحوم کا شعر یاد آگیا ۔

چلے وہ تو آفت بپا ہوگئی　　قیامت چھڑوں کی صدا ہوگئی

یکبارگی ایک ایرانی بیچ میں پھاند پڑے۔ شعر سن بشنو ۔

دل کند سجدہ بہ ایں طرز خرامیدن تو
دیدہ صد شکر بجا آوردہ از دیدن تو

بس چھبّن ہم رونے لگے۔ اس لیے خط ختم۔ سبط، بالو[79]، رفی کو دعا، قیصر سب کو دعا کہتی ہیں۔ سعید کی طرف سے سلام

راقم

تمھارا باپ عفی عنہ

---

(۱۷۹)

چھبّن کے نام

پیاری چھبّن! دعا!

ہما کے خط سے معلوم ہوا کہ سبط ماشاء اللہ اچھے ہیں اور بجائے پھیپھڑے کی شکایت کے جگر کی شکایت ہے۔ بخار بھی اتر گیا ہے۔ فالحمد للہ ربِ العالمین! کیا لکھوں بیٹی۔ انسان کی بے بسی، بے اختیاری عبرت کے قابل ہے۔ جب سبط کی بیماری کا خط آیا تو سب سے زیادہ تکلیف اس کی ہوئی کہ کاش میں تمھارے پاس ہوتا۔ پوچھو اگر میں ہوتا بھی تو کیا کرلیتا آخر خدا نے رحم فرمایا۔ اور سبط سنبھل گئے۔ بار الہٰ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ لاکھ لاکھ شکر ہے۔

ادھر دو تین کچو کے ایسے لگے ہیں کہ بہت دن تک نہ بھولیں گے۔ ایک تو سبط کی بیماری۔ دوسرے یہ کہ قیصر نے ہمارے راجندر کی تصویر چوکھٹے میں لگا کر سامنے رکھ دی۔ ایسا شاندار جوان، چہرے پر وہ مردانگی، دل کی صفائی کی وہ جھلک آنکھوں میں، وہ کشادہ سینہ، جی چاہتا ہے کہ بلائیں لے لوں، کس کی بلائیں، اور کس کی جوانی پر خوش ہوں۔ وہ تو خاک میں مل چکا۔ نہال سنگھ کے لڑکوں میں یہ میرے حصے میں پڑا تھا۔ تصویر دیکھ کر اس کا بچپن، اس کی جوانی، اس کے جہاز کا ناچتا ہوا ہوا میں گرنا۔ زمین میں نو فٹ دھنس جانا۔ اس کا ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا۔ سب کچھ نگاہوں میں آگیا۔ اور ہم بے بس بے اختیار اسی طرح بیٹھے یہ خط لکھ رہے ہیں۔ تیسری تکلیف یہ ہوئی کہ ریاض مرحوم کا اسباب کھولا گیا۔ ریاض مرحوم کا بادل ناخواستہ کراچی جانا۔ اُس غریب کی حسرت بھری رخصت۔ اس کی پھر ردولی آنے کی خواہش سب پھر سے سامنے آگئی۔ ہمنے نہ اس کا جنازہ دیکھا نہ اس کی قبر دیکھی۔ مگر اس وقت سب کچھ دیکھ لیا۔ بہت سی کتابیں کیڑے کھا گئے۔ جو چیزیں باقی ہیں ان کو ٹھکانے لگانے کی فکر ہے۔ مگر دیکھو کیا ہو۔

کب لگاتا ہے کوئی اس دل بے حال کا مول
سب گھٹا دیتے ہیں مفلس کے غرض مال کا مول

کل ہما خط سے اس اندھیرے میں روشنی دکھائی دی۔ اللہ کا شکر بھیجا۔ بی بی جے دن زندہ ہیں یہی نشیب و فراز دیکھنا ہیں۔ اسی کو زندگی کہتے ہیں اور باوجود ان ٹھوکروں کے اور پھر خدا کی عنایات کے دل میں آتا ہے کہ مرجائیں تو ان غموں سے ان خوشیوں سے چھٹی ملے مگر دل کہتا ہے کہ اگر یہی بے حیائی کی زندگی چلی جائے تو اچھا ہے۔ لَا حَول وَ لاقوۃ الا باللہ۔

سبط میری انھی باتوں پر اعتراض کیا کرتے ہیں کہ ''کیا مایوسی کی باتیں کیا کرتے ہو؟'' تہیہ ارادہ ہوتا تو ایک بات بھی تھی۔ کہاں سے لاؤں امید اور کہاں سے لاؤں تہیہ اور ارادہ۔ علاقہ جا رہا ہے۔ غریبی کھڑی گھور رہی ہے۔ بھائی نظیر حسین کی مفلسی یاد ہے۔ ان کے گھر کا کھنڈر نگاہ کے آگے ہے۔ خود اپنے گھر کے کھنڈر کا نقشہ جو اسی کھنڈر سے مقابلہ کرنے پر تُلا ہے دماغ کے اندر ہو بہو موجود ہے۔ جُبن، چھبَن، ہما، سلمان کی سینکڑوں تصویریں، پیدا ہونے سے لے کر آج تک خوشی کی، غم کی، بیماری کی۔ تندرستی کی، بھولے پن کی، ہشیاری کی، ہنسی کی، رونے کی، اُن کو چھاتی سے لگانے کی، ان پر غصہ کرنے کی۔ اپنی بڑھیا کے روحانی اثر کی کہ جو آج تک گھر پر چھایا ہے۔ قیصر کی جو ماشاء اللہ آج تک گھر بھر پر چھائی بچھائی ہیں۔ جابر جن کے دل کا حال وہی جانتے ہیں مگر ان کی بے اختیاریاں ہم ہی جانتے ہیں۔ سعید کی جو صرف گورکن ہیں یہ سب کچھ نگاہ کے آگے ہیں۔ اور یہاں سبط ہیں کہ آرام کرسی پر پاؤں پھیلائے لیٹے ہیں اور کہہ رہے ہیں۔

''ماموں ہنسی خوشی کی باتیں کرو۔ یہ کیا غم کی داستان لے کر بیٹھے ہو۔'' ہمارے آگے تو سنیما کی یہ ریل اڑسٹھ برس چھ مہینوں سے برابر چلی جا رہی ہے شیطان کی آنت ہوگئی ہے اور میاں سبط اپنی اڑائے جاتے ہیں۔

اہلِ تدبیر کی واماندگیاں
آبلے پر بھی حنا باندھتے ہیں

قیصر، بدرل، آفاق سب تم کو دعا و سلام کہتے ہیں۔ سبط کی تندرستی پر مبارک باد دیتے ہیں اور بالکل اچھے ہو جانے کی دعا دیتے ہیں۔ بدرل کی لڑکی عذرا کو اگر موقع ہو تو کاظم سے کہو موٹر بھیج کر بلا بھیجیں تم لوگ اس کو دیکھ لوگے تو مجھ کو معلوم ہوگا جیسے میں نے بھی دیکھ لیا۔

دعا گو، تمھارا باپ عفی عنہ

گجّن کے نام

پیاری گجن! دعا! ہزار چاہتا ہوں کہ خط ایسے لکھا کروں جس کو پڑھ کر ہنسی آوے۔ ذری دل خوش ہو مگر نہ معلوم کیا ہے جب تم لوگوں کو خط لکھنے بیٹھتا ہوں تو دل رندھ جاتا ہے۔ اب چھبن چلی گئیں۔ تم کو خط لکھتے وقت یہ بلت کیسے بھول جاؤں۔ یہ بات نہیں کہ کسی وقت ہنسی نہیں آتی۔ خوب ہنستا ہوں، باتیں کرتا ہوں، فکر بھی رہتی ہے، پریشان بھی رہتا ہوں مگر ہنس بھی لیتا ہوں روپے پیسے، اختیار، آسانیوں کی کمی کی وجہ سے پریشان ہوکر بنارس میں حفاظت حسین اور رضیہ کو خط لکھا کہ بہت دنوں سے وعدہ کرتا ہوں اگر اب تم لوگوں کو فرصت ہوتو آؤں۔ ان کو میں نے لکھا تھا کہ خود میرے موتی تمام دنیا میں بکھرے پڑے ہیں اس لیے میں دوسروں کے موتیں کا منھ دیکھتا ہوں۔ ان لوگوں نے بلا بھیجا۔ تین دن جیسے جنت میں کٹے۔ رضیہ میاں بی بی نے تکلف نہیں برتا، مگر میری تکلیف کا خیال ایسا رکھا کہ جی خوش ہوگیا۔ مولانا اور ان کی بی بی نے خاطر کی انتہا کردی۔ سبط کے دوست غفار جن کو شاید تم جانتی ہو ماموں ماموں کہہ کر خلوص سے ملے۔ سبط سے کہہ دینا غفار نے دوسری شادی کی ہے۔ بی بی ان کی گریجویٹ ہے۔ ان کی لڑکیاں ثریا، سلمیٰ ہی ایسی معلوم ہوتی ہے۔ ابھی ایک لڑکی ہوئی ہے۔ داس گپتا کو دکھانے گیا۔ اس نے فیس کسی طرح نہیں لی۔ تمھارے ہی خیال سے حفاظت نے میری خاطر سے دو چار شاعر جمع کر لیے تھے۔ بڑے لطف کی صحبتیں رہیں۔ اسی جلسے میں اتفاق سے دو تین آدمی فوج کے آگئے۔ کرنل کا نام پالا جانی تھا۔ سندھی ہیں وہ میری باتوں پر اتنا ہنسے۔ اس قدر رعب میرا ان پر بیٹھ گیا کہ دوسرے دن میس میں دعوت دی۔ کچھ اتفاق ایسا کہ وہاں مجھ سے زیادہ باتیں ہی کرتے نہ بن پڑی۔ بیچارے کا ڈنر ہی بیکار گیا۔ وہاں بھانپ بھانت کا آدمی پنجابی، سندھی، جاٹ، سکھ، بھلا وہ ہماری باتیں کیا سمجھتے۔ اور ہم کیا کہتے۔ انگریزی میں کچھ باتیں

کہیں اور بس۔ شاہد بھائی مرحوم کے گھر سے تم بھی واقف ہو اور ہم تو تین پشتوں سے خوب جانتے ہیں۔ رضیہ کی ایسی لڑکی کہیں دکھائی نہ دے گی۔ چاہے یہ خود اس کی نیکی ہو چاہے حفاظت حسین کا اثر پڑا ہو مگر ہیں دونوں کے دونوں خوب۔ اس کے اوپر یاد پڑا کہ آفاق سید نپور والوں کی بہت برائی کرتے ہیں۔ کسی نے ان کی بی بی کی تعریف کی۔ وہ جھنجھلا کر کہنے لگے، ہماری تعریف نہیں کرتے ہو کہ ہماری صحبت میں ایسی ہوگئیں۔ میاں بی بی میں جس کی شخصیت بڑی ہوتی ہے واقعی اس کا اثر دوسرا فریق قبول کر لیتا ہے۔ اب دیکھو قیصر کی صحبت میں ہم کیسے اچھے ہوگئے ہیں نہ غصہ نہ غضب، نہ لڑائی، نہ بھڑائی، ہنستا پھول بکستی کلی۔ اب بھی نہ مانو گی کہ صحبت کا اثر نہیں ہوتا ہے۔ فقط

محمد علی عفی عنہ

چودھری صاحب ''...... الٰہیات سے کوک شاستر تک ہر موضوع پر بے تکان گفتگو کر سکتے تھے۔ یوں تو یونانی فلاسفہ سے قرون وسطیٰ کے نابغوں اور یورپی نشاۃ ثانیہ کے عظیم دماغوں اور شوپن ہار، نیٹشے، ہیگل، مارکس سے جارج سنتانیا اور برٹرینڈ رسل تک سب ہی پر ان کی عالمانہ نظر تھی لیکن فرائیڈ، ژونگ، ہولک ایلس وغیرہ پر سند تھے۔ شعر و ادب کے علاوہ موسیقی کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے اور اودھ کی لوک شاعری اور لوک سنگیت کے دلدادہ تھے۔ باغ بانی سے شغف تھا اور سماجی کاموں سے دل چسپی تھی...''

(خلیق ابراہم خلیق: ''منزلیں گرد کے مانند... '' صفحات 128-127)

(۱۸۱)

ہما بیگم کے نام

ہما پیاری، دعائیں قبول کرو۔ میری دعائیں بے اثر ہیں۔ مگر پھر کیا کروں جو کچھ ہے وہ حاضر ہے۔ سنو ایک کہانی سنو۔ رودولی میں ایک محلہ ہے، ملک زادہ۔ وہاں ایک بوڑھے آدمی رہتے ہیں۔ ان کا بھی نام ہے محمد علی۔ ان کے باپ پانچ چھ روپے مہینہ کے نوکر تھے۔ ان کے مرنے کے بعد یہ لڑکا جو میرا ہم سن تھا رنگون بھاگ گیا وہاں کہیں اردو پڑھانے کے لیے نوکر ہوگیا۔ رفتہ رفتہ ایک مدرسے میں مدرس ہوگیا۔ دولڑکے پیدا ہوئے، جوان ہوئے ایک نے ایل ایل بی تک پڑھ لیا۔ دوسرا سنیما میں پہلے نوکر ہوا پھر حصہ دار بن گیا۔ باپ نے دو تین مکان خریدے۔ دولت جمع کی۔ یکبارگی جاپانی یلغار ہوئی۔ سب چھوڑ چھاڑ کر رودولی واپس آگئے تھے۔ تنہا، اٹھارہ بیس برس کا سن رہا ہوگا وہاں سے لوٹے سَن سفید۔ آخری امتحان بڑے لڑکے کا باقی تھا وہ یہاں پاس کیا۔ محمد علی استقلال سے زندگی بسر کرتے رہے۔ مجھ سے کہا یہاں سے خالی ہاتھ بے یار و مددگار گئے تھے وہاں اتنا کمایا کہ اطمینان ہوگیا۔ وہ سب لٹ گیا۔ مگر میری ہمت کم نہ ہوئی۔ اگر خدا نے چاہا تو پھر کمالوں گا۔ پہلے تو اکیلا تھا اب تو تین تین ہوگئے۔ اتنے میں بڑا لڑکا جو وکیل ہوگیا تھا وہ چار پانچ دن میں مرگیا۔ اسی کی وجہ سے میں نے ان لوگوں کو جانا تھا ورنہ رودولی میں بہت سے جاہل رہتے ہیں۔ میرے اور محمد علی کے کون ہم مذاقی تھی جو میں ان کو دوست بناتا۔ یہ خبر سن کر میں بڑے میاں کے پاس گیا۔ شیعہ ہوتا تو رو دھو کر غم غلط کرلیتا یا کم کرلیتا۔ وہ بیچارہ سنّی آدمی زیادہ رونا دھونا جانتا نہیں تھا۔ میں نے تسلی تشفی سے تعزیت کی۔ وہ سنا کیا اور چہرے سے مشکوری ظاہر کیا کیا۔ اتنے میں میرے منھ سے نکلا میاں محمد علی خاں خدا جس پر مہربان ہوتا ہے اس کو امتحان میں ڈال دیتا ہے۔ میرا یہ کہنا تھا کہ وہ کانپنے لگا 'اری میں اور امتحان؟ میں کب اس قابل تھا کہ میرا پروردگار میرا امتحان لے۔ اری میرے مالک، تیرا ہزار ہزار شکر ہے اپنے گندے بندے کو تونے امتحان سے نوازا۔ نہیں

چودھری صاحب امتحان کیا لیا ہوگا۔ امتحان ہمارے ایسے نجس بندوں کا کیا لینا میرے مولا! کہاں تک تیرا شکر ادا کروں۔ امتحان اور میں۔ میں اور امتحان!''

ہما پیاری یہاں بھی کہیں وہی امتحان کے عنایات، مراحم، نوازشیں، کرم فرمائیاں تو نہیں ہیں؟ اگر ایسا ہے تو اس گنہ گار کی مبارک باد قبول کرو۔ میرا بھی خیال رکھنا۔

بوقت مرحمت اے ساکنان صدر جلال
ز روئے حافظ و آں آستانہ یاد آرید

میں نے صرف ایک شعر لکھا ہے تم پوری غزل پڑھ لینا۔

ہما! میں بالکل اچھا ہوں، اگر حیاتِ مستعار باقی ہے تو ابھی اگر نہ مروں تو تعجب نہیں۔

راقم تمھارا فدائی

تمھارا باپ

''آزادیٔ نسواں کے زبردست حامی۔ آج سے (ستر اسی سال پہلے اپنی لڑکیوں کو اپنے گرو جج کرامت حسین مرحوم کے قائم کیے ہوئے اسکول میں انگریزی تعلیم دلوائی۔ چوں کہ زندگی بھر مشغلہ لٹریچر رہا لہٰذا نظریاتی طور پر عورت بھی آرٹ اور لٹریچر کے زمرے میں آگئی۔ ان کا کہنا ہے کہ ''عورت بدصورت ہو ہی نہیں سکتی۔''

(قرۃ العین حیدر۔ سوغات 9 بنگلور)

ہما بیگم کے نام

ہما بیگم، دعا! تمھارا ہمیشہ کا ایسا بڑا عمدہ خط آیا تھا۔ جواب آج دے رہا ہوں۔ زندہ ہوں اور چلا جاتا ہوں۔ دل چاہتا ہے کہ لوگ مجھ کو برابر خطوط لکھا کریں اور میں آج کل قلم بھی نہ اٹھاؤں۔ دنیا کیا خودغرض واقع ہوئی ہے۔ میرے خیال میں جس قدر محبت ہم لوگ ایک دوسرے سے ظاہر کیا کرتے ہیں اس میں بہت مبالغہ ہے۔

چناں قحط سالے شد اندر دمشق
کہ یاراں فراموش کردند عشق

کی حقانیت اس وقت ہویدا ہوئی۔ اب ہماری خودغرضی سنو۔ ''رجنی'' بابو بنکم چندر چٹرجی کا ناول ہے۔ تم نے بچپن میں شاید پڑھا ہو۔ اس میں ایک عورت ہے بھومرا۔ اس پر بڑے مصائب پڑے ہیں۔ ان مصائب میں اس کو اپنا بچہ یاد آگیا جو گیارہ برس ہوئے دو چار دن کا ہوکر مرگیا تھا۔ اسی طرح مجھ کو سلمان کی بے اعتنائی یاد آتی ہے ؎

گر نہ جیتے جی مرے کام آئے گی
کیا یہ دنیا عاقبت بخشائے گی

خیر جی ہوگا تم اپنا حال لکھو۔ بہت سے خطوط جو میں نے لوگوں کو لکھے تھے۔ بعض کی نقل کیے ختم ہوگئے۔ وہ خطوط تم کو عنقریب انشاء اللہ تعالیٰ بھیجوں گا۔ آج کل ہم کو خط بھیجنا جنت کا پروانۂ راہداری حاصل کرنا ہے۔ کیونکہ سوا احباب کا خط پڑھتے وقت اور خوشی مفقود ہے۔

دعا گو
محمد علی عفی عنہ

---

(۱۸۳)

ہما بیگم کے نام

ہما پیاری! دعا! نہ تمھاری خیریت مجھ کو معلوم نہ میری تم کو مگر اس سے کچھ زیادہ ہرج نہیں۔ اگر خیریت یا بے خیریتی معلوم بھی ہوجائے تو تم یا ہم کر ہی کیا لیتے، دعا کرنا، وہ تو یوں ہی کیا کرتے ہیں۔ قبول کرنا یا نہ قبول کرنا دوسروں کے ہاتھ میں ہے اور اللہ تعالیٰ نے کہہ دیا ہے کہ لاتبدیل لخلق للہ۔ مگر دعا کرنے میں ہرج ہی کیا ہے کچھ اپنی گرہ سے تو جاتا نہیں۔ کچھ نہیں تو ہماری عبودیت ہی کچھ سنبھل جاتی ہوگی۔

اب اگر ہرج نہ ہو تو مجھ کو ایک خط لکھ دو۔ اس خط میں جس قدر اپنا حال لکھو گی اسی کو غنیمت جانوں گا۔

ادائے حق محبت عنایت است ز دوست
وگرنہ خاطر عاشق بہیچ خورسند است

اچھا سنو! یہاں چھبن کے یہاں انفلوئنزا گھس بیٹھ کر پہنچ گیا ہے۔ چھبن کو ہے۔ غریب محمد پڑا ہے، سنا ہے کاظم کو بھی بڑا سخت ہوا ہے۔ گجن کو سنا اس وقت تک بچی ہوئی ہے۔ میں خود لیٹ گیا تھا۔ میں نے عادت کے موافق بڑی ہائے ویلا مچائی۔ لوٹ پوٹ کر اچھا ہو رہا ہوں۔

ضیق الید اشد من ضیق القلب۔ روپے کا توڑا ہمیشہ سے تھا، اب کانگریس گورنمنٹ کی دشمنی سے دولت کے پر لگ گئے ہیں۔ چیونٹیوں کے پر نکل آئے ہیں۔ یہ چیونٹیوں کی موت کی دلیل ہوتی ہے۔ یہی حال زمینداروں کے حال کا ہو رہا ہے۔ پنجاب میں جو دھمال بج رہی ہے تم کو بھی معلوم ہے۔ ہم بیٹھے بیٹھے سوچ رہے ہیں جو دن ان پر بیت گیو وہ دن ہم پر آوت ہے۔ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ ہندو غریب حکومت کا ترسا۔ نئی دولت اس سے دھرتے اٹھاتے نہیں بنتا۔ ہندو یہاں حکومت کریں گے جہاں ان کی کثرت

ہے۔ سرحد پر حکومت کریں گے جہاں ان کی قلت ہے۔ پنجاب میں ہندو اور سکھ مل کر ڈیماکریسی کو تہہ کر کے صندوق میں بند کردیں گے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہوگا۔ لو چھٹن خود ہی آگئیں۔ بے چاری زکام کی وجہ سے کہتی ہیں کہ پلک سے پلک نہیں لگی۔ محمد [80] بھی آگئے۔ بالو بھی آگئیں، محمد بے چارہ بخار میں چرمر ہوگیا۔ اب بخار نے چھوڑ دیا ہے۔ بالو اچھی ہیں۔

ممن [80] تو سوکھ ساکھ کے اچور ہوگیا
بالو کا چہرہ مثل گل درد تھا سو ہے

عابد، ان کے بچوں اور ان کی بی بی کو میری بہت بہت دعا کہنا۔ اگر عابد کہیں ہم کو الگ خط کیوں نہیں لکھا تو ان کی زبردستی ہے۔ حصول خیریت اصل چیز ہے وہ حاصل ہے۔ پھر عابد ایسی بے تکی بات کیسے کہہ سکتے ہیں۔ عابد عابد ہیں۔ اگر ان کی جگہ صادق [81] ہوتیں تو وہ کہہ سکتی تھیں۔ عابد ماشاء اللہ دل اور دماغ کے نیک آدمی لڈو کی طرح زبردستی تھوڑی کریں گے۔

راقم تمہارا عاشق

تمہارا خادم تمہارا والد

ہما بیگم کے نام

میری پیاری ہما! دعائیں قبول کرو۔ جب سے چھبن آئی ہیں ہم باوجود بیماری کے خوش ہیں۔ الحمدلله رب العالمین۔ اس خوشی میں اکثر یہ بھی جی کہتا ہے کہ ہما ہوتیں۔ روز خط لکھنے کو دل چاہتا ہے۔ مگر لکھا نہیں جاتا ہے۔ آج اللہ کر کے لکھنا شروع کر دیا۔ اللھم تمم بالخیر۔ اب چھبن کو کچھ توسیع مل گئی ہے۔ ۱۱رجنوری تک وہ رہ سکتی ہیں۔ مگر اتنے دن ان کو ان کے بچوں سے کون دور رکھ سکتا ہے۔ حالانکہ آخر عمر میں دل یہی چاہتا ہے۔ ہاں البتہ اگر کسی طرح تم بھی آجاؤ تو اور بات ہے۔ ذرا بیٹی غور کرو کہ یہ ممکن تو نہیں ہے میں تم کو پریشان کرنا نہیں چاہتا ہوں۔ مگر بیٹی سن کی زیادتی، بیماریوں کی بھرمار (کوئی بڑی بیماری سوا فالج کے نہیں) آخر کچھ حکم رکھتی ہیں۔

دعا گو

تمھارا باپ

ہما بیگم کے نام

ہما! نہ ہماری قبر میں تم چراغ جلاؤ گی نہ تمھاری قبر میں ہم۔ یہی دنیا کی ظاہرداری ہے جس سے دنیا کا کھیل چلا جاتا ہے۔ خط سے زیادہ فائدہ نہیں ہوتا کیونکہ لوگوں کی تندرستی اور زندگی خط پر موقوف نہیں۔ مگر خط پڑھ کر نصف الملاقات کا مزا آجاتا ہے۔ نہ میرے پاس روپیہ ہے نہ ہمت کہ تم لوگوں کو آکر دیکھ جاؤں۔ عشرۂ قاتلہ آدھے سے زیادہ پار کر چکا ہوں۔ نہ معلوم تم لوگوں کو پھر دیکھوں یا بقول پنجابن مرحومہ کے ''بل دے آنکھی کاڑھ دوں اور مکھر دے پر ان نکس جائے۔'' پھر کوئی پوری بات لکھی نہیں جا سکتی۔ صرف خیریت کا پوسٹ کارڈ لکھا جا سکتا ہے۔ اگر لوگ وہ بھی نہیں لکھ سکتے تو جانے دو۔ خدا تم کو خوش رکھے۔ جس میں تم خوش اس میں ہم بھی خوش ہیں۔ بی بی تمھاری کتاب کا کیا حال ہے۔ مفصل لکھو۔ میرے مسودے کی کیا حالت ہے۔ یاد احباب میں شاید کچھ اور اضافہ کرسکوں۔ مگر خدا کرے مسودہ بخیریت مجھ تک واپس آجائے۔ اگر کرنل سلامت اللہ سے ملاقات ہو تو میرا سلام گھر بھر کو پہنچانا۔ یہاں سب اچھے ہیں اور تم کو دعا اور تسلیم کہتے ہیں۔ بے چاری چھبن صبر شکر کیے پڑی ہے۔ منھ سے کچھ نہیں کہتی۔ دل میں جو آرزوئیں ہوں اور کیا عرض کروں۔ بچوں کو دعا۔

دعا گو

محمد علی عفی عنہ

---

(۱۸۶)

ہما بیگم کے نام

میری جان دعا! ہم سے تم سے ملاقات ہو کہ نہ ہو مگر ہمارے تمھارے خطوط تو اکثر راستے میں آتے جاتے مل لیتے ہیں۔ چنانچہ گزشتہ بار بھی شاید یہی ہوا ہو جس دن میں نے تم کو خط لکھا اس کے دوسرے دن تمھارا خط آ گیا۔ اسی وجہ سے تمھارے آخری خط کا جواب دیر سے دے رہا ہوں۔ تمھارے خط سے اور شاید گجن یا چھبن کے خط سے معلوم ہوا کہ میاں سلمان نے کسی غُنّے میں آ کر رودولی کا خیال کیا ہے۔ حالانکہ دوا کی دوری کی وجہ سے ہجر کی بیماری نے مزمن صورت اختیار کر لی ہے اور اگر نہ بھی آئیں تو حارہٗ بیماری کی ایسی بے چینی نہیں ہے پھر بھی غالب کا شعر دماغ میں اکثر گھوما کرتا ہے ؎

کہتے تو ہو تم سب کہ بتِ غالیہ مو آئے
اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وہ آئے

۱۶ مئی:

یہ خط کل شروع کیا تھا۔ اُس وقت دماغ میں نہ معلوم کیا خیالات آ رہے تھے۔ آج دوسری صبح دوسرے خیالات۔ ۲۲ مئی کو پھر لکھتا ہوں۔ گرمی کی وجہ سے قلموں میں روشنائی خشک ہو ہو جاتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ کچھ واقعہ اور کچھ شاعری۔ جب تک غم نویسی نہ کرو اور اس میں مذاق کی چاشنی نہ ملاتے جاؤ عبارت کی دلہن خوب سنورتی نہیں۔ اور تم ٹھہریں شیخ سعدی کی شاگرد۔ نصیحت شروع کر دیتی ہو اور توکل کا سبق پڑھانے لگتی ہو۔ توکل جیسے حکیم صاحب کا نسخۂ جلاب کا بڑا سا قدحہ، گو جانتے ہیں کہ فائدہ کرے گا۔ تیماردار بھی کہتے کہ اللہ شافی۔ بسم اللہ کافی، آنکھیں بھینچ کر ناک بند کر کے پی جاؤ، املتاس بہت فائدہ کرتا ہے، ہم بھی جانتے ہیں کہ پینا ہی پڑے گا مگر پھر بھی طبیعت بھاگتی رہتی ہے اور یہی حال آپ کے توکل کا ہے اور یہاں دل یہ چاہتا ہے کہ تیمارداری میں وہی

انہماک رہے مگر دوا اگر گریمالٹ شربت نہ ہو تو دواء المسک ہی سہی۔ یہ توکل کی آن تو نہیں ہوسکتی۔

ادھر میں نے دو تین خطوط لکھے جو اچھے خاصے تھے۔ ایک عسکری صاحب کو حیدرآباد لکھا تھا۔ اس کی نقل تو رکھ لی ہے مگر کچھ فرق نقل کرنے میں رہ گیا ہے۔ ایک خط میجر ابوجعفر صاحب کو لکھا۔ یہ اسحٰق علی مرزا کے سمدھی ہیں۔ بڑے پڑھے لکھے۔ بڑے عمدہ لکھنے والے، بڑے لاجواب مقرر، شائستہ، نرمی سے باتیں کرنے والے، مذاق کی چاشنی کے مزے سے واقف۔ قصہ مختصر بہت سے صفات سے متصف۔ اپنے خیال میں وسیع النظر شیعہ ہیں۔ ''میرا مذہب'' کو نہیں پسند کیا اور بدرل کو لکھا کہ چودھری صاحب پکے شیعہ ہیں اور تقیہ کرتے ہیں۔ اپنے فطری تقاضے سے جو بات ناگوار بھی ہوئی اس کو نرمی سے کہہ گئے۔ ایک ہمارے نئے دوست پیدا ہوئے ہیں ان کا نام ولایت حسین ہے۔ نوجوان آدمی ہیں۔ بی اے ہیں۔ سوسوا سو کے نوکر ہیں۔ ہمارے اوپر عاشق ہوگئے ہیں۔ باپ نے دوسری شادی کرلی اور پاکستان چلے گئے۔ یہاں صرف ایک چچا ہیں وہ کچھ خفیف سی جائداد کی وجہ سے ان کے خلاف ہیں۔ بے چارہ اپنے کو اسی طرح بے یار و مددگار پاتا ہے جیسے کوئی جہاز ہو اور بیچ سمندر میں اس کا قطب نما ٹوٹ گیا ہو۔ شادی کرنا چاہتا ہے۔ مگر نہ معلوم کیا ڈھونڈتا ہے کہ کہیں نہیں پاتا۔ ناتجربہ کاری میں بے عیب ساتھی کا متلاشی ہے۔ میں اس سے کہنے والا ہوں کہ بیٹا تم کو اگر بے عیب ذات کی تلاش ہے تو اللہ میاں سے نسبت کرلو۔ اپنے کو ایسا بے یار و مددگار پاتا ہے کہ ایک دوست کے یہاں رہتا ہے اور وطن میں مسافرت کا مزا چکھتا ہے۔

ہماری کتابوں پر ''نگار'' نے جو کچھ لکھا ہے وہ مجھ کو بہت پسند آیا۔ تمھارے لیے نقل کرکے بھیجتا ہوں۔ میری جان! لکھنے کو کہو تو تم کو عمر بھر خط لکھا کروں۔ اور پھر بھی بہت کچھ لکھنے کو رہ جائے۔ مگر گرمیوں سے حواس باختہ ہیں۔ آرام کی عادت ڈال لی ہے۔ بقول تمھارے یہ سب مصیبتیں خودساختہ ہیں۔ بس اللہ اللہ خیر سلّا!

''میرا مذہب'' اس کتاب میں چودھری محمد علی صاحب رئیس ردولی نے اپنے مذہب نہیں بلکہ اپنے مشرب کو پیش کیا ہے اور یہ مشرب وہی ہے جس کو بیدلؔ نے اس طرح ذکر

کیا ہے:

مشرب پروانہ از آتش نداند طور را

چودھری صاحب مذہبا اثناعشری جماعت سے تعلق رکھتے ہیں لیکن چونکہ وہ دنیا کے ہر تعلق کو انسانی و اخلاقی نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں اس لیے ان کا مذہب بھی دراصل انسانیت پر مبنی ہے جس کا دوسرا نام میری اصطلاح میں لامذہبیت ہے۔

چودھری صاحب کا انداز تحریر سب سے انوکھا ہے۔ وہ لکھتے نہیں بات کرتے ہیں اور جس نے انھیں بات کرتے سنا ہے وہی سمجھ سکتا ہے کہ منھ سے پھول جھڑنا کسے کہتے ہیں۔ چودھری صاحب نے اس کتاب میں تبرّا، تاسی، عزاداری، متعہ سب ہی مسائل پر اظہار خیال کیا ہے اور اتنے حقیقت افروز انداز میں کہ سنّی اسے پڑھ کر شیعہ ہوسکتا ہے اور شیعہ سنی۔ اس کتاب کے مطالعے کے بعد میں دیر تک سوچا کیا کہ اگر ہر شیعہ محمد علی ہو جائے اور ہر سنی نیاز فتحپوری تو کیا ہو؟ شاید کہ دنیا بے دین اور رہنے کے قابل......''

''کشکول'' یہ کتاب بھی چودھری محمد علی صاحب رئیس رودولی کی 35 متحضرات کا مجموعہ ہے جس میں اکثر ملک کے مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس کتاب کا نام فاضل مصنف نے اپنے موجودہ رجحانات تصوف کی بنا پر کشکول رکھا ہے اور خوب ہے۔ لیکن غالبًا ملفوظات محمد علی شاہ زیادہ موزوں نام ہوتا کیونکہ جیسا کہ ابھی عرض کر چکا ہوں وہ لکھتے نہیں بلکہ بات کرتے ہیں اور ان کی ہر بات پر غالب کا یہ شعر سامنے آجاتا ہے ؎

بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

چودھری صاحب بڑے وسیع المطالعہ انسان ہیں اور مشرق و مغرب کی شاید ہی کوئی قابلِ ذکر کتاب ہو جو ان کی نگاہ سے نہ گزر چکی ہو۔ پھر لطف یہ کہ جو کچھ انھوں نے پڑھا ہے وہ آج بھی متحضر ہے۔ ان کی ہر بات نفسیات، فلسفہ، ادب، معاشرت، لطف زبان اور لطفِ مزاح کا ایسا لطیف مجموعہ ہوتی ہے کہ انسان اس سے مسحور ہو جاتا ہے۔ چودھری صاحب شمالی ہند کے اس کلچر کا نمونہ ہیں جس کو دیکھنے کو آج آنکھیں ترستی ہیں۔ وہ

نوجوان، بچوں اور بوڑھوں میں ہر جگہ اپنی جگہ پیدا کر لیتے ہیں اور ہر شخص متمنی رہتا ہے کہ وہ کچھ کہیں اور ہم سنیں۔ پھر ان کی گفتگو فضول وقت گزاری نہیں ہوتی، بلکہ وہ اس میں ایسے ایسے نفسیاتی اور ادبی نکتے بیان کر جاتے ہیں کہ سن کر لطف آجاتا ہے۔ یہ کتاب ایسے ہی نوادر سے لبریز ہے۔ ابتدا میں صلاح الدین احمد صاحب نے اپنے مقدمے میں نہایت قابلیت کے ساتھ چودھری صاحب کی ادبی خصوصیات پر نظر ڈالی ہے جو بجائے خود ایک بڑا اچھا انتقادی شاہکار ہے۔''

نیاز فتح پوری نہایت بے پیرے ہیں۔ یہ کسی کی رعایت مروت پاس نہیں آنے دیتے۔ بی بی میں مغرور ہو گیا آج نماز کے بعد میرے لیے استغفار نہ بھول جانا۔ اگر تم بھی کچھ افتخار کر بیٹھی ہو تو اپنے لیے بھی توبہ کر لینا۔ ہم نماز کے بعد پہلے ہی سے دعائیں مانگتے ہیں کہ بار الہا غرور، اوچھاپن، انانیت دور کر دے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ قبول دبول نہیں ہوئی۔ آئندہ خط میں اگر موقع ہوا تو پوری دعا لکھوں گا جو میں اللہ میاں سے مانگا کرتا ہوں۔ مگر ابھی تو بن سکھاری ہنڈی ہی معلوم ہوتی ہے۔ ''میرا مذہب'' کی تعریفیں اور مذمتیں ہوئی ہیں۔ کبھی موقع ہوگا تو وہ بھی سن لوگی۔ انشاء اللہ تعالیٰ!

میری جان! اب تم لوگوں کو دیکھنے کو دل بہت چاہتا ہے۔

بہت دن بیتے سیاں کو دیکھے!

دعا گو

محمد علی عفی عنہ

ہما بیگم کے نام

میری جان دعا! تمھارا بڑا دلچسپ خط آیا۔ کل شام کو ملا تھا۔ آج 17 صبح کو جواب لکھنا شروع کیا ہے۔ دیکھیے کے دن میں ختم ہوتا ہے زمانے کی لکدکوب نے حواس مختل کردیے ہیں۔ ہر وقت کے نئے نئے کچوکوں نے ہوش اڑا دیے ہیں۔ عمر کے تقاضے کو موقع مل گیا کہ ایسے میں یلغار بول دو۔ مرے کو ماریں شاہ مدار۔ ہم سٹھیا کر رہ گئے ہیں۔ نہ معلوم کس وجہ سے۔ جب تم کو خط لکھتا ہوں اس وقت تو عقل کچھ کام بھی کرتی ہے اور کوئی کام کرنا چاہتا ہوں تو حواس دماغ سے نکل کر الگ جا بیٹھتے ہیں اور ہماری بے بسی کو تاسف کی مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا کرتے ہیں۔ مولانا نے کہا ہے ؎

جانور فربہ شود از خورد و نوش　　　آدمی فربہ شود از راہِ گوش

تم نے میری پیشین گوئیوں کی تعریف کی۔ ہم پھول کے کپا ہوگئے۔ اسی طرح کا ایک واقعہ یہاں بھی ہوا۔ ۱۹۴۵-۴۶ میں کچھ لکھا تھا جو چھپا بھی تھا۔ ۱۹۵۰ میں ایک کتاب نکلی ہے۔ Autobiography of an unknown Indian بڑے معرکہ کی کتاب ہے۔ اس نے بھی دو ایک باتیں وہی لکھی ہیں جو میں کہہ چکا تھا۔ یہ کتاب ہندوستان اور خصوصاً بنگال کے اوپر ہے۔ اگر مل جائے تو پڑھ لو۔ کلکتہ کی زندگی اور ''نیو پالیٹکس'' کے ابواب خوب ہیں۔

میاں رضا تم کو ''سدابہار نابالغ'' کہتے ہیں۔ وہ ہیں اچھے خاصے الو کی دم فاختہ۔ تم جب واقعی نابالغ تھیں تب بھی تم خود اپنی رائے قائم کرتی تھیں۔ بجائے اس کے کہ تم صدا بہار نابالغ ہو۔ میں البتہ سدابہار نابالغ ہوں جو تم سے اصولِ زندگی سیکھتا ہوں۔ تمھارے استخارے کا قائل نہیں ہوں۔ لیکن ہما بیگم کے استخارے پر آج بھی ایمان رکھتا ہوں۔

ہما بیگم! ایک صاحب ہیں غلام جیلانی برق۔ انگریزی کے پی ایچ ڈی ہیں۔ عربی

کے بھی فاضل ہیں۔ انھوں نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں دو کتابیں ہیں ''دو اسلام'' جو انہدامی ہے اور ''دو قرآن'' تعمیری ہے۔ تم ان کو جانتی ہو؟ دوسری کتاب تو خیر مگر ''دو اسلام'' بڑی زبردست کتاب ہے تم پڑھ ڈالو۔ کیمبلپور کے رہنے والے ہیں۔ میں نے ''میرا مذہب'' ان کو بھیجا تھا مگر نہ رسید آئی نہ جواب۔ ہم ہمیشہ رجسٹری کروا کر بھیجتے ہیں۔ مگر رسید کبھی لوٹ کر نہیں آئی ہے۔ یہ انتظام کی خوبی ہے۔ ایک خط کٹا پٹا بھیجتا ہوں۔ اگر پڑھ سکنا تو پڑھ لینا۔

اس وقت مریضوں سے میدان خالی ہوگیا۔ چاہتا ہوں کہ خط کو اور طول دوں۔ مگر مضمون نہیں سوجھ رہا ہے۔ دل کے اندر خود اپنے مصائب کا مضمون موجود ہے۔ مگر میں اس کو ٹال رہا ہوں۔ لو دو تین مریض پھر آگئے۔ دوا دے لوں تو لکھوں۔ شاید اس وقت تک کوئی مضمون سمجھ ہی میں آجائے۔

تم نے لکھا تھا کہ جواب جلدی دینا۔ خط اسی وقت لکھنا شروع کیا اور آج ۲۲ر مارچ ہے۔ خط ختم نہیں ہوا۔

آج کل صلاح الدین احمد صاحب کو کچھ ہم سے شکایت ہوگئی ہے۔ ہم کیا کریں نہ دماغ کام دیتا ہے نہ عقل۔ اگر کچھ لکھتے بھی ہیں تو انحطاط کا اثر اس میں کھلا کھلا جھلکا کرتا ہے۔ آفاق تم کو تسلیم کہتے ہیں۔ جب کوئی اچھا شعر سنتے ہیں تو تمھارے لیے لکھ لیتے ہیں کہ ہما آپا کو بھیجیں گے۔ بدرل بھی تم کو دعا کہتے ہیں۔ قیصر دعا کہتی ہیں۔ جابر تسلیم کہتے ہیں۔

دعا گو

محمد علی عفی عنہ

ہما بیگم کے نام

ہما پیاری! دعائیں قبول فرماؤ اور میرے بس میں کیا ہے۔

ایک بار مولوی عوض علی مرحوم اور ہم ساتھ جارہے تھے۔ میں نے ان کی تعریف شروع کی کہ آپ اچھی خیرات کرتے ہیں۔ وہ کھڑے ہوگئے اور کہنے لگے ''لے بھائی ای کا کیہو۔ بھئی ہمرا سب کیا کراوا مٹی کر دِیہو لے اب تم کہد یہو اب کیا ہوئی ہے۔ لے ہمرا تو ثواب گوا۔ حکم ہے کہ کہونا اور تم کہد یہو تو ہم تو کہیں کے نہ رہن بھائی۔ واہ بھئی واہ۔ ایسا کوئی کرت ہے بھائی۔'' تم نے لکھا ہے کہ میرے خط چھپوانے کے لیے جمع کر رہی ہو۔ اب خط لکھتے وقت یہ یاد آجایا کرے گا اور بجائے سادگی صفائی بے لوثی کے انانیت، اوچھاپن، اظہار قابلیت، الابلا خاک دھول...... خطوں میں نہ معلوم کیا کیا سما جائے گا۔ لے بھائی ہما ای کیا کیہو۔ بھئی ہمرا کیا کراوا سب مٹی کردیہو۔ ایک مرتبہ یہی بات میں نے اپنے استاد مسٹر سڈنس کو لکھی تھی۔ انھوں نے جواب میں لکھا تھا کہ میرے خطوط کے چھپوانے کا خیال ہرگز نہ کرنا۔ اگر میں یہ جانتا تو مجھ سے وہ خطوط لکھے نہ جاتے۔

میں یہ تو نہیں کہتا کہ میرے خطوط چھپیں نا۔ اگر ان سے کوئی فائدہ مقصود ہو تو ضرور چھپیں مگر اس خیال کے بعد وہ تحریر کی بے تکلفی تو گئی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے جیل خانے میں چھپوانے کے لیے خطوط لکھے تھے۔ دیکھ لو۔ ایک خط کے سوا جو انھوں نے اپنی بی بی کے مرنے پر لکھا تھا اور جتنے خطوط ہیں ان میں لڑکوں کا باپ مردہ، بی بی کا شوہر غائب اور صرف ادب کا منشی، علوم کا مولوی، انگریزی پالٹیکس کا ادھ کچرا نقال، ''انا'' کا ڈھنڈورا پیٹنے والا بڑے بڑے الفاظ اور عربی ترکیبوں کا اردو کی اونچی نیچی زمین پر tank چلانے والا دکھائی دیتا ہے۔

اچھا لو اب شکایت نہ کرنا۔ رات دیوالی کی رات تھی۔ چاروں طرف چراغ جگمگا

رہے تھے۔ ہر ہندو گھر میں جوئے کی پھڑ بچھی تھی۔ درمیان درمیان سنکھ کی پوں پوں اونچی دیواروں سے چراغوں کو پھاندتی ہوئی کانوں کے پردوں پر دھمال بجاتی تھی۔ نہ مٹنے والا اندھیرا، اور نہ ختم ہونے والی جاڑوں کی رات دلوں پر خوف طاری کر رہی تھی۔ اگر آسمان پر ستارے ٹوٹتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ جادو کی ہانڈیاں چل رہی ہیں۔" لاحول و لاقوۃ۔ یہ محمد علی ہما بیگم کو خط لکھ رہا ہے یا مولوی عبدالحلیم شرر کی نقل بھانڈ لوگ کر رہے ہیں۔ تم نے گزشتہ خط میں میرے مسودہ کا تو ذکر کیا مگر اپنی کتاب کا حال نہ بتایا۔ ہم لوگ زندہ ہیں تم سب کے لیے دعا کرتے ہیں۔

محمد علی عفی عنہ

(۱۸۹)

ہما بیگم کے نام

ہما بیگم، دعائیں قبول کرو! تمھاری کتاب دیکھی۔ دوسروں کو دکھائی۔ ہر شخص ایک طرح خوش ہوا اور میرا تو سینہ کشادہ ہوگیا۔ تم نے تو ہما اپنا راستہ اپنے بنانے والے کی طرف سیدھا کرلیا۔ ذری ہم لوگوں کا خیال رہے۔ ہاں ہما بیگم پھر تم نے اپنے ولایت جانے کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ مجھ کو تو تمھارا یہ خیال بہت پسند آیا تھا نہ معلوم سلمان سے بھی تم نے مشورہ کیا یا نہیں۔ ان کو خط لکھنا اور جواب کی امید لگانا ذری سخت بات ہے مگر مجبوری ہے۔ مجھ کو نہ حال معلوم ہے نہ میری رائے اس بارے میں قابلِ وقعت ہوگی۔ لیکن میرا تو یہ خیال تھا کہ اگر یہ ارادہ انشاء اللہ تعالیٰ ہے تو کوئی خاص امتحان یہاں سے پاس کر کے جانا صرف تضیع اوقات ہے۔ وہیں امتحان بھی پاس کرو اور وہیں ٹریننگ بھی کرلو۔ دو ہزار روپیہ میرے پاس ہے تین ہزار قیصر سے لے لوں گا۔ اگر بعد کو ضرورت ہوگی تو خدا مسبب الاسباب ہے اس کا بھی سامان کردے گا۔ اگر مر گیا تو خدا مرنے والا نہیں ہے تم کو دھڑکا کس بات کا ہے کمر ہمت باندھو اور چل کھڑی ہو۔ اس وقت سلمان وہاں ہیں۔ ایسے وقت سے بہتر وقت نہ ہوگا۔ آئندہ تم مختار ہو۔ ہم تو خادم ہیں۔ جب کتاب چھپتی ہے یا لڑکا ہوتا ہے تو عجیب خوشی ہوتی ہے۔ تم تو تم میں اس خیال سے خوش ہوں کہ ہماری ہما کو یہ خوشی نصیب ہے۔ فالحمدلله رب العالمین۔ ارے یار تمھاری وجہ سے ہم بھی مذہبی آدمی ہوتے چلے جاتے ہیں۔ خیالات میں تو چنداں فرق نہیں۔ مگر ''زیب داستاں'' کے لیے ہم بھی اچھے خاصے خدا کو ماننے والے خدا پر بھروسہ کرنے والے۔ افوض امری الی اللہ (املا غلط تو نہیں ہوگیا) کا نعرہ لگانے والے۔ ع

''ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا''

ہوتے جاتے ہیں۔ خدا میرا جعل فریب معاف کرے اور باوجود میرے دعوے

دھڑی کے مجھ پر رحمت نازل کرے۔ آمین رب الغلمین!

ارے بھئی کتاب کی تعریف جی بھر کے نہیں کی۔ واقعی بڑی عمدہ کتاب ہے۔ زبان میں تمھاری شخصیت جھلکتی ہے اگر یہ نہ ہوتا تو دل پر اثر نہ ہوتا۔ اب تو یہ حال ہے کہ جوکوئی تمھاری کتاب پڑھتا ہے اس کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب قمچی ہاتھ میں لیے سبق پڑھا رہے ہیں۔ ایک ایک بات ذہن نشین کروا رہے ہیں۔ اگر طبیعت ادھر ادھر ہٹی یا نگاہ کتاب پر سے ہٹی تو قمچی پڑ جائے گی۔ لو ایک بات اور سن لو۔ کسی آدمی کی لڑکی کے پیٹ میں درد تھا۔ وہ مُلّا سیانے گنڈا تعویذ کے لیے دیوانہ وار دوڑا جارہا تھا۔ راستے میں شیخ سعدی ملے۔ حال پوچھا۔ کہنے لگے '' بھئی ایک ٹوٹکا ہے۔ ذری اس کو بھی کر کے دیکھو۔ تم جاکر اس کے کان میں کہہ دو ''یا مشکل کشا علی'' یقینی پلوٹھی کا رہا ہوگا۔ دو چار گھنٹے بعد پھر اس آدمی کو دیکھا۔ پہلے سے زیادہ پریشان تھا۔ پوچھا کیوں بھئی وہ ترکیب بھی کی تھی؟ بولا ہاں مگر حالت میں کوئی فرق نہ ہوا...... شیخ سعدی کہنے لگے۔ کیا کہا تھا؟ بولا کہا تھا ''یا مشکل کشا علی'' انھوں نے کہا اب جا کے پھر تو کہو۔ مگر کہنا ''سعدی کے مشکل کشا علی'' لڑکی کی مشکل آسان ہوگئی۔ جیسے ان کے دن پھرے ویسے کہتے سنتے کے دن پھریں۔ ہما بیگم خدا نے چاہا تو تمھاری محنت بھی ٹھکانے لگے گی۔ دنیا قرآن پر عمل پیرا ہوگی۔ لیس للانسان الا ماسعیٰ۔ تمھاری خدمت خدا قبول کرے گا۔

انشاءاللہ تعالیٰ

راقم

دعا گوئے قدیم

ہما بیگم کے نام

ردولی　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　یکم اکتوبر

ہمار پیاری! دعا۔

میں خط لکھنے کے قابل نہیں رہا۔ وجہ یہ کہ آنکھیں آج کل پھر حوالات میں ہیں۔ نظر بازی کا جُرم لگایا گیا ہے۔ دیکھیے کیا ہوا؟ اگر اندھا پن تقدیر میں لکھا ہے تو وہ بھی دیکھیں گے نہیں تو یوں ہی آنکھیں بند ہو جائیں گی۔ تمھارا دوسرا خط بھی موصول ہوا۔ پڑھ کر آنکھیں ٹھنڈی ہوئیں۔ یہ پوسٹ کارڈ میاں جابر لائے ہیں۔ کہتے ہیں۔" ہما اپیا کو لکھ دیجیے کہ اشفاق بھائی کو لکھ دیجیے کہ میرا ویزا بنوا دیں۔" جابر تیار ہیں مگر بغیر ویزا کے کیا کر سکتے ہیں۔ ہم لوگ زندہ ہیں اور میں اپنی بخشش اور تم لوگوں کے لیے دعا کرتا ہوں۔ اور کیا۔ لکھوں۔ ابھی خط ختم کرنے کو دل نہیں چاہتا مگر کوئی کان میں کہتا ہے کہ اگر اسی طرح اندھا دھند پڑھے جاؤ گے، لکھے جاؤ گے تو بینائی ڈھونڈو گے مگر نہ پاؤ گے۔ قیصر دعا کہتی ہیں۔ نوشاد بھی دعا کہتے ہیں۔ لو دوسری طرف نوشاد کا خط موجود ہے۔ اور میں ان کی طرف سے دعا لکھے بیٹھا ہوں۔ یہ تماشا دیکھو۔

دعا گو

محمد علی عفی عنہ

۱۹۱

ہما بیگم کے نام

ہما پیاری! دعائیں۔

دو مہینے اوپر تین برس ہو گئے کہ لوگوں کو تکلیف ہی دے رہا ہوں۔ اور لوگوں کے لیے تکلیف نہیں اٹھاتا۔ یہ خود غرضی یہ دھاندلی کب تک چلے گی۔ ایک خط الّن کو لکھا تھا لیکن وہ ڈاک میں ڈلوانا بھول گیا۔ سب کو خط لکھنے کو دل چاہتا ہے مگر بجّن چھبّن کو نہیں لکھا کہ ان لوگوں کو پیش از وقت رُلانے سے کیا فائدہ۔ الّن رو چکی ہے۔ اس کا دل شاید پتھر کا ہو گیا ہو۔ اس لیے آپ کو لکھ دیا۔ تم ماشاء اللہ افوض امری کی قائل ہو اس لیے انشاء اللہ تعالیٰ ابھی نہ روؤ گی بلکہ وقت اور موقع کی منتظر رہو گی۔ ہاں بیٹی! فون پر سلّو اور شبّر کو بہت بہت دعائیں کہہ دو۔ اگر دماغ قابو میں رہا تو ان کو علیٰحدہ لکھوں گا۔ واقعی خط نصف الملاقات ہوتا ہے۔ مگر ہمیشہ نہیں جب دل سے لکھو تب۔ بچوں کو، اخلاق کو سب کو الگ الگ دعائیں۔ تمھارے رجّن چچا پھر آئے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ تم ابھی ہو گی۔ بیٹی معلوم نہیں انھوں نے مجھ میں کیا دیکھا ہے۔ مگر وہ تو بے وجہ، بے سبب، بے غرض، میرے گرویدہ ہو گئے ہیں۔ خدا اس کا اجر ان کو دے۔

دعا گو

محمد علی عفی عنہ

۱۹۲

ہما بیگم کے نام

ہما پیاری دعا۔

آج اتوار ہے۔ ڈاک نہ نکلے گی مگر تم کو خط لکھوانے کو جی چاہتا ہے۔ خود بھی لکھ سکتا ہوں مگر آنکھیں خفا نہ ہو جائیں۔ بیاری دیکھ کر جھنجلاہٹ ہوتی ہے۔ اور آنکھیں تو ابھی بیمار ہیں۔ ہم اس وقت تک زندہ ہیں مگر انفلوئنزا کی سواری ہیضہ کی دوڑ اِدھر اُدھر ہے۔ اور یہاں صرف ٹھیس لگنے کی دیر ہے۔ کیا کریں۔ بی بی دل چاہتا ہے کہ خوشی کی باتیں کریں مگر نہیں بنتا۔ اگر ہو سکے تو تم اپنی صحت کا مژدہ سناؤ۔ اَلن کو خط لکھنے کو دل چاہتا ہے۔ چھنّن کو معذرت نامہ لکھنا ہے۔ انھوں نے کھیوٹ خسرہ وغیرہ مانگ بھیجا تھا۔ نوشاد گئے تھے مگر پٹواری صاحب تحصیل سے غائب ہیں اور اپنے حلقے سے بھی تعطیل پر گئے ہیں۔ باضابطہ تحریری رخصت قصہ پارینہ ہے۔ اب جب چاہو خود رخصت لے سکتے ہو۔ ملک آجاد ہے۔ میاں سلمان نے پھر خبر نہ لی۔ نہ کتابوں کی نہ ہماری۔ اور کیا لکھیں کوئی مضمون ذہن میں نہیں آ رہا ہے۔ البتہ آفاق کا ایک پیغام ہے۔ بیدم شاہ وارثی مرحوم ایک فقیر اور شاعر تھے، ان کا دیوان یہاں بھی چھپا تھا مگر اب نہیں ملتا۔ وہاں ان کے کسی پیر بھائی نے "حیرت شاہ وارثی" مختصر سا مجموعہ ان کا چھپوایا تھا۔ اگر وہ ملے تو آفاق کو بھیج دو۔ تمھاری ترغیب دہی کے لیے کچھ اشعار جو آفاق ہی کو یاد ہیں لکھے جاتے ہیں،

تا کہ ایک نسخہ اپنے لیے بھی خرید لو۔

رُوح رواں مصطفویؐ جان اولیاء — مولا علی بہارِ گلستانِ اولیاء
داتا۔ سخی۔ کریم عبد اللہ۔ بو الحسن — پُر ہے کرم سے آپ کے دامانِ اولیاء
بیدم سنائے جایوں ہی نغمے بہار کے — خاموش ہو نہ بلبل بستانِ اولیاء

متفرق

وہ چلے جھٹک کے دامن مرے دستِ ناتواں سے
اِسی دن کا آسرا تھا مجھے مرگِ ناگہاں سے
زباں سے نام نہ لوں جانتا ہوں لیکن
یہ میری طرف جس کماں سے آتے ہیں
تم جو چاہو تو مرے درد کا درماں ہو جائے
ورنہ مشکل ہے کہ مشکل مری آساں ہو جائے
تو جو اسرار حقیقت کہیں ظاہر کر دے
ابھی بیدم رسن و دار کا ساماں ہو جائے
کعبہ کا شوق ہے نہ صنم خانہ چاہیے
جاناں نہ چاہیے درِ جاناں چاہیے
بیمار کو تونے ناصح
سمجھا سمجھا کے مار ڈالا

شیخ حبیب اللہ مرحوم کے ایک سسرالی عزیز کاکوری کے ہیں۔ کاکوروی کی مڑک عنوانِ خط سے ظاہر ہے۔ ان کا خط اور میرا جواب بھی ملفوف ہیں۔ سعید آج کل یہاں ہیں۔ جابر اور سعید آداب عرض کرتے ہیں۔ قیصر میری خدمت بے انتہا کرتی ہے۔ بچوں کو دعا۔ اگر لکھ سکتا تو بڑا سا خط لکھتا۔ آنکھوں سے لگاؤں گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ

دیدار کا پیاسا خادم

تمھارا باپ عفی عنہ

ہما بیگم کے نام

ردولی

ہما بیگم! دعائیں

تمھارے جانے کے بعد کمزوری اور زور پکڑ گئی۔ جب تم یہاں تھیں تب سے اور اب سے زمین آسمان کا فرق ہے۔

تم کو دیکھے سے جو آجاتی تھی موںہہ پر رونق
تم سمجھتی تھیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

تمھارا باپ عفی عنہ

ارے بیٹی خوب یاد آیا تم اور اخلاق اور سب لڑکے تاؤں تاؤں چاؤں چاؤں سب مل کر دعائے مغفرت میں بڑا شور مچانا۔

محمد علی عفی عنہ

---

(۱۹۴)

ہما بیگم کے نام

ہما پیاری! تمھارا خط ابھی ابھی ملا۔ الّن کا بھی خط آیا ہے۔ دونوں میں یہ کوشش معلوم ہوتی ہے کہ بڈھا باپ تم لوگوں کا آرام معلوم کر کے مطمئن ہو جائے مگر بین السطور پر نظر کرنے سے کچھ اور ہی معلوم ہوتا ہے۔

بظاہرم منگر گرچہ سر بسر سبزم
بسانِ برگِ حِنا باطِنم پُر از خوں است

تم نے لکھا ہے ''اخلاق چھٹیوں میں یورپ جانے والے تھے، بے وقت کی بڑھی ہوئی طوالتوں نے شاید ان کو جانے سے روک دیا۔'' الّن لکھتی ہیں۔ ''اللہ کا شکر ہے ابھی تک بچوں کی طرف سے اطمینان ہے۔ مگر زندگی کے کاروبار اور پچھلے رابطے سے بے تعلقی ضرور ہے۔'' تم کہتی ہو کہ ''کہیں گوشے میں بیٹھ کر لکھوں پڑھوں اور اپنے اللہ کی عبادت کروں اور جب وقت آئے تو چُپ چاپ مر جاؤں۔'' الّن لکھتی ہیں ''بہر حال وقت گزر رہا ہے، اور گزرتا رہے گا۔'' میں کہتا ہوں کہ جوانی کی امنگ مجھ کو ہر دم تازہ حقہ بنائے ہے۔ اس کی گُڑ گُڑاہٹ میرے قہقہے کی تفسیر کرتی ہے۔ اعصاب لوہا لاٹ ہوگئے ہیں۔ خلافِ مزاج بات گدگدی کا لطف پیدا کرتی ہے۔ اچھا چھوڑو اس طنز کو۔ اللہ میاں کی عنایتیں، اس کی مہربانیوں کا ہزار ہزار شکر ہے کہ تم زندہ ہو، الّن زندہ ہیں، بچے ماشاء اللہ خوش ہیں۔ شکراً شکراً۔ عفواً عفواً عفواً۔ یا اللہ یا رَبّاہُ یا سیداہ۔ قیصر دعا کہتی ہیں۔ جابر سعید تسلیم عرض کرتے ہیں۔ آفاق الہ آباد گئے ہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ جلد واپس آویں گے۔ آنکھیں بہت اچھی ہیں۔ الحمد اللہ رب العٰلمین۔ مگر زیادہ استعمال کرتے ڈر لگتا ہے۔ تصویر دیکھی آنکھیں ٹھنڈی ہوئیں۔

دعا گو

تمھارا باپ عفی عنہ

(۱۹۵)

ہما بیگم کے نام

ہما پیاری! دعائیں قبول فرماؤ۔ کل ایک پوسٹ کارڈ بھیج چکا ہوں، مگر اعصابی خرابی کا برا ہو اس میں تمھارے مکان کا نمبر نہیں لکھا۔ اللہ ہی ہے جو پہنچے۔ کیا کہوں جیتے جی تم لوگوں سے چھوٹ گیا نہ اس پہلو چین نہ اس پہلو آرام۔ عمر بھر کی عادت آرام کی۔ تکلیف اور غریب الوطنی سے جی ڈرتا ہے۔ جیسا کہ تم نے لکھا ہے ہندستان کی خاک دامن گیر ہے۔ باپ دادا کی ہڑواڑ اپنی طرف کھینچتی ہے۔ وہ لوگ جو زندگی کا نتیجہ حیات کا مقصد ہیں یعنی اولاد وہ اپنی طرف بلاتے ہیں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

اس وقت تو اتنا روپیہ بھی نہیں ہے کہ دو چار دن کے لیے تم لوگوں کو دیکھنے چلا آؤں۔ اگر حیات مستعار باقی ہے تو دیدار کی آس لگی ہے۔ نہیں تو بڑوں کا مرنا آدم کی سنت ہے۔ مبارک سنت پر گاندھی کا بیان یاد آگیا۔ جو انھوں نے کل رات برت شروع کرتے وقت دیا ہے۔ موت کو اپنا سب سے بڑا دوست بتایا ہے۔ خدا کرے وہ پورا بیان تم نے پڑھ لیا ہو۔ سبط بمبئی گئے ہیں۔ سنا ہے ادھر سے کراچی جائیں گے۔ یہاں سب خیریت ہے۔ بدرل چچا اچھے ہیں اور تم کو دعا کہتے ہیں۔

اے لو میں یہ خط لکھ رہا ہوں۔ میاں سعید نے گریموفون بجانا شروع کیا۔ سیاں ایک بیریا آجا ہمری سجریا۔ دن نہیں چین رات نہیں نندیا سپنے میں اک بیری آجا۔ سیاں اک بیری.......... یہ ریکارڈ بج رہا ہے اور میں آپ ہی آپ بیتابی سے رو رہا ہوں۔ مجید تعجب میں کھڑا ہے۔ میری طبیعت سے واقف ہے اس لیے گھبرایا نہیں۔

کیا کہوں میں عاشق و معشوق کے راز و نیاز
ناقہ رامی راند لیلیٰ سوئے خلوت گاہ ناز
سار باں در رہ حدی می خواند و مجنوں می گریست

عاشق و معشوق کی جگہ ماں باپ سمجھو اور بچے۔ قیصر دعا کہتی ہیں۔ چمن کے یہاں سب خیریت ہے۔ گھبراؤ مت۔ میں بالکل اچھا ہوں۔ چار آنسو نکل جانے سے دل بشاش ہوگیا، ہلکا ہوگیا۔

محمد علی عفی عنہ

(۱۹۶)

ہما بیگم کے نام

ایک آدمی ہیں اسد۔ کوئی یورپین ہیں۔ مسلمان ہوگئے ہیں۔ وہ ایک پرچہ نکالتے تھے ''عرفات'' اب ادھر نہیں آتا۔ خدا کرے وہاں نکلتا ہو اور تمھاری نظر سے گزرتا ہو۔ انگریزی میں ہے۔ اور قرآن کی تفسیر خوب کرتا ہے۔ یہ بزرگ محکمہ مذہبیات کا صدر ہے۔ اگر مل سکیں تو نئے پرانے سب پرچے دیکھ ڈالو۔

دوسرے ہمارے ایک غائبانہ قدردان ہیں صلاح الدین بی. اے. ''ادبی دنیا'' کے ایڈیٹر اگر وہ چھپوا دیتے ہیں تو میں مسودات ان کو بھیج دیتا۔ بہت سے مضامین اور کہانیاں انھیں کے پرچے میں چھپی ہیں۔ بعض کی نقلیں بھی میرے پاس نہیں ہیں۔ اگر کوئی ان کو بہم پہنچا سکتا ہے تو صلاح الدین صاحب ہی ہوسکتے ہیں۔

دعا گو

تمھارا باپ عفی عنہ

---

(۱۹۷)

اخلاق کے نام

برخوردار اخلاق سلمہ! دعا۔ تم چلے گئے۔ مجھ سے ملاقات نہ ہوئی۔ خیر کوئی ہرج نہیں، زندہ رہو خوش رہو۔ اگر حیات مستعار باقی ہے تو انشاء اللہ تعالیٰ ملاقات ہو ہی جائے گی۔ تمھارے والد گھڑی بھر کے لیے روز آجاتے ہیں۔ تمھاری باتیں بھی ہوتی ہیں۔ کچھ امیری غریبی کا ذکر تھا۔ مجھ کو ایک واقعہ یاد آیا اور اسی کے ساتھ تم بھی یاد آئے چونکہ واقعہ ایسا ہے کہ کسی تاریخ میں نہ لکھا جائے گا۔ اس لئے تم کو لکھ رہا ہوں۔ اس طرح یہ واقعہ ایک عرصے تک اور زندہ رہے گا۔

تمھارے نذیر حسین بابا کے یہاں جب خوش حالی تھی تو ایک آدمی نوکر تھے ان کا نام زبیر خان تھا۔ بہت بوڑھے، کمر جھکنے کے بجائے کچھ ٹیڑھی ہوگئی تھی جو جو بڑھاپا آتا ہے اینٹھتے جاتے ہیں کیا جانے کیسی مٹی اپنا خمیر ہے۔ ایک سال برسات بہت ہوئی۔ علاوہ اور مکانوں کے مولوی امام علی کے گھر کی وہ دیوار گر گئی جو مکان کے اتر کی طرف گلی میں ہے۔ وہ دیوار گلی میں ڈھیر ہوگئی۔ راستہ بند ہوگیا۔ لوگ اسی دیوار کے ڈھیر پر چڑھ کر حاجی نیب کی طرف جاتے تھے، میاں زبیر خان جو اس جگہ پہنچے تو دیکھا دو چارپائیاں دو طرف کھڑی ہیں اور ان پر پرانی رضائی توشک وغیرہ ڈال دی گئی۔ اس کی آڑ میں مولوی امام علی کی ماں بیچاری پردہ برقرار رکھے ہیں۔ مولوی امام علی انگنائی میں کھڑے ہیں۔ آنے جانے والوں سے از راہ انسانیت امید رکھتے ہیں کہ ہر جانے والا ہمدردی کرے گا۔ چنانچہ زبیر خان دیوار کے ڈھیر کی سب سے اونچی جگہ کھڑے ہوگئے۔ لٹھیا ٹیک کر کمر سیدھی کی۔ گھر کی وسعت کا نگاہ سے جائزہ لیا اور کہنے لگے،''واہ اب بڑی فجا ہوگئی (فضا ہوگئی)۔

تم کو میں نے ڈکشنری نہ دی۔ اس ڈکشنری کا نام Little Oxford Dictionary ہے۔ دو روپے کی انشاء اللہ تعالیٰ مل جائے گی۔ اپنی بھاوج سے دعا کہنا اور کہنا کہ جو کام میرے متعلق کیا تھا اس سے میں غافل نہیں ہوں۔ مگر کیا کروں جو ہونہار لڑکا نکلتا ہے وہ چوٹی والا سیدھا پاکستان کی راہ لیتا ہے۔ مگر گھبراؤ نہیں اللہ میاں نے سب کا جوڑا پیدا کیا ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ سہرے کے پھول جلد کھلیں گے۔

دعا گو، محمد علی عفی عنہ

(۱۹۸)

سعید مصطفیٰ علی کے نام

سعید بیٹا۔ دعا۔ تمھارے خطوط برابر آتے ہیں۔ ان سے میرا اور تمھاری امی کا دل خوش ہوتا ہے مگر بیٹا لفافہ کیوں لکھتے ہو۔ پوسٹ کارڈ سے خیریت معلوم ہوجاتی ہے اور جو حال ہوتا ہے وہ بھی معلوم ہو جاتا ہے۔ تم نے آخری خط رومن میں لکھا ہے۔ بہت صاف لکھا ہوا ہے۔ مگر بیٹا معلوم ہوتا ہے کہ تم اس میں وقت بہت صرف کرتے ہوگے۔ اتنا وقت اگر پڑھنے میں لگتا تو اور اچھا ہوتا۔ تم سمجھدار ہو۔ ماشاء اللہ اچھا برا سمجھتے ہو۔ ان باتوں پر غور کرو کہ امتحان قریب ہے۔ آیا ان باتوں کا وقت بھی تمھارے پاس ہے۔ بیٹا یہ نصیحت تم کو بُری نہ لگے تو اچھا ہے۔

دعا گو

تمھارا باپ عفی عنہ

محمود عرفان شعیب اور سب کو دعائیں اور سلام

(غیر مطبوعہ)

---

(۱۹۹)

شاہ آفاق احمد کے نام

آفاق بیٹا۔ خدا تم کو دلشاد اور مطمئن رکھے۔ تمھارے نہ ہونے سے میری دنیا خالی اور جی بھرا ہے۔ مگر اللہ میاں ہر معاملے میں مجھ کو حسب ضرورت سکون دیتے جاتے ہیں اور آئندہ کی طرف سے راضی برضا رہنے کا سبق پڑھاتے جاتے ہیں۔ تمھارے جانے کے بعد دو دن بالکل سناٹا رہا اب میاں نوشاد آگئے ہیں۔ روز کوئی نہ کوئی بات اضافہ ہوتی جاتی ہے۔ کہیں ہونٹ اندر سے پھول جاتا ہے کبھی زبان کی نوک کٹ جاتی ہے کبھی اوپر کے مسوڑے میں نیچے کا دانت گڑ جاتا ہے اور کینسر کی صورت بندھتی ہے۔ مگر تم کو تعجب ہوگا کہ میں ہائے واویلا نہیں مچاتا۔

ناز برآں کن کہ خریدار تست۔ یہاں تک لکھا تھا کہ تمھارا خط آگیا۔ زکام اور زکام کے ساتھ حرارت اللہ میاں کے سامنے ایک اور درخواست دینے کا موقع مل گیا۔ بار الٰہا تیرا بندہ کسی کو نہیں ستاتا اور ہر شخص کو آرام پہنچانے کی کوشش کرتا ہے یہ بات تیرے اوپر مجھ سے زیادہ ہویدا ہے۔ اس پر گنہگار کی نیک دعا سن لے اور اس کو اطمینان عطا فرما۔ آمین۔ رب العالمین۔ یہاں تک کل شام کو لکھا تھا آج جمعہ ہے اس وقت صبح کے ساڑھے سات بجے ہیں۔ میر ہوشیار حسین نے بتایا ہے کہ کوئی قوال آج بنارس جاتا ہے اگر موقعہ ہوا تو اس کے ہاتھ بھیجوں گا۔ نہیں تو ڈاک کہیں گئی نہیں ہے۔ کیا لکھوں۔ بیٹا بغیر تمھارے سب کھیل بگڑا ہے نہ بیماری کا لطف ہے نہ صحت کا مزہ۔ اللہ کرے تم اچھے رہو اور تمھارا دل بہلا رہے۔ قیصر اسی طرح ہماری تیمارداری کرتی ہیں۔ نوشاد بھی وہی وضع داری نباہ رہے ہیں مگر ذرا بے افیون کا مراقبہ بڑھ گیا ہے اور میاں صابر شاہ سے فیضان زیادہ پہنچ رہا ہے۔ تمھارے گھر میں بحمد اللہ خیریت ہے۔ تمھاری والدہ ماجدہ اور قیصر کے درمیان میں رُسل و رسائل کا سلسلہ جاری ہے۔ اس لیے حال معلوم ہوتا رہتا ہے۔ تم بیٹا اپنا حال زیادہ لکھنا

اور میرے حال پر افسوس کم کرنا۔ مولینا سلمہ کو اور میری بھانجی سلمہا کو اور بچوں کو دعائیں۔
اسی طرح آل رسول ان کی بی بی بچوں کو اور مولوی اطہر صاحب، ڈاکٹر صاحب اور جو اور
جاننے والا مل جائے سب سے التماس دعا۔ اب قیصر لکھیں گی۔

دعا گو

تمہارا بابا عفی عنہ

۱۴ر فروری

آج ۱۴ر فروری عیسائیوں کا ایک تیوہار ہے۔ سینٹ ویلنٹائنس ڈے آج تمام جانور
یعنی پرندے آئندہ بہار کے لیے اپنا اپنا جوڑا تجویز کرتے ہیں۔ آج صبح از راہ حماقت کچھ
امرتیاں آگئی تھیں۔ تمہارے حصے کی تمہارے بچوں کو بھیج دی ہے۔

(غیر مطبوعہ)

آفاق کے نام

آفاق بیٹا! آج کیا پروگرام ہے؟ اگر گاؤں جاتے ہو تو ''بسلامت روی و باز آئی۔''
اگر گھر پر کوئی مشغلہ ہو تو ''چشم ما روشن دل ما شاد'' اگر بیکار بیٹھے ہو تو کرم نما فرود آکہ خانہ خانۂ تست۔

دعا گو

محمد علی عفی عنہ

''حلالی لڑکے ہوتے ہی رہتے ہیں مگر حرامی لڑکے کی شہرت کا بہانہ ہاتھ آیا۔ ذکر عیش نصف عیش، اپنا جنسی معاملہ نہ سہی دوسرے کا سہی مگر ہے تو مزے کی بات، جس کو دیکھو پیڑے برفی کا دونا ہاتھ میں لیے چلا آتا ہے۔ رفتہ رفتہ پولیس کو خبر ہوئی۔ باپ کا نام پوچھا گیا، ماں نے اندھیرے کی آڑ پکڑی۔ اب کیا کیا جائے؟ کسی لونڈے نے لپک کر استاد کو خبر سنائی کہ تھانے سے دوڑ آگئی ہے۔ استاد مع چند شاگردوں کے پہنچ گئے۔ تمام مجمع کو ڈھارس ہوئی... کانسٹبل اس بات پر اُڑا ہوا کہ باپ کا نام معلوم ہونا چاہیے اتنے میں مجمع سے ایک آواز آئی۔ ''ارے استاد ہی کا نام لکھ لو، بڑا قہقہہ پڑا... کسی نے کہا ارے استاد تو محلے بھر کے ماں باپ ہیں... کانسٹبل نے ہنس کر کہا ''کیوں شیخ جی کیا کہتے ہیں آپ؟ شیخ جی ''جو چار بھلے مانسوں کی رائے ہو مجھ کو منظور ہے...''

(''استاد''۔ کشکول)

(۲۰۱)

حمایت الحسن صاحب کے نام

مکرمی تسلیم! آپ کا بے غرض اور اخلاص سے بھرا ہوا خط موصول ہوا۔ لوگوں کے خط آتے رہتے ہیں۔ میں بھی لکھا ہی کرتا ہوں مگر اس طرح کے دلکشا خطوط روز روز نہیں نصیب ہوتے۔ جیسے گرمیوں میں صبح صادق ہو، جیسے ماہ نیم ماہ کی چاندنی، جو تمھارا کچھ نہیں لیتیں اور تم کو کچھ ایسا دے جاتی ہیں جو بہشت سے آئی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔

زمانہ ایک طرح پر کبھی نہیں رہتا
اسی کو اہلِ جہاں انقلاب کہتے ہیں

اللہ اللہ ایک زمانہ تھا کہ کامیابی دوش بدوش ساتھ تھی۔ اور بہت کچھ کرنا باقی تھا۔ اب یہ زمانہ ہے کہ کامیابی اپنا کام پورا کر کے نوجوانوں کے پاس چلی گئی اور جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ ہم سب کا یہی حال ہے۔ میں خود بہت بوڑھا ہو گیا ہوں۔ علی ضامن صاحب قلب کی تکلیف میں مرادآباد میں ہیں، مغلپورہ ان کا پتہ ہے۔ خدا آپ کو شفا بخشے اور بڑھاپے کا سکھ دیکھنا نصیب کرے۔ اور اس کے بعد اپنے حبیبؐ کے صدقے میں ہم سب کو بخش دے۔ کاظم رضا سلمہٗ کو ضرور بالضرور آپ کا پیغام پہنچا دوں گا۔ مگر وہ جب سے پاکستان گئے ہیں نہ خط ہندوستان کو لکھتے ہیں نہ آتے ہیں۔ اس وجہ سے نہیں کہ وہ ہم لوگوں کو بھول گئے بلکہ اس وجہ سے کہ ع

نہ چھیڑ بادِ وطن ہم کہاں بہار کہاں

وہ ڈائرکٹر آف اِن ٹے لی جنس بیورو ہیں اور تمام ممالک غیر میں اپنے فرائض منصبی کے سلسلے میں جب چاہیں جاسکتے ہیں۔ مگر چھوڑے گاؤں کا کہا ناؤں۔ ہندوستان آنا پسند نہیں کرتے۔ آج کل زمینداری کا خاتمہ ہو رہا ہے۔ آخر وقت پھر سے زندگی شروع کرنا۔ خیر غنیمت ہے کہ بہت دنوں کا کھیل نہیں ع

چنیں نماند و چناں نیز ہم نخواہد ماند!

خدا پر بھروسہ نہیں ہے راضی برضا کا سبق ہی یاد نہیں کیا تھا۔ خیر جیسی پڑے گی جس نے ڈالا ہے وہی کاٹ بھی دے گا۔

میں نے عبدالرحمٰن کو دو کتابیں دی تھیں ایک ''کشکول'' اور دوسری ''میرا مذہب''۔ نہ معلوم آپ کے ملاحظے سے دونوں گزریں یا صرف ایک ہی۔ ''میرا مذہب'' اپنے وقت کی ایسی کتاب ہے کہ تاریخ اسلام میں دیکھنے میں کم آئی ہوگی۔ مدعا عرض کرنے کا یہ نہیں کہ لاجواب ہے۔ چہ پدّی چہ پدّی کا شوربا۔ صرف یہ بات نئی ہے کہ بجائے افتراق بین الاسلام بڑھانے کے، کوشش یہ کی گئی ہے کہ خلیج مغائرت کم ہو۔ افسوس یہ ہے کہ بغیر کھرونچ لگائے یہ کام نہ کرسکا۔ اس کا افسوس ہے لیکن تعجب نہیں کیونکہ جیسا کہ میں دیباچے میں عرض کرچکا ہوں۔ یہ کام خدا کے نیک بندوں کا ہے۔ میں نے صرف صداقت کی کوشش کی ہے۔ اگر لوگ میری نیت سمجھیں تو شاید ناگوار باتیں بھی معاف کردیں۔

خان بہادر عبدالرحمٰن صاحب کو دعائے شوق!

آپ کا

محمد علی عفی عنہ

---

(۲۰۲)

میجر صاحب کے نام

جمیل المناقب جناب میجر صاحب۔ امت الحاکم۔ تسلیمات۔ آپ نے میرے مذہبی رجحانات کے بارے میں جو فرمایا ہے وہ ایک حد تک ممکن ہے بالکل درست ہو گو مجھ کو خبر نہ ہو مگر میرے دل کو شیعہ یا سنی کہے جانے سے تسکین نہیں ہوتی۔ اور جس جذبے سے تسکین ہوتی ہے وہ نصیب نہیں۔ یعنی مجھ کو ارباب فہم بے وقوف کہیں، جاہل کہیں، گنہ گار کہیں مگر مسلمان سمجھیں۔ غضب تو یہ ہے کہ کوئی متعصب شیعہ کہتا ہے، کوئی سُنّیوں کا خوشامدی کہتا ہے، کوئی ڈھل مل یقین کہتا ہے، کوئی دہریہ کہتا؟ مگر مسلمان کوئی نہیں کہتا۔ تیرہ سو برس بعد مسلمان ہونا ویسا ہی مشکل ہو گیا ہے جیسے پھر سے معصوم بچہ ہو جانا۔

دوش دیدم شبنم غلطاں بروئے گل زنار
یادم آمد طفلی و داماں مادر سوختیم

اگر دنیا میں آج بھی کوئی ایسا مسلمان ہونا چاہے جیسا رسول اللہؐ کے وقت میں ممکن تھا تو وہ کیا کرے گا؟ یہی تو کرے گا کہ اسلام کی تاریخ پڑھ کر ہر واقعے پر رائے قائم کرے گا۔ وہ رائے کہیں شیعوں کے موافق ممکن ہے ہو۔ ممکن ہے سنیوں سے ملتی جلتی ہو۔ بعض باتیں وہابیوں کی اس کو بھلی معلوم ہوتی ہوں، بعض باتیں صوفیوں کی اس کو پسند ہوں تو وہ کیا کرے۔ آخر عقیدے کا اثاث تو وہ اسلامی ہی تاریخ سے فراہم کرے گا۔ پھر آخر وہی کیوں نہ مانے جائے جس کا وہ مدعی ہے۔ جس کے لیے وہ خدا سے دعا مانگا کرتا ہے اور جو اس کی بدقسمتی سے اس وقت تک شاید قبول نہیں ہوئی ہے۔ یہی حال اس گنہ گار کا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جس گروہ میں پالا گیا ہوں اس کا اثر اپنی تخیّل میں موجود پاتا ہوں۔ مگر جن عقائد پر مضبوط نہیں ہوں وہ میرے سَر کیوں منڈھے جائیں۔ مثلاً شیعہ مذہب امام علی علیہ السلام کا دل سے قائل ہے۔ میں اس کو سو فیصدی نہیں مانتا۔ میں حدیث

قرطاس کے معاملے میں شیعوں کا ہم خیال ہوں۔ سنّی اس کے قریب نہیں جاتا۔ پھر لوگ میری بات کو تقیہ یا جعل فریب پر کیوں محمول کرتے ہیں۔ وہی کیوں نہیں مان لیتے جس بات کا میں خود مدعی ہوں۔ اغیار سے گلہ نہیں احباب سے دوستانہ شکایت ہے کہ وہ بلاوجہ یہ کیوں خیال فرماتے ہیں کہ لکھنے والے نے صرف جعل فریب ہی کہا ہے۔ ذری یار و خدا لگتی کہو اگر میں آئمہ علیہ السلام کی جگہ دل میں رکھتا ہوں تو شیعہ کب ہوگیا۔ اگر میں حضرت ابوبکرؓ کا معترف ہوں تو سنّی کیسے ہوگیا۔ آخر میں اپنے ایمان کی عمارت اسی اسلامی مسالے سے تو تیار کروں گا کہ کنفیوشس، گوتم بدھ اور مارکس کے جوزف اسمتھ کے دروازے دریوزہ گری کرنے جاؤں گا۔ بجائے اس کے کہ جو لوگ اپنی للّی گھوڑی پر سوار ہیں مجھ کو بھی اپنے پیچھے سوار کرلیں میری ہدایت کے لیے دعا کیوں نہیں مانگتے۔ نصیری کو حق ہے کہ وہ نہایت صفائی قلب سے میرے لیے دعا کرے کہ بارالٰہا اس کو راہ حق دکھا کر نصیری کردے۔ مگر یہ کیا شرط انصاف ہے۔ کیا شرطِ دوستی ہے کہ نہیں یہ سوار ہوگا تو میرے ہی للّی گھوڑی پر سوار ہوگا۔ اس کتاب میں تقیہ کرنے کی گنجائش میں نے کہیں نہیں پائی۔ پھر میرے لیے یہ حسن ظن کیوں فرمایا جاتا ہے کہ یہ مردود یا یہ اچھا آدمی تقیہ کا روپ بھرے ہے۔

اکثر لوگوں نے اسی طرح کا شک اس گنہ گار پر کیا ہے۔ جیسے جناب نے فرمایا۔ اس کی شکایت اگر مجھ کو اپنے عنایت فرماؤں سے ہوتی تو میں اپنے کو حق بجانب جانتا۔ مولوی عبدالماجد دریابادی نے تو غضب کیا، انھوں نے لکھا ہے کہ محمد علی کہتا ہے کہ میں سنّی یا شیعہ نہیں ہوں۔ اس میں پچاس سیکڑہ وہ کامیاب ہوا۔ یعنی شیعہ تو اس کو اپنے گروہ سے الگ سمجھیں گے مگر سنّی اس کو شیعہ ہی جانیں گے۔ اور اس کی ذمہ داری خود محمد علی ہی پر ہے۔ کیونکہ اس نے خلافت کا مسئلہ چھیڑ دیا۔ یعنی ان کا مطلب یہ نکلا کہ اخلاقی باتیں اگر میں نہ چھیڑتا تو سنّی مجھ سے زیادہ خوش ہوتے۔ گویا میں نے یہ کتاب صرف سنیوں کو خوش کرنے کے لیے لکھی تھی۔ اکثر حضرات اہلِ سنت کا یہی خیال ہے کہ خلافت کا ذکر فضول ہے۔ میرے خیال میں اس وجہ سے کہ اس معاملے میں ان کی کور دبتی ہے۔ فقہی مسائل میں میرا رجحان شیعوں کی طرف زیادہ ہے۔ اس وجہ سے نہیں کہ شیعوں کا مسلک ہے بلکہ

اس وجہ سے کہ میرے خیال میں قرآن کا مسلک ہے۔ مگر اس کے بعد بھی میں اپنے کو شیعہ نہیں کہتا۔ مگر جس گروہ میں پیدا ہوا، جس گروہ میں پروان چڑھا اس کی محبت دل سے نہیں جاتی۔ اسی کے ساتھ امامت من اللہ۔ قرآن پاک میں مجھ کو آج تک دکھائی نہیں دی۔ شیخ کلینیؒ کا ذکر سن کر تکلیف ہوتی ہے۔ اور لکھنے والے سے دل میں شکایت پیدا ہوجاتی ہے۔ بعض سنیوں سے یہ سن کر کہ خلیفہ وقت پر امام حسین علیہ السلام نے خروج کیا تھا اور وہ اپنے نانا کی تلوار سے مارے گئے (نعوذ باللہ) پیچ و تاب کھاتا ہوں۔

محمد علی عفی عنہ

''اردو نثر کے معماروں میں چودھری صاحب محمد علی ردولوی ایک خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ اس امتیاز کا اظہار ان کے علمی اور ادبی مضامین سے زیادہ ان کے خطوں میں ہوا ہے۔ کیسی جاندار، شگفتہ اور خوش طبعی سے چھلکتی ہوئی نثر چودھری صاحب نے لکھی ہے۔ شخصیت کا ایسا کھرا اور دیانت دارانہ نقش ان کے خطوں میں ابھرا ہے کہ پڑھتے وقت کبھی کبھی شعر کی طرح داد دینے کا جی چاہتا ہے۔ اسلوب کی شائستگی کبھی کبھی حد سے بڑھی ہوئی بے تکلفی کو بھی ہمارے لیے پرکشش بنا دیتی ہے۔ چودھری صاحب کی بات بات میں اک بات ہوتی تھی۔ ان کے خطوط ان کی رنگارنگ شخصیت کے بے مثال مرقع ہیں''۔

(پروفیسر شیم حنفی)

میجر ابو جعفر کے نام

عطوفی دامت اعطامکم تسلیم۔ اشتیاق دیدار۔ 9؍جولائی والا عنایت نامہ کل شام کو موصول ہوا۔ سنئے صاحب آپ کے اخلاق حسنہ، قابلیت، نرمیٔ مزاج، علمی صور کا سکہ میرے دل پر بیٹھا ہے۔ اپنی اصطلاح میں ان تمام صفات کا مجموعی نام میرے یہاں مومنیت ہے۔ آپ سے مل کر دل میں بڑی نرمی پیدا ہوئی ہے اور پھر ملنے کی آرزو رہتی ہے۔ میں یہ ڈر رہا ہوں کہ کہیں بحث مباحثے میں پڑ کر یہ رشتۂ عقیدت جو مجھ کو جناب سے ہے ٹوٹ نہ جائے۔ خود میری طرف سے ایسا ہونے کا ڈر نہیں۔ ایک عنایت فرما سے اسی کتاب کے سلسلے میں مجھ کو ڈر ہے کہ ایسا ہی ہوا نہ ہو کیونکہ بہت دنوں سے انھوں نے کوئی خط نہیں لکھا۔لہٰذا گزارش ہے کہ مجھ کو مفصل جواب نہ لکھنے کی معافی دی جائے۔ بدقسمتی سے احادیث اور روایات جو شیعہ سنّی بیان فرماتے ہیں ان میں سے بہتوں کو میں غلط جانتا ہوں۔ دل کو پوری طرح یقین ہے کہ انسان مرکب من الخطا والنسیان کا ثبوت بعد رحلت رسول صلعم ویسا ہی ملا جیسا آج ملتا ہے۔ آدمی کی فطرت تب بھی ایسی ہی تھی۔ ذاتی اغراض تب شاید زیادہ شامل رہے ہوں۔ مثلاً جو باتیں میں نے لکھی ہیں جہاں شیعہ سنی احادیث سے مجھ کو اختلاف ہے ان کا ایک ذخیرہ میرے دل میں بھرا ہے۔ صرف اپنے خیالات ظاہر کرنے کے لیے دو دو ایک ایک مثالیں لکھ دی ہیں تاکہ ضرورت سے زیادہ دل نہ دکھاؤں۔ بحث میں بڑی گنجائش ہے۔ منطق مسلمانوں کا علم نہیں۔ یونان سے آیا۔ منطق کے صحیح ہونے کا سوال نہیں کیونکہ عقل سلیم صحیح ہونے کا سوال نہیں۔ لیکن مغالطوں میں پڑ جانے کا سوال ہے۔ آپ نے ایک جگہ یا لیتنی کی مثال ایاك نعبد و ایاك نستعین سے دی تھی۔ میرے دل میں یہ تشبیہ تشفی بخش نہیں۔ نماز میں جب آپ ایاك نعبد و ایاك نستعین کہتے ہیں جذبات کے تحت میں نہیں کہتے بلکہ ritualistic انداز میں کہتے

ہیں۔ مجالس میں صرف وہی شخص یالیتنی کہتا ہے جو وقتی جذبات سے اوروں سے زیادہ متاثر ہوگیا ہے کیونکہ سب نہیں کہتے۔ ان دونوں حالتوں میں بڑا فرق ہے۔ جب شیعہ شیطان پر لعنت کرتا ہے تو شیطان کے غیر جنس ہونے کی وجہ سے دل میں ایک دوسری طرح کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور جب کسی تاریخی انسان پر لعنت کرتا ہے تو دوسری طرح کی کیفیت دل میں آتی ہے۔ یہ خود میرا تجربہ ہے۔ میں اس معاملے میں دوسرے کے تجربے پر کیسے کاربند ہوسکتا ہوں۔ اسی طرح کی مثالیں اور بھی ہیں۔ لہٰذا بہتر ہے کہ باوجود اختلاف کے ہم لوگ بلابحث کے ایک دوسرے کے بہی خواہ رہیں۔ ادھر دو تین خطوط میں باوجود میرے تردد کے آپ نے بیگم صاحبہ کی مزاجی کیفیت کا حال بالکل نہیں لکھا۔ ڈرتا ہوں بحثا بحثی میں دل میں کہیں بال نہ پڑ گیا ہو۔ اگر خدانخواستہ ایسا ہوا تو تھوڑے دن کی زندگی جو باقی ہے اس میں یہ داغ رہے گا۔

کیا غرض لاکھ خدائی میں ہوں دولت والے
ان کا بندہ ہوں جو بندے ہیں محبت والے

خدا کرے کہ بیگم صاحبہ کا مزاج اچھا ہو۔ آمین!

دعا گو

محمد علی عفی عنہ

---

(۲۰۴)

ڈپٹی صاحب کے نام

مکرمی۔ تسلیم۔

شوقِ دیدار دولتِ ہم کلامی کے بعد آنکہ گزشتہ عرس کے موقع پر جب آپ انتظاماً ردولی تشریف لائے تھے اس وقت مجھ کو معلوم ہوا تھا کہ آپ ماشاء اللہ شاعر بھی ہیں۔ گو مجھ سے آج تک ایک شعر بھی موزوں نہیں ہوا ہے۔ لیکن نثر کچھ کچھ لکھ لیتا ہوں اور اسی وجہ سے ''جہاں روکھ نہیں وہاں ارنڈ روکھ۔'' ردولی میں اردو ادب سے نسبت بھی دی جاتی ہے۔ چونکہ آپ حاکم تحصیل اور ہم رعایائے تحصیل۔ دل دھک سے ہوگیا کہ محمد علی ڈپٹی صاحب کی شاعری سے دنیا بچ نکلے۔ مگر تم بچتے دکھائی نہیں دیتے چونکہ اس طرح کے مواقع اکثر آچکے ہیں اس لیے جی مضبوط کر لیا کہ پریشان ہونے سے کوئی فائدہ نہیں جیسی پڑے گی جھیل لیں گے۔ ع

برسرِ فرزندِ آدم ہرچہ آید بگذرد

دوسرا غضب یہ ہوا کہ آپ نے اپنا دیوان میرے عزیز بھائی غلام مصطفیٰ صاحب شاعر بے بدل پنشنر تھانے دار کو عنایت کیا۔ موصوف نے تعریف بھی کی مگر دیوان دیکھ کر دل کی کلی کھل گئی۔ انشراحِ قلب ہوا، اس طرح کی فرحت ہوئی جیسے لکھنؤ کے بناری باغ میں صبح کی مستی میں کسی شائستہ متوازن، مقتصد۔ خوش مذاق شریف مرد سے پہلے پہل ملاقات ہو جائے۔ اور دل فوراً یہ کہہ اٹھے کہ کہیں دیکھا ہے۔ پہلی ملاقات شاید میدانِ ازل میں ہوئی ہو جہاں ہم مذاق لوگوں کی ٹولیاں الگ الگ رہی ہوں گی۔

نئی شاعری نے ایسی بلند پروازیاں کی ہیں کہ اُن کو سن کر ہم دقیانوسی لوگوں کے حواس اڑ جاتے ہیں۔ اسی حالت میں حدود کے اندر والی شاعری اگر کہیں دکھائی دے جاتی ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے بچھڑے مل گئے۔ میں نے آپ کا دیوان صرف دو چار لمحوں

کے لیے دیکھا۔ میرے دل پر بڑا اچھا اثر ہوا۔ ہر جگہ جدت کوئی نہیں کرسکتا۔ لیکن جو بات کہی جائے وہ سلیقے سے کہی جائے شعر میں دل کا درد ہو، صداقت ہو۔ دل سے محسوس کر کے کہا گیا ہو۔ بیان میں سادگی ہو، الجھن نہ ہو، تعقید نہ ہو، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آدمی خدا کے یہاں سے بندش کا سلیقہ لے کر آیا ہو۔ ماشاء اللہ آپ کی شاعری میں یہ تمام باتیں موجود ہیں۔ اسی وجہ سے دل چاہتا تھا کہ ایک نسخہ جناب کے دیوان کا میرے پاس بھی ہوتا۔ زمینداری جانے کے بعد سب سے زیادہ ضرورت تو پیسوں کی ہے لیکن روح کی بھی غذا کچھ حکم رکھتی ہے۔ گویا ہاتھ کی تنگی دل کی بھی تنگی سے سخت ہے لیکن پھر بھی فرحتِ قلب سے لحظہ بھر کے لیے آرام مل جاتا ہے۔ دو کتابوں کا ہدیہ پیش کرتا ہوں۔ ان کی قیمت آپ کے دیوان سے کم ہے غریب وہی دے سکتا ہے جو اس کے پاس ہے۔

محمد علی عفی عنہ

ردولی

(غالب کے بعد) ''خطوط نگاری ادب کی ایک مستقل صنف اور اردو ادب کی تاریخ کا ایک مستقل باب بن گئی ہے۔ اس میں انداز اور موضوعات کی بڑی بوقلمونی ملے گی۔ تاریخ اور تحقیق کے سلسلے میں ادیبوں کے خطوط کا وہ ذخیرہ جو اب تک منظر عام تک آیا ہے ایک گراں قدر سرمایہ ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ غالبؔ کے بعد نجی خطوط میں تحریر کی دل آویزی اور لطف مطالعہ جو چودھری محمد علی ردولوی کے خط میں ملتا ہے وہ کہیں اور نہیں ملتا...''

(شان الحق حقی ''گویا دبستاں کھل گیا'' دوسرا ایڈیشن)

(۲۰۵)

عباس ہاشمی کے نام

نور چشم عباس سلمہٗ۔ بے انتہا دعائیں تم کو اور اس لڑکی کو جو انشاء اللہ تعالیٰ دنیا میں تمھارے ساتھ ساتھ رہ کر ہر کام میں ہاتھ بٹائے گی اور اس دنیا میں خود بھی سرخرو ہو جائے گی اور تم کو بھی سرخرو کرے گی۔ بار الٰہا دنیا کی تمام مسرتیں اِن دونوں کو نصیب کر اور پھلنے پھولنے اور آباد ہونے کی وہ خوشیاں نصیب کر جو اس دنیا میں انسان کو خوش نصیب بناتی ہیں۔ اور بہت دنوں کے بعد بڑھاپا جھیلنے کے پیچھے اپنے بنانے والے کے سامنے اس طرح پہنچاتی ہیں کہ چہاردہ معصومین صلوٰۃ اللہ علیہم کی شفاعت کی وجہ سے یہ دونوں شرمندہ نہ ہوں۔

میرے خیال میں مبارک اور مستحسن ایسی ہی شادیاں ہوتی ہیں جن میں ایک دوسرے کی اخلاقی خوبیوں کا سکہ دونوں کے دلوں پر بیٹھا ہو اور جس میں اتنے حواس باقی ہوں کہ بزرگوں سے مشورہ لے لیا جائے اور صرف سنیما محرک نہ ٹھہرے ہر انسان خدا کے یہاں سے خوبصورتی کی نعمت لاتا ہے۔ مگر وہ خوبصورتی وہ ہے جو صرف روح دیکھتی ہے، اور ہر انسان آدم و حوّا کا شریف خون رگوں میں رکھتا ہے جو فرضی شجروں میں نہیں دکھائی دیتا ہے۔ میراثِ پدر خواہی۔ علمِ پدر آموز

یہ شرافت نہیں ہے کہ چالیس پشتوں کے ڈال کے ٹوٹے سید تو ہیں مگر ڈاکٹر خون کے امتحان میں +++ بناتا ہے۔

عباس میری دلی دعائیں اس لڑکی تک اب پہنچاؤ یا جب وہ شُبھ گھڑی آوے تب پہنچاؤ مگر اِتنے کہہ دینا کہ از دل خیزد۔ بردل ریزد۔ بی بی یہ دعا دل کی تہہ سے نکلی ہے، لہٰذا انشاء اللہ تعالیٰ درِ اجابت کے اِدھر رُکتی نہیں۔ آج آخری روزہ ہے اور کل عید ہے۔ تم لوگوں کو دوہری عید کی مبارک باد۔

دعا گو

محمد علی عفی عنہ

ضیا کے نام

یار ضیا! خدا تم کو خوش رکھے وطول عمر عطا کرے۔ اقبال بلند کرے۔ آمین ثم آمین!
یوں تو ہم تم کو اور تمھارے باپ کو دن میں دو دو تین تین بار خط لکھا کرتے ہیں۔ مگر اول تو اتنا کاغذ، اتنے لفافے اور اتنے ٹکٹ کے پیسے کہاں سے آویں۔ اور تمھارے ماں باپ میں اتنے خطوط پڑھنے کا تحمل کہاں سے آوے۔ دوسری بات یہ کہ تمھاری خیریت قریب قریب روز معلوم ہوجاتی ہے۔ اس لیے میری کوتاہ قلمی کا معقول عذر میرے پاس ہے۔ کل تمھاری ماں کا خط تمھاری قیصر دادی کے نام آیا تو دل چاہا کہ تم سے کچھ باتیں کرلوں۔ بیٹے تم ہم کو کیا جانو مگر ہم تم کو اچھی طرح سے جانتے ہیں۔ بقول شخصے تمھارے رگ پٹھوں سے واقف ہیں۔ اگر تم ہمارا یہ خط دس بارہ برس رکھے رہوگے تو کچھ اندازہ ہمارا معلوم ہوجائے گا۔ تمھارے باپ کے پاس ایک تصویر ہے جس میں ایک جوان عورت، جس میں ایک بڈھے کی تصویر ساتھ ساتھ ہے۔ عورت اپنی جوانی کے گھمنڈ میں متانت و خودداری سے بیٹھی ہے اور مرد اپنے بڑھاپے پر کھسیانی ہنسی ہنس رہا ہے۔ یہ عورت تمھاری دادی قیصر جہاں بیگم صاحبہ ہیں۔ اور یہ بڈھا تمھارا محمد علی شاہ فقیر ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا اگر تم اس کارڈ کو دس برس جگوئے رہوگے اور اس تصویر اور اس کارڈ کو ساتھ ساتھ دیکھوگے اور خوب ہنسوگے تو تم ہم کو پہچان جاؤ گے۔ دس برس میں تمھاری قیصر دادی ویسی ہی جوان دکھائی دیں گی ہم شاید کچھ اور بڈھے دکھائی دیں گے مگر تم پہچان لوگے۔ اگر زمانہ نے تفرقہ نہ ڈال دیا ہوتا تو اس تصویر کے دیکھنے کی ضرورت نہ ہوتی، نہ اس خط کے محفوظ رکھنے کی۔ مگر خیر ہوگا تم ان باتوں پر دھیان مت دو تم دادادادا کہنے کی مشق کرو۔ خدا چاہے گا سب ٹھیک ہوجائے گا۔

اور ہاں بیٹے ہم نے سنا ہے کہ تم نے نئی گاڑی خریدی ہے۔ اللہ مبارک کرے۔ اگر وہ گاڑی یہاں ہوتی تو اس پر ایک دن تمھاری دونوں دادیاں اور ہم سیر کو جاتے۔ مگر اب

اتنی دور کہاں پہنچ سکتے ہیں۔ اگر ہم تینوں آدمیوں کو اس گاڑی پر چڑھنے کا موقع مل جاتا تو ہم بہت خوش ہوتے مگر تمھاری ماں تمھارے باپ سے شکایت کرتیں کہ گاڑی تو مول لی گئی تھی ضیا کے واسطے اور اس پر چڑھے چڑھے پھرتے ہیں یہ تینوں آدمی۔ بھلا یہ رہے گی کہ ٹوٹے گی۔ تمھارے باپ کہتے کچھ کہو نہیں، جانے دو ٹوٹ جائے گی تو اور منگوالیں گے۔ بڑوں کا جی چھوٹا مت کرو۔

ہاں بیٹے اپنے باپ سے کہہ دینا کہ میں نے ہما کو خط بھیجے تھے مگر وہ کراچی میں تھیں۔ نہیں معلوم ان کو ملے یا نہیں۔ ہما سے کہہ دیں گے کہ مجھ کو خط لکھیں اور تجھے بھی سب کا حال لکھیں۔

دعا گو

تمھارا دادا

---

(۲۰۷)

منصور میاں کے نام

عزیزی منصور میاں! دامت اشفاقکم۔ دعا۔ خلوص کی پُرسش پر تہہ دل سے شکریہ۔ آپ کا سلامِ محبت یارانِ ہمنشیں کو پہنچا دیا میں خود زندہ ہوں اور چلا جاتا ہوں، کب تک چلا جاؤں گا اور کب چلا جاؤں گا اس کا حال مفصل نہیں معلوم۔ اس بارے میں ہم خود اور احباب سب رائے قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر ''معلوم نہ گشت و قصہ کوتاہ نہ شد'' یارانِ صحبت آپ کی یاد سے فارغ نہیں ہیں۔ آپ کی جگہ جلسے میں اب بھی غیرآباد ہے۔ گومیاں مسیٰ اس پر بیٹھتے ہیں مگر لوگ زبانِ حال سے کہتے ہیں ''آدمی گم شد و کرسی اوخر گرفت'' میں خود دن بھر کتابیں پڑھ کر وقت کشی کرتا ہوں اور شام کو اظہارِ قابلیت کے لیے بکواس کرتا ہوں۔ میاں بدرل زبانِ حال سے فرماتے ہیں ''ہم پہلے ہی سے جانتے ہیں'' میاں سہیل(82) کہتے ہیں ''باتیں دلچسپ ہوں کہ غیر دلچسپ سن رہا ہوں کہ نئی اور چیدہ ہوں۔'' وقت کٹنے سے مطلب ہے جس وقت کوئی نیا موضوع شروع ہوتا ہے اور اسی جگہ ٹھپ ہو جاتا ہے، اس وقت آپ کی یاد ستاتی ہے کہ نہ ہوئے میاں منصور نہیں تو بات میں بات نکلتی۔ شعبہ سے شعبہ پیدا ہوتا۔ گوشے سے گوشہ ملتا اور کلام سے نیا زاویۂ خیال دکھائی دیتا۔

جستجو ہم کو آدمی کی ہے
وہ کتابیں عبث منگاتے ہیں

تفریحِ قلوبِ مومنین کے لیے دو ایک باتیں مختصراً عرض ہیں:

بنگال میں بڈھے ماں باپ جنگل میں ڈال دیے جاتے تھے کہ جانور ان کو کھائیں اور جھگڑا پاک ہو۔ یہ 1838 تک ہوتا تھا۔ (ازالفنسٹن) اڑیسہ میں کھونڈ قوم آدمیوں کی قربانی اس واسطے کرتے تھے کہ ان کی بوٹیاں کھیت میں ڈالی جائیں تا کہ پیداوار زیادہ ہو۔

زندہ آدمی، لکڑی کا ہاتھی بنا کر اس کی سونڈ میں باندھ کر گھمایا جاتا تھا اور زندہ آدمی کی بوٹیاں ہر شخص کاٹتا تھا۔ یہ قصہ 1854 تک ہوتا تھا اور لی وارنر نے لکھا ہے کہ 1904 تک چوری چھپے ہوتا تھا۔ (از تاریخ ونسنٹ اسمتھ) شملہ کے اندر پہاڑوں میں آدمی کو خوب کھلاتے پلاتے اور روپیہ دیتے تھے۔ اس کے بعد پہاڑ کی چوٹی سے دورستوں کے ذریعے سے وہ گھاٹی میں اترنے کی کوشش کرتا تھا اور اکثر مرجاتا تھا۔ (بیان ایک رانی صاحبہ جن کے یہاں یہ ہوتا تھا۔)

دعا گو

محمد علی عفی عنہ

'ان کے خطوط کی دل چسپی غالب کے خطوط کی طرح علمی اور تاریخی افادیت کے علاوہ ان کے خلوص نگارش اور لطافت اظہار پر قائم ہے۔"

(شان الحق حقی۔ "گویا دبستاں کھل گیا۔" دوسرا ایڈیشن)

(۲۰۸)

راجہ صاحب سلیم پور کے نام

مائی ڈیئر راجہ صاحب۔ دعائے شوق، معلوم نہیں کب سے ملاقات نہیں ہوئی، نہ معلوم کیوں مگر آپ کے دیکھنے کو بہت دل چاہتا ہے۔ مواقع اتنے کم رہ گئے ہیں اور میرا سن اتنا زیادہ ہوگیا ہے کہ اگر دید کی صورت نہ بندھے اور میرا رخت سفر بندھ جائے تو تعجب نہیں۔ روپیہ اتنا کم رہ گیا ہے کہ جب تک اشد ضرورت نہ آن پڑے لکھنؤ جانے کا رعب نہیں پڑتا۔ اگر لکھنؤ آگیا تو کار پر سلیم پور پہنچ جانا سہل ہے کار بھی اسی وقت تک ہے جب تک کوئی خریدار نہیں ملتا۔ خریداروں کا یقیناً یہ حال ہوگیا ہے کہ

"سب گھٹا دیتے ہیں مفلس کے غرض مال کا مول"

خیر کوئی ہرج نہیں۔ اس وقت تک نہ کھانے کی تکلیف ہوئی ہے نہ ضروریاتِ زندگی کی۔ البتہ غرور بری طرح ٹوٹ رہا ہے جس پر باوجود عقل کے نیک مشوروں کے نفس اس وقت تک راضی نہیں ہوا ہے۔ ہزار سمجھاتے ہیں کہ اتنی اراضی، اتنا مال تجھ کو تنہا رکھنے کا کیا حق تھا۔ مگر نفس کسی طرح راضی نہیں ہورہا ہے۔ نفس کہتا ہے یہ تو درست ہے مگر جن لوگوں کے ہاتھ میں ملک کا انتظام ہے وہ الو کے پٹھے ہیں، ان سے سوائے کام بگڑنے کا بنے گا کیسے۔ ہم دل کو سمجھاتے ہیں کہ گھبراؤ نہیں، دیکھو کیا ہوتا ہے۔ جس قدر رہ گیا ہے اس پر اللہ کا شکر بھیجو۔ تمہارے اعمال تو اس قابل بھی نہ تھے۔ اس جگہ تو ہم بھی قائل ہوجاتے ہیں اور سوائے شکراً عفواً عفواً کے کچھ نہیں کہہ سکتے۔

دو کتابیں ارسال ہیں "میرا مذہب" سے آپ پریشان ہوں گے۔ جب بہت غصہ چڑھے تو دوسری کتاب شروع کردیجیے گا۔ شاید غصہ کم ہوجائے۔

دعا گو

محمد علی عفی عنہ

مکرر آنکہ خط ختم کر چکا مگر ابھی اور لکھنے کو دل چاہتا ہے۔ ہمارے آپ کے پہلے زمانے والے مرحوم تھے کہ وہ انگریزی راج بلکہ کوئن وکٹوریہ کے وقت میں پیدا بھی ہوئے اور چلے بھی گئے۔ ہم نے کئی انگریزی بادشاہ دیکھے، ہندستان دیکھا، پاکستان دیکھا، گاندھی کو دیکھا، جناح رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا، اپنے ملک کی بہیمیت دیکھی، دو دو جنگیں عظیم دیکھیں، دنیا کو تباہی میں پڑتے دیکھا اور ہم لوگ اودھ والے محفوظ رہے۔ زمانے کی گردش نے تھوڑا بہت جھٹکا ہم کو بھی دے دیا۔ تب بھی جو کچھ ہو ''ہیروشیما'' میں جو ہوا جو ۱۹۴۷ میں امرتسر اور لاہور میں ہوا اُس سے تو اچھے ہی رہے۔ فالحمدللہ رب العالمین!

محمد علی عفی عنہ

نیاز صاحب فتح پوری کے نام

کرم فرمایم۔ اس طرف لکھنؤ پہنچنے کی امید تو کم ہے۔ وجہ یہ ہے کہ پہلی جولائی کو پالیٹکس کے اسرافیل۔ کانگریس کے دھوتو بیک پنتھ صاحب اپنا نرسنگھا یعنی زمینداری کی موت کا صور پھونکیں گے اس دن بچے زمیندار بوڑھے ہوجائیں گے۔ زمینداریوں کے محل گر جائیں گے۔ اور زمینداروں کے بہی کھاتے ہوا میں روئی کے گالوں کی طرح اڑتے پھریں گے۔ اس رستخیز عظیم کے دھڑکے میں کچھ نہ کچھ مصروفیت بڑھ ہی گئی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ کے تشریف لانے کی خوشی میں اگر کوئی ضرورت لکھنؤ کی ہوتی بھی تو ملتوی کر دی جاتی، کیونکہ نیاز صاحب روز روز ردولی نہیں آیا کرتے۔ رہا تعارفی خطوط کا معاملہ اس کے لیے قول وقلم سے ہر وقت دست و زبان حاضر ہیں۔ اکثر خطوط اس طرح کے لکھنے پڑتے ہیں۔ ان کے لیے خاص سیاق ایجاد کیا ہے۔ ایک تھانے دار صاحب نے اپنے سپرنٹنڈنٹ کی شکایتیں بیان کرکے خط لکھوانا چاہا تھا۔ ان کو سراج الدین احمد صاحب ڈی آئی جی الہٰ آباد کے نام خط لکھ دیا جو کامیاب ہوا۔ بہرحال جس طرح کے تعارفی خطوط فرمایئے گا انشاء اللہ تعالیٰ لکھے جائیں گے۔ اور پھر بھی یہ آرزو باقی رہے گی کہ کاش اس سے زیادہ کوئی خدمت کرسکتا۔

محمد علی عفی عنہ

---

(۲۱۰)

للّن صاحب کے نام

میرے کرم فرما۔ دعائے عمر و دولتِ ایمان و ثروتِ دنیا اور اگر ممکن ہو تو تھوڑا سا عود شباب کے بعد عرض ہے کہ محبت نامہ بہت دن ہوئے آیا تھا۔ آپ کی بیگم صاحبہ لکھنؤ میں تشریف فرما تھیں اس لیے جواب نہیں لکھا تھا کہ خالی میرے خط کی کیا قدر ہوگی۔

شنیدم کہ در روز امید و بیم
بداں را بہ نیکاں بہ بخشد کریم

اگر اسی لفافے میں دونوں خطوط ہوں گے تو ہمارا خط بھی نگاہ پر چڑھے گا ع

اے گل بتو خورسندم تو بوئے کسے داری

اب الحمدللہ موصوفہ تشریف لے آئی ہیں۔ یہ خط لکھ کر موصوفہ کے پاس بھیجے دیتا ہوں کہ وہ اپنا خط رکھ کر لفافہ بند کردیں۔ انھوں نے اپنا خط مجھ کو بھیج دیا تھا۔ میں نے یہ کہہ کر واپس کردیا کہ اس کو ضائع کردیں اور دوسرا خط میاں بی بی والا رکھ کر لفافہ بند کرکے آدمی کو دے دیں کہ ڈاک میں ڈال دے۔ میرا حال حسب حال ہے ۔

خیام کہ خمہائے حکمت می دوخت
در کوزۂ غم فتاد و ناگاہ بسوخت
مقراض اجل طناب مرگش ببرید
دلاّل قضا بہ رائگانش بفروخت

تیسرے مصرعے میں بجائے عمرش کے مرگش کردیا ہے۔ یعنی سب حال وہی ہے، صرف فرق اتنا ہے کہ بقول بہرور قلی کے زندہ ام مگر مردہ مردہ ام مگر زندہ کیا کہیں للّن صاحب ۔

نہ مرا دولت دنیا نہ مرا اجر جمیل
نہ چو نمرود توانا نہ شکیبا چو خلیل

اگر آپ کے آقائے ولی نعمت کی طرح حضرت ابراہیم کی راہ پر نہ چل سکتے تھے تو نمرود ہی کا اندازہ ہوتا مگر یہاں تو دونوں حالتوں سے بیگانہ ہیں۔ زندگی کٹ رہی ہے اور ہم اس شرم میں کٹے جارہے ہیں کہ پھر بھی زندہ ہیں۔ اس بے حیائی کو دانت سے پکڑے ہیں۔

میری طرف سے راجہ صاحب ضاعف اللہ ہمتہ و اقبالہ کو دعا کہیے گا۔ میاں بدرل، میاں آفاق سب لوگ آپ کو تسلیم کہتے ہیں۔

للّن صاحب سے معلوم نہیں کہ اس جنم میں ملاقات ہوگی یا صرف فردائے قیامت کی آس رہے گی۔

خیر خدا آپ کو بہ امن خوش رکھے۔ آپ کی بیگم صاحبہ کا مزاج کچھ پھر نادرست ہو گیا ہے۔ وہی پرانی شکایت ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ جلد شفایاب ہوں گی کیونکہ نہ بیماری نئی ہے نہ خدانخواستہ سخت ہے۔ عید مبارک باد۔ روز عید شنبہ 7/جولائی 1951

دعا گو

محمد علی عفی عنہ

اُن چند لوگوں کا تعارف جن کا ذِکر خطوں میں ہے

1۔ علّن (الّن) : (1996-1905): چودھری صاحب کی تیسری بیٹی، اصل نام زہرا تھا۔ شادی غضنفر علی نقوی سے ہوئی تھی۔ نقوی صاحب پولیس سروس میں اعلیٰ عہدوں پر رہے۔

2۔ بُوبُو : چودھری صاحب کی پہلی بیوی۔ اصلی نام عابدہ بیگم۔ کجن، الّن، چھبّن، ہما، سلمان اور جابر کی والدہ۔ انتقال ۲۱ جولائی ۱۹۲۹، بروز یکشنبہ مطابق ۱۳ صفر ۱۳۴۸ھ۔ اپنے خاندان کی مسجد محلّہ قضیانہ میں تدفین ہوئی۔

3۔ غضنفر علی نقوی : (1954-1902) : عرفیت لڈّن تھی۔ چودھری صاحب کے داماد، زہرا عرف الّن (علّن) کے شوہر، تقسیم ملک سے پہلے انڈین پولیس میں تھے۔ کئی برس تہران میں برطانوی سفارت خانے میں ہندوستانی امور کے اتاشی رہے۔

4۔ سلمان احمد علی : (1998-1913) : چودھری صاحب کے بڑے بیٹے۔ لڑکیوں سے چھوٹے۔ ابتدائی تعلیم ردولی میں ہوئی۔ پھر لکھنؤ میں پڑھتے رہے۔ اعلیٰ تعلیم آکسفورڈ میں حاصل کی۔ پاکستان میں فارن سروس میں رہے۔ ماسکو اور لندن میں پاکستان کے سفیر بھی رہے۔

5۔ تفضّل رسول : چودھری محمد علی کے برادر نسبتی۔ بڑی وجیہہ شخصیت کے مالک تھے، گورا چٹّا رنگ، خوش پوشاک، جامہ زیب، مجسم تہذیب۔

6۔ صفیہ : (1981-1903) : چودھری صاحب کی منجھلی بیٹی۔ اصلی نام صفیہ بیگم تھا۔ چھبن عرفیت تھی۔ ان کی شادی چودھری صاحب کی بہن سکینہ بیگم کے صاحبزادے سبط احمد (1979-1902) سے ہوئی تھی۔

7۔ طلعت : صفیہ بیگم عرف چھبّن اور سبط احمد کی بیٹی۔

8۔ جادی : چودھری صاحب کی ملازمہ۔ ان کے لڑکوں سلمان اور جابر کی انّا۔

9۔ ستارن: صفیہ بیگم کی بیٹی طلعت کی لتا۔

10۔ آپا: چودھری صاحب کی والدہ۔ جنھیں چودھری صاحب آپا کہتے تھے۔

11۔ آل رضا: چودھری صاحب کی بیٹی فاطمہ بیگم عرف گُجن کے شوہر کاظم رضا کے بڑے بھائی تھے۔ شعر بھی کہتے تھے۔ رضا تخلص تھا۔

12۔ ہما بیگم : (25.8.1907-14Nov.2002) : چودھری صاحب کی سب سے چھوٹی صاحبزادی۔ الموڑہ (ہندوستان) میں پیدا ہوئیں۔ ہمالیہ اور اس کی برف پوش پہاڑیوں کی نسبت سے چودھری صاحب نے ہما نام رکھ دیا۔ اصلی نام رقیہ بیگم تھا۔ چودھری صاحب کے خطوں کی اشاعت ہما بیگم کی دل چسپی اور کوششوں ہی کا نتیجہ ہے۔ بیگم صاحبہ کو علمی و ادبی کاموں سے ایک فطری لگاؤ تھا۔ جدید ترین تعلیم پانے کے باوجود دین داری کے ذوق کے ساتھ تبلیغ دین کا بھی شوق تھا۔ انھوں نے ''بھولی ہوئی باتیں'' نام سے ایک کتاب لکھی ہے جس میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا وہ جذبہ کارفرما ہے جس کو امت مسلمہ کی اکثریت بھلا چکی ہے۔ ایک اور کتاب ''خوش آں ہوائے گز یاد خوش آمدید'' یادداشتیں انسانی زندگی میں دھنک کی طرح کئی قسم کی رنگ آمیزیاں کر دیتی ہیں۔ ہما بیگم کی اس کتاب کو اسی زمرے میں سمجھ لیجیے۔ ایک تیسری اور خاصی ضخیم کتاب ''جوئبار'' ہے۔ یہ متعدد شعرا کے کلام کا انتخاب ہے۔ یہ ان کی وہ علمی و ادبی اور مذہبی تخلیقات ہیں جن کا مجھے علم ہے۔ ایک زمانے میں انھوں نے قرآن کریم کا ترجمہ بھی شروع کیا تھا۔

13۔ گُجن : (1902-1972) چودھری صاحب کی بڑی بیٹی۔ نام فاطمہ بیگم تھا، گجن عرفیت تھی۔ کرامت حسین گرلز اسکول کی طالبات کی پہلی ٹولی میں تھیں۔ سید کاظم رضا (1898-1968) آئی جی پولیس کو بیاہی تھیں کاظم رضا صاحب انڈین پولیس سروس میں پہلے ہندوستانی افسر تھے۔ 1947 میں پاکستان جانے کے بعد کراچی میں بڑے عہدوں پر رہے۔

14۔ جابر : (-1917) لطف علی جابر، چودھری صاحب کے چھوٹے بیٹے، کہتے ہیں کہ بچپن

میں کسی دوا کی غلط فہمی میں مٹی کا تیل پی لیا تھا۔ اس کے بعد سے ذہنی طور پر بہت کمزور ہو گئے۔ پڑھنے لکھنے کے قابل نہیں رہے۔ شادی بھی نہیں ہوئی۔ باغ و بہار آدمی تھے۔ دوسروں کے کام آنا عادت تھی۔ محرم کے مہینے میں بہت مصروف رہتے تھے۔

15۔ حیدری: خاندان کی میراثن تھی اور چودھری صاحب کی لڑکیوں کی سہیلی بھی۔

16۔ حسین باندی: ردولی کی ایک میراثن۔

17۔ مٹھو: اصلی نام مجھے معلوم نہیں۔ چودھری صاحب کا خاص ملازم۔ معتمد اور رازدار۔

18۔ شمسُل: چودھری صاحب کے معتمد خدمت گار مٹھو کی دوسری بیوی۔

19۔ عصمت: چودھری صاحب کے بھانجے حسن احمد کی لڑکی۔ کم عمری میں آگ سے جل جانے کی وجہ سے انتقال ہو گیا۔

20۔ خاتون: اویس قرنی کی ماں چودھری صاحب کے بھانجے حسن احمد کی بیوی۔

21۔ حسن احمد (1943-1890) چودھری صاحب کی بہن سکینہ بیگم کے بڑے بیٹے۔

22۔ لچھو: چودھری صاحب کے داماد اخلاق حسین کی بہن

23۔ موتی جان: ایک تائب طوائف تھی، اسے چودھری صاحب نے محلے ہی میں ایک گھر رہنے کے لیے دے دیا تھا اس کی کفالت بھی چودھری صاحب ہی کرتے تھے۔ موتی جان نے آخری عمر عبادت و ریاضت میں گزاری۔

24۔ دولھنیا: انیس سو بیس کی دہائی میں ایک قحط کے دوران ایک عورت اپنے دو لڑکوں کو چودھری صاحب کے یہاں چھوڑ گئی تھی۔ چودھری صاحب کی پہلی بیوی عابدہ خاتون نے ان دونوں کی پرورش کی۔ ان کے نام انور اور منصور رکھے۔ انور کی بیوی کی حیثیت چونکہ بہو کی سی تھی اس لیے اسے دولھنیا پکارا جاتا تھا اور منور کی بیوی سدن کو سدنیا۔

25۔ سدن: سدنیا کہلاتی تھی۔ دولھنیا کے دیور منور کی بیوی تھی۔

26۔ للو : نام شبیر احمد تھا اور عرفیت للو۔ 1904 میں پیدا ہوئے۔ چودھری صاحب کی بہن سکینہ بیگم کے تیسرے بیٹے۔

27۔ عظمت رسول چودھری۔ چودھری صاحب کے برادر نسبتی۔ چودھری صاحب کے قائم کیے ہوئے جس لیڈر اسکول کا ذکر دیباچے میں ہے اس کی نگرانی کی ذمہ داریاں بھی بہت دن سنبھالیں۔

28۔ نصیرا : چودھری صاحب کی بہن سکینہ بیگم کی دائی کے لڑکے رسول کی دوسری بیوی۔ چودھری صاحب نے ان لوگوں کو بھی محلے ہی میں رہنے کے لیے ایک مکان دیا تھا۔

29۔ سید اخلاق حسین : (1902-81) ہما بیگم کے شوہر۔ ممتاز بیرسٹر۔ ہائی کورٹ کے جج بھی رہے۔

30۔ کاظم رضا : چودھری صاحب کے بڑے داماد۔ سید رضا صاحب مرحوم کے صاحبزادے۔ فن موسیقی سے بڑا لگاؤ تھا جس ''متوارے نین'' گانے کا ذکر چودھری صاحب کے ایک خط میں ہے۔ اس کے بول ان ہی کاظم صاحب کے ہیں۔ اس گانے کے وجود میں آنے کا ایک قصہ ہما بیگم نے لکھا ہے۔ ''ایک روز لکھنؤ میں گھر میں برج کا کھیل ہو رہا تھا۔ سید اخلاق حسین جج کے گھر پر محفل جمی ہوئی تھی۔ (اخلاق حسین ہما بیگم کے شوہر کاظم رضا کے ہم زلف بھی تھے اور دوست بھی)۔ محفل میں سب گھر کے لوگ تھے البتہ ایک بیگم صاحبہ جو ان دنوں حیدرآباد سے تشریف لائی تھیں وہ بھی کھیل میں شریک تھیں۔ خاتون انتہائی حسین اور بڑی پڑھی لکھی تھیں۔ مجمع بھی دل چسپ تھا اور کھیل بھی شباب پر تھا۔ رات کے گیارہ بجے، بارہ بجے یہاں تک کہ دو بج گئے۔ نیند کا وقت۔ اوروں کا حال تو ٹھیک تھا مگر اِن بیگم صاحبہ کی بڑی بڑی حسین آنکھوں میں ہلکی ہلکی سرخی آچکی تھی اور آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگی تھیں۔ پانوں کا مسلسل دور ہونٹوں پر دھڑی جما چکا تھا۔ اس منظر کو دیکھ کر کاظم رضا صاحب پر بیت گئی۔ کیفیت یہ ہوئی کہ اسی وقت ''متوارے نینوا'' برجستہ کہہ ڈالا۔ بعد کو اسی کو راگ کھماج میں خود ہی باندھا۔ جس کی داد چودھری

صاحب نے اپنے خط میں دی ہے۔ پورا گانا یوں ہے:

متوارے نین والے، مدھ نین کا ہے مارے — متوارے......

موہ لیہن چھب دکھلائے کے، چین پڑت نہیں پیارے — متوارے

کسکت رہت، پران ناہیں نکست — شیام کمن تھک بارے — متوارے۔

31۔ نزہت: بادشاہ میراثی کی لڑکی۔ گانے کا بہت شوق تھا۔ موسیقی کی اچھی خاصی تعلیم حاصل کی۔ بعد کو پاکستان چلی گئی۔ وہاں مشہور گانے والیوں میں شمار ہوا۔

32۔ قیصر: قیصر بیگم: پہلی بیوی کے انتقال کے بعد چودھری صاحب نے ان سے شادی کی۔ چودھری صاحب کی دوسری بیوی۔ اب چودھری صاحب کے خاندان کی بزرگ ترین خاتون ہیں اس وقت اپنے بیٹے سعید مصطفیٰ محمد علی کے ساتھ ردولی ہی میں رہتی ہیں۔

33۔ علی کاظم: ہما بیگم کے سب سے چھوٹے بیٹے۔

34۔ بدرل: ڈپٹی بدرل حسن۔ چودھری صاحب کے قریبی دوست۔ ردولی کے معززین میں سے ایک۔ یوپی کے مختلف اضلاع میں ڈپٹی کمشنر رہے۔ اسی نسبت سے عموماً ڈپٹی صاحب کہلائے۔

35۔ حسن عباس: چودھری صاحب کے رشتے میں بھتیجے تھے۔ اپنے وقت کے بہت مشہور حکیم تھے چودھری صاحب ان کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ حکیم صاحب یونانی گورنمنٹ ڈسپنسری کے انچارج تھے اس سلسلے میں وہ مختلف اضلاع میں رہے۔ حکیم حسن عباس پروفیسر شارب ردولوی کے والد تھے۔

36۔ سعید: پورا نام سعید مصطفیٰ محمد علی۔ چودھری صاحب کے بیٹے۔ علی گڑھ سے بی اے کی ڈگری حاصل۔ اب اپنی والدہ قیصر بیگم کے ساتھ ردولی میں سکونت ہے۔ چار اولادیں ہیں۔ ایک لڑکی اور تین لڑکے۔

37۔ سبط احمد : چودھری صاحب کی بہن سکینہ بیگم کے منجھلے بیٹے چودھری صاحب کی بیٹی صفیہ بیگم چھٹن ان ہی کو بیاہی تھیں۔ ان کے بیٹے ابوالفضل پاکستان میں ہے۔ وہاں وہ بڑے بڑے عہدوں پر رہے۔ کئی ملکوں میں پاکستان کے سفیر بھی رہے۔

38۔ جعفر مہدی : 1902 میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام مصطفیٰ علی تھا۔ مکان محلہ مخدوم زادہ (رودولی) میں آج بھی ہے۔ چونکہ آپ کا سلسلہ نسب حضرت شیخ العالم سے ملتا ہے اس لیے نام کے ساتھ شیخ کا اضافہ ہوا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر اور قصبے کے پرائمری اسکول میں ہوئی۔ بعد کو وثیقہ اسکول فیض آباد اور سلطان المدارس لکھنؤ میں عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ تھوڑی سی انگریزی اور ہندی گھر ہی پر پڑھی۔ والدہ کِنتور کے مشہور خاندان العلماء علامہ سید غلام حسنین اور مولانا سید حامد حسن سے تعلق رکھتی تھیں اسی رعایت سے نام کے ساتھ مولوی کا لفظ بھی شامل ہوگیا۔ اہل قصبہ عموماً مولوی صاحب ہی کہتے تھے۔ باہر کے لوگ رزمؔ ردولوی کے نام سے جانتے تھے۔ جعفر مہدی رزمؔ قومی پلیٹ فارم پر ایک سرگرم کارکن تھے۔ تمام قومی تحریکات میں حصہ لیتے رہے۔ اس سلسلے میں قید و بند کی سختیاں بھی جھیلیں۔ مزاج رئیسانہ تھا، بڑی آن بان سے رہتے تھے۔ سگریٹ اور حقے کے شوقین تھے۔ حقہ بڑے اہتمام سے پیتے تھے۔ پان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ عزاداری سے شغف تھا۔ اپنی اولاد کو بہترین تعلیم دلوائی۔ اردو ادبی دنیا کی ممتاز شخصیت باقر مہدی، اِن ہی کے بیٹے ہیں۔

شعر کہتے تھے۔ رزمؔ تخلص تھا۔ شاعری شروع کرنے کا بھی ایک قصہ ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک دن خواب میں کسی مرد بزرگ نے کہا کہ نوحہ کہو۔ آپ نے تعمیل کی اور اس کے بعد سے شاعری کی ابتدا ہوئی۔

مطبوعات مندرجہ ذیل ہیں۔

1۔ صحیفۂ تجلی 2۔ الہامی کلمات 3۔ معرکۂ غم 4۔ منظر درد 5۔ عہد اسیری 6۔ ہمہمۂ ماتم 7۔ فلسفۂ عزا۔ ''عہد اسیری'' میں جیل میں کہی ہوئی چیزیں ہیں۔ باقی کتابوں میں

سلام یا نوحے ہیں۔ مرثیے بھی کہے ہیں۔ دیوان غالباً شائع نہیں ہوا۔

(علی محمد: ''اپنی یادیں'' صفحہ 374-76)

39۔ نہال سنگھ: رائے بریلی کے تحصیلدار، اسکول میں چودھری صاحب کے ہم جماعت اور جگری دوست۔

40۔ ڈیرک: ہما بیگم کے شوہر اخلاق حسین کی پہلی منعی انگریز بیوی کی لڑکی میڈا کے شوہر۔ پورا نام ڈیرک رش ورتھ تھا۔

41۔ ماسٹر لطیف الرحمٰن: ''ماسٹر صاحب'' یہی نام تھا جس سے اہل ردولی لطیف الرحمٰن صاحب کو پکارتے تھے۔ وہ بہت دن مخدومیہ اسکول ردولی (میری ابتدائی تعلیم بھی اسی اسکول میں ہوئی) کے ہیڈ ماسٹر رہے۔ جب خلافت تحریک شروع ہوئی اس وقت آپ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھے۔ ماسٹر صاحب اس تحریک سے اتنے متاثر ہوئے کہ تعلیم ترک کر کے سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ تین بار جیل گئے جہاں قید بامشقت کی سزا کاٹی۔ ہمیشہ نیشنلسٹ مسلمانوں کی صف میں رہے۔ ردولی کے نوٹی فائیڈ ایریا کے دفتر پر جو پتھر نصب ہے اس میں آپ کا نام لکھا ہے۔ اپنی آخری سانس تک کانگریسی رہے۔ کانگریس پارٹی میں مختلف عہدوں پر کام کیا۔ عام انتخابات میں نوٹی فائیڈ ایریا کے چیئرمین منتخب ہوئے مگر کچھ ہی عرصے بعد استعفیٰ دے دیا۔

بہت خوش اخلاق اور انتہائی خوش مزاج تھے۔ ارادوں کے پختہ اور اصولوں کے پابند۔ بہت اچھے مقرر تھے۔

آخر عمر میں دو سو روپے ماہانہ پنشن اور حکومت کی طرف سے تام پتر ملا۔ قلب کے مریض تھے اسی مرض میں 17 دسمبر 1974 میں انتقال ہوا اور شاہ صاحب کی کوٹھی کے پورب جانب جو مقبرہ ہے اس کے قریب دفن ہوئے۔

42۔ ہُولو: اصلی نام ثروت زہرہ تھا۔ چودھری صاحب کی منجھلی بیٹی صفیہ بیگم عرف چھمّن کی لڑکی۔ ہندوستان میں رہیں، ابھی کچھ دن ہوئے انتقال ہوا۔ ان کے شوہر نقی رضوی

ہندوستان کی وزارت خارجہ میں تھے۔

43۔ گوہری: چودھری صاحب کے گھر میں رہتی تھی۔ بچپن میں اس کی ٹانگیں ریل کے نیچے آکر کٹ گئی تھیں۔ زمین پر ہاتھوں کے سہارے گھسٹ گھسٹ کر چلتی تھی۔ مرتے دم تک اسی گھر میں رہی۔

44۔ صوفیہ: چودھری صاحب کی بیوی قیصر بیگم کی چھوٹی بہن۔

45۔ نجبن: گھر میں نوکر تھی خصوصاً چودھری صاحب کے چھوٹے بیٹے جابر لطف علی کے کاموں کے لیے۔

46۔ رفی: اصلی نام رفعت سیدہ۔ چودھری صاحب کی نواسی، پیدائش 1993 صفیہ بیگم کی لڑکی۔ ہولو بالو اور محمد ابوالفضل کی بہن۔ رفعت سیدہ کے شوہر حیدر مہدی برنی بینکر تھے اور ایک عرصے تک بی سی سی آئی میں کام کیا۔

47۔ ڈاکٹر حسین ظہیر: جج تھے اور مسلم لیگ کے سرگرم لیڈر۔ سر وزیر حسن کے بیٹے، علی ظہیر اور سجاد ظہیر کے بھائی۔ حسین ظہیر صاحب حیدرآباد میں پروفیسر تھے۔

48۔ اصغر علی محمد علی: تاجر عطر تھے۔ لکھنؤ کے شرفاء و معززین میں سے تھے۔

49۔ اوری: اصلی نام زبیر نقوی (1968-1930) چودھری صاحب کی بیٹی زہرہ بیگم عرف اَلّن کے منجھلے بیٹے Nuclear Physicist تھے۔ ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے ماسکو گئے تھے۔ وہاں تیراکی کرتے ہوئے ڈوب گئے۔

50۔ بادشاہ میراثی: چودھری صاحب کے خاندان کا خاص میراثی۔ بہت اچھا گانے والا۔ آواز اچھی اور فن سے واقف۔ کئی سوز اور نوحے کلاسیکی دھنوں میں باندھے۔

51۔ عتیق: چودھری صاحب کی پہلی بیوی کی قریبی رشتے دار

52۔ مولانا عابد الشبر: مولانا عابد الشبر کے والد مولوی سید محمد شبر مدرسۂ ناصریہ جونپور میں مدرس اعلیٰ تھے۔ تاحیات مدرسے سے ہی وابستہ رہے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد سلطان المدراس لکھنؤ اور پھر نجف اشرف سے اسناد لیں۔ مجالس پڑھنے کا شوق تھا۔ عربی زبان میں قصائد بھی کہتے تھے۔ شیعہ سنی اتحاد کے زبردست حامی تھے۔ 9

اکتوبر 1939 یوم دوشنبہ جونپور میں انتقال فرمایا۔ مدرسے ہی میں دفن ہوئے۔ پہلی بیوی سے ایک صاحبزادے عابد ہوئے۔ عربی، فارسی، اردو اور انگریزی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں شعبۂ دینیات کے معلم مقرر ہوئے۔ کچھ عرصے بعد وہیں شعبہ کے ڈین ہوگئے۔ 1947 میں پاکستان چلے گئے۔

53۔ چودھری صاحب کے دوست ٹھاکر مرتضیٰ حسین کے بیٹے۔ ان کی شادی چودھری صاحب کی بھانجی بھاگن سے ہوئی تھی۔

54۔ ضیاء: قاضی نجم الحسن اور شاہد، کا لڑکا۔ ڈپٹی بدرل الحسن کا پوتا۔

55۔ حمایت الحسن: کوئنز کالج بنارس میں فارسی اور اردو کے استاد تھے۔ فرنگی محل (لکھنؤ) سے تعلق تھا۔ حیات اللہ انصاری کے ماموں تھے۔

56۔ کھدّن: اصلی نام سید اصغر حسین۔ چودھری صاحب کے علاقے کے ضلع دار۔ یوسف حسین کے بیٹے تھے شعر بھی کہتے تھے۔

57۔ چودھری فقیر احمد: قصبے کے اچھے خاصے بڑے زمین دار تھے۔ مذکورہ مقدمہ ردولی کے شرفاء کی دل چسپیوں اور ان کے مشاغل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس مقدمے سے قصبے کے لوگوں کو عموماً اور زمین دار اور تعلقدار حضرات کو خصوصاً بے حد دل چسپی تھی۔

مقدمے کی نوعیت اور اس کی کسی قدر تفصیلات سید علی محمد زیدی عرف غفن میاں (ردولی کے بہت بہت بڑے شیعہ رئیس) نے اپنی کتاب ''اپنی یادیں'' میں یوں دی ہیں۔

''چودھری محمد نظیر، چودھری محمد منیر اور چودھری محمد سمیع پسران چودھری محمد بشیر محلہ خواجہ حال قصبہ ردولی کے رہنے والے تھے۔ ان کے ایک عزیز چودھری فقیر احمد ولد چودھری محمد ایوب تھے۔ یہ بھی محلہ خواجہ حمال ہی رہتے تھے۔ چودھری فقیر احمد کے لڑکے کی منگنی کے سلسلے میں سدھیانے سے لڈو آئے تھے۔ چودھری فقیر احمد نے اپنے اعزاء اور برادری میں تقسیم کیا۔ چودھری محمد نظیر وغیرہ کو بھی حصہ بھیجا۔ ان

لوگوں اور چودھری فقیر احمد سے تعلقات میں کچھ کشیدگی تھی لہٰذا ان لوگوں نے حصہ واپس کر دیا۔ اس پر چودھری فقیر احمد بے حد ناخوش ہوئے اور ایک بہت سخت خط ان لوگوں کو لکھا جس کی وجہ سے ازالۂ حیثیت عرفی کا دعویٰ عدالت منصف رام سنہی گھاٹ ضلع بارہ بنکی کے یہاں ۱۹ جولائی ۱۹۵۱ کو مبلغ پانچ سو روپیہ پرچہ کا دائر کر دیا۔ جس کی 29 نومبر 1952 کو ڈگری ہوئی۔

عرضی 'دعویٰ' دفعہ 3، 6، سے اس سخت عبارت کی تصدیق ہوتی ہے جس کی طرف چودھری محمد علی نے اپنے خط میں اشارہ کیا ہے۔

دفعہ 3۔ یہ کہ جب شیرینی مدعا علیہ کے آدمی واپس لے کر گیا اور یہ کہا کہ مدعیان نے اس کو لینے سے انکار کیا تب مدعا علیہ کو دفعتاً بہت غصہ آگیا اور اس نے مدعیان کو گالیاں دینا شروع کیا اور جو لوگ اس وقت موجود تھے انھوں نے گالیاں سنیں۔ جو شخص شیرینی واپس لے گیا تھا اس سے مدعا علیہ نے کہا کہ جو کچھ اس نے کہا ہے اس کی اطلاع مدعیان کو کر دی جائے۔ لیکن درمیانی آدمی نے کہا کہ اس کی یہ جرأت نہیں ہے کہ ایسے الفاظ مدعیان سے دہرائے چنانچہ مدعا علیہ نے اسی وقت ایک خط مدعیان کے نام تحریر کیا اور اس میں بھی توہینی الفاظ مدعیان کے خلاف استعمال کیے جو حسب ذیل ہیں۔

آپ تینوں برادران نے جو شیرینی منگنی نور چشم سلمہ واپس کر دی ویسے ہی براہ کرم اگر آپ لوگ بابا بشیر مرحوم کے ہیں۔ میرے کھیت دشرتھ مئو مشل حرام کے غلہ بیس سال سے زہر مار کیا یا میرے مکان مجھلی حویلی 5 بٹوارہ شدہ حصہ کا معاوضہ کی قیمت اب تک مجھے دے دیتے، تو سمجھتا موصوفی مرحوم کے نطفے کے ہیں۔ اپنی بدمعاملگی بدبختی غور کیجیے۔

دفعہ 6۔ یہ کہ مدعیان نے دو نوٹس رجسٹری شدہ مدعا علیہ کو واقعات مذکور الصدر کے متعلق دیے اور ان کو اس کا موقع دیا کہ وہ اپنے حرکات مذکور پر ندامت کا اظہار کریں اور معافی مانگ لیویں۔ لیکن مدعا علیہ نے قصداً نوٹس لینے سے انکار کیا اور

عام طریقے پر یہ کہتے پھرتے ہیں کہ اس نے ایک تحصیلی مقدمہ لڑنے کے لیے علاحدہ کر رکھی ہے۔ اور دیکھیں کہ مدعیان کہاں تک مقدمہ بازی کریں گے۔ مدعا علیہ ایک دولت مند آدمی ہے اور اپنی دولت کے نشے میں اس کو کسی کی عزت و آبرو کی پرواہ نہیں ہے۔

(چودھری فقیر احمد کا بیان تحریری مورخہ 2 اکتوبر 1901 جس سے ہر بات صاف ہو جاتی ہے)

دفعہ 13۔ یہ کہ جب مدعیان نمبر 1 نے شیرینی واپس کی مدعا علیہ کو غصہ ضرور آیا مگر یہ بالکل غلط ہے کہ کوئی گالیاں وغیرہ اس نے دیں بلکہ دوسرے دن ایک خط اسی غصے اور جوش میں محمد مُنیر نمبر 2 کو ضرور بذریعہ نائی بھیجا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ ان کے معاوضہ سے عرصہ سے مستفید ہوتے رکھے (رہے) اور مدعا علیہ کے حصہ مکان کی بابت بھی نہ کوئی معاوضہ یا کرایہ اب تک دیا مگر شیرینی واپس کر دی۔ یہ کہا بے شک ضرور ہے۔ وہ خط محض غصہ و جوش میں تحریر کیا اور کوئی منشا مدعا علیہ کا مدعیان کو ذلیل کرنے کا نہ تھا اور نہ اس سے مدعیان کی کوئی رسوائی یا ذلت ہوئی اور وہ خط نائی محمد منیر مدعی نمبر 2 کو دے آیا۔" (فقیر احمد)

اس فیصلے کے خلاف فقیر احمد نے عدالت چیف کورٹ میں اپیل دائر کی اور شاید فخر الحسن وکیل کی کوششوں سے مبلغ دو سو روپے ہرجہ پر عدالت چیف کورٹ میں صلح داخل ہوگئی۔

اور اس صورت سے مقدمہ ختم ہوا۔

(چودھری علی محمد : اپنی یادیں صفحات 4-181)

58۔ وَجَو : اصل نام مصطفیٰ کامل قدوائی تھا۔ ولایت علی بمبوق کے بیٹے اور انیس قدوائی، مدحت کامل قدوائی، بلقیس قدوائی اور انور جمال قدوائی کے بھائی تھے۔ یوپی کے کئی اضلاع میں منصف رہے۔ متعدد عہدوں پر کام کرنے کے بعد مرکزی حکومت میں آ گئے۔ جدہ، ماریشس اور ملیشیا میں ہندوستان کے سفیر رہے۔

59۔ نجے : قاضی نجم الحسن۔ چودھری صاحب کے انتہائی قریبی دوست ڈپٹی بدرل الحسن کے بیٹے۔

60۔ عالیہ : یوپی کے سیاست داں اور ممتاز وکیل سید علی ظہیر کی بیوی۔ ان کا ننہال ردولی ہی میں تھا۔

61۔ خلیق : چودھری خلیق الزماں۔ یوپی کے ممتاز مسلم لیگی لیڈر۔ بعد کو پاکستان چلے گئے۔

62۔ اویس قرنی : (پیدائش 1917) چودھری صاحب کے بھانجے حسن احمد کے بڑے بیٹے تھے۔ تحریک آزادی کے سرگرم کارکن رہے۔ تقریباً ساڑھے چار سال قید میں گزارے۔

63۔ مرزا محمد وصی : چودھری صاحب کے استاد مرزا محمد عسکری کے بیٹے، جھوائی ٹولے (لکھنؤ) کے ممتاز اور معزز خاندانوں سے تعلق تھا۔

64۔ شاہدہ : قاضی نجم الحسن کی بیوی۔ ان کی کزن بھی تھیں۔

65۔ آفاق : شاہ آفاق احمد۔ شاہ حیات احمد صاحب کے بیٹے، اور ان کے بعد مخدوم شاہ عبدالحق توشہ کے سجادہ نشین۔

66۔ ارشاد حسین چودھری: رُدولی کے سب سے بڑے رئیس۔ شاہجہانی مذاق کے حامل۔ مکان نہایت شاندار۔ مسجد و امام باڑہ، ردولی کی قابل دید عمارتیں۔ چودھری صاحب کے یہاں صبح کے وقت اور پھر بعد مغرب نشست ہوتی تھی۔ صبح کی نشست میں روز آنے والوں کے علاوہ وہ لوگ بھی ہوتے تھے جو ملنے کے لیے آجاتے تھے مگر شب کی نشست میں مخصوص لوگ ہوتے تھے۔ انتہائی بااخلاق اور وضعدار آدمی تھے۔ روزے نماز کے پابند۔ طحال کا علاج دعا سے کرتے تھے۔ (طحال کے علاج کے لیے میں بھی ان کے یہاں گیا ہوں۔ مرتب) اس کے لیے علی الصباح جانا ہوتا تھا۔ کیوں کہ چودھری صاحب نماز فجر کے فوراً بعد مریض کو دیکھتے تھے اور وہیں مسجد میں دعا پڑھ کر پھونکتے تھے۔

67۔ علی ضامن : چودھری صاحب کے داماد غضنفر علی نقوی کے بہنوئی تھے۔ صوبائی سول سروس میں تھے۔ کئی مقامات پر ڈپٹی کلکٹر رہے۔

68۔ خواجہ غلام السیدین (1971-1904) ہندوستان کے ممتاز ماہرین تعلیم میں شمار ہوتا تھا۔ پانی پت کے معزز اور دانش ور خاندان سے تعلق تھا، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد لیڈس یونیورسٹی (لندن) سے ایم ایڈ کیا۔ علی گڑھ میں پروفیسر آف ایجوکیشن، جموں اور کشمیر میں ڈائریکٹر آف ایجوکیشن، رام پور اور بمبئی میں مشیر تعلیم اور حکومت ہند کی وزارت تعلیم میں سکریٹری کے فرائض انجام دیے۔ متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔

69۔ سید عابد حسین ڈاکٹر : ممتاز عالم۔ متعدد کتابوں کے مصنف اور کئی معیاری کتابوں کے مترجم۔ ڈاکٹریٹ کی ڈگری جرمنی سے لی۔ انگریزی کے ساتھ جرمن زبان پر عبور تھا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں آنے والوں میں ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر محمد مجیب کے ساتھ عابد حسین صاحب بھی تھے۔ 'نئی روشنی' (ہفتہ وار) اور عصر جدید (اردو اور انگریزی) کے مدیر بھی رہے۔

70۔ انیس قدوائی : ولایت علی قدوائی بمبوق کی بیٹی۔ انڈین نیشنل کانگریس کی سرگرم کارکن۔ سماجی کام سے پناہ شغف۔ 1947 کے فسادات میں دہلی میں بہت کام کیا۔ لوگوں کی باز آبادکاری اور مغویہ عورتوں کی بازیافت میں سمدر جوشی کے ساتھ بہت کام کیا۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی رکن بھی رہیں اور راجیہ سبھا کی ممبر بھی۔ متعدد کتابوں کی مصنف، کہانیوں کے دو تین مجموعے شائع ہوئے۔ طرز تحریر دلچسپ اور منفرد۔ تقسیم ملک کے بعد کے ہنگامی حالات پر ایک کتاب 'آزادی کی چھاؤں میں' لکھی۔ واقعات کی چشم دید گواہ ہونے کی وجہ سے کتاب بڑی معتبر ہے۔

71۔ مظفر حسین : ہما بیگم اور سید اخلاق حسین کی بیٹی اور چودھری صاحب کی نواسی رتی کے خاوند۔ پیشے سے انجینئر تھے۔

72۔ رتی : پیدائش 1928۔ ہما بیگم کی بیٹی۔ ان کے شوہر مظفر حسین ممتاز انجینئر تھے۔

73۔ رضا کاظم : پیدائش 1929۔ ہما بیگم کے بڑے بیٹے۔ لاہور کے ممتاز وکیلوں میں ہیں۔

74۔ سِلو، سلویا (Sylvia) چودھری صاحب کی تیسری بیٹی الّن کی بڑی لڑکی۔ ان کے شوہر خواجہ شمر حسن عالمی ادارۂ صحت (WHO) میں کام کرتے تھے۔

75۔ مُنن : چودھری صاحب کے بڑے بیٹے سلمان محمد علی کی بیوی۔ علی رضا بلگرامی کی بیٹی تھیں۔

76۔ مسیّب عباس : حکیم حسن عباس کے لڑکے۔ عام طور پر لوگ شارب ردولوی کے نام سے جانتے ہیں اردو کے ممتاز ادیب و نقاد۔ یونیورسٹی سے پروفیسر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ اب لکھنؤ میں قیام ہے۔

77۔ مالک رام: مالک رام بویجا نام تھا۔ اردو کے ممتاز محقق تھے۔ ان کی تحقیق کا خاص میدان غالب تھے۔ بہت سی کتابیں مرتب کیں جن میں سرفہرست مولانا ابوالکلام آزاد کی تصنیفات ہیں۔

78۔ شان الحق حقّی : آبائی وطن دہلی۔ دلّی کے زبان و محاورے پر غیر معمولی قدرت رکھتے ہیں۔ شاعری، افسانہ نگاری، لغت نویسی کے میدان میں نمایاں کارنامے انجام دیے۔ مترجم کی حیثیت سے بھی شہرت رکھتے ہیں۔

79۔ بالو: اصلی نام اقبال فاطمہ۔ 1932 کی پیدائش۔ صفیہ بیگم اور سبط احمد کی بیٹی محمد ابوالفضل کی بہن: بالو کے خاوند علی تصدیق پی آئی اے کے ایک حادثے میں، جو 1965 میں قاہرہ میں ہوا تھا جان بحق ہوئے۔ بالو کا قیام اب کراچی میں ہے۔

80۔ محمد، ابوالفضل : 1935 کی پیدائش۔ چودھری صاحب کے نواسے، ان کی بیٹی صفیہ بیگم اور بھانجے سبط احمد کے بیٹے۔ پاکستان میں فارن سروس میں تھے۔ کئی ملکوں میں سفیر رہے۔ اب کراچی میں مقیم ہیں۔ اس فہرست کے اکثر لوگوں کے بارے میں معلومات اِن ہی نے فراہم کی ہے۔

81۔ صادقی : چودھری صاحب کے ماموں زاد بھائی مولانا محمد شمر کی دوسری بیوی۔ ان

کے لڑکے صادق المشر شعر کہتے تھے اور جامی تخلص کرتے تھے۔

82۔ چودھری محمد سہیل: چودھری محمد سہیل رودولی محلے خواجہ حال میں رہتے تھے۔ والد کا نام حافظ ہادی رضا تھا۔ رودولی کے معزز لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔ ایمانداری اور معاملات میں صفائی کی وجہ سے ہر شخص احترام کرتا تھا۔ انتہائی منکسر مزاج اور مخلص تھے، دوسروں کے دکھ درد میں شریک ہونے والے صلح کل اور دوسروں کے الجھے جھگڑوں کو سلجھانے والے۔ زمین داری کے ساتھ اینٹوں کا بھٹہ قائم کیا۔ بڑی کاروبار بھی تھا۔ شعر و شاعری سے دل چسپی تھی۔ مولوی سید علی کے شاگرد تھے، سہیل تخلص کرتے تھے۔ انتقال 5 اگست 1966 مطابق 17 ربیع الآخر 1306ھ لکھنؤ کے بلرام پور اسپتال میں ہوا۔ تدفین رودولی کے اپنے موروثی قبرستان محلہ نیا گنج میں ہوئی۔

ان کے بیٹے چودھری محمود سہیل ہیں اپنے والد کے اصولوں ان کے طرز زندگی اور رکھ رکھاؤ کا پورا احترام کرتے ہیں۔ وہ آج اپنے والد ہی کی طرح چاہے جاتے ہیں۔ چودھری محمود نے گھر کے وقار اور خاندان کی عزت کو نہ صرف یہ کہ باقی رکھا ہے بلکہ اس میں اضافہ کیا ہے۔ اس وقت رودولی کے معزز لوگوں میں ہیں۔

(چودھری علی محمد: 'اپنی یادیں')

83۔ شیخ ولایت علی بمبوق (ان کا ذکر میرا مذہب میں ہے) چودھری محمد علی میں وسیع النظری اور وسیع القلبی فطری تھی، مل اور اسپنسر جیسے مصنفین کی کتابوں کے مطالعے نے اس میں اور اضافہ کیا۔ شیخ ولایت علی قدوائی کی دوستی میں یہ باتیں اور چمک اٹھیں۔

شیخ ولایت علی بارہ بنکی کے قدوائی شرفاء سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی پیدائش مسولی گاؤں میں 1887 میں ہوئی۔ ولایت علی نام رکھا گیا۔ قلمی نام بمبوق اختیار کیا۔ والد ممتاز علی ایک شریف اور نرم دل آدمی تھے۔ اپنے معاصرین کے مقابلے میں زیادہ روشن خیال اور وسیع النظر تھے ان کی دنیا اپنے وینس سے آگے تھی۔ لکھنؤ سے اخبار منگوانے والے پہلے فرد تھے اور مسولی کے واحد تعلقدار تھے جنھوں نے اپنے بچوں

کو مغربی تعلیم کے لیے بھیجا۔

ولایت علی بمبوق ذہنی صلاحیتوں کے ایک واجبی خاندان میں غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ پندرہ برس کی عمر میں دسویں کا امتحان پاس کیا۔ مزید تعلیم کے لیے علی گڑھ بھیجے گئے وہاں جلدی ہی اپنے قلمی نام بمبوق سے مزاحیہ مضامین اور طنزیہ خاکے لکھنے والے کی حیثیت سے جانے جانے لگے۔ چند ہی دنوں میں وہ ظریف طبع انقلابی دانش وروں اور اچھے کھانوں اور ذہین گفتگو کے رسیا لوگوں کے ایک زندہ دل گروہ کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ یہاں ان سب نے سیاسی احتجاج کو شگفتہ مزاجی، تمسخر، طنز اور ہجو گوئی سے ہم آمیز کیا۔ اس گروہ کے معبود مجازی تھے محمد علی اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور ینگ ٹرک ریولیوشن کے لیڈر جنھوں نے سلطنت عثمانیہ کی اصلاح کرنے اور اسے توانا بنانے کا بیڑہ اٹھایا۔ بمبوق گروپ نے اکبر الہ آبادی سے بھی تحریک و ترغیب حاصل کی۔ لکھنؤ سے تقریباً 18 میل دور ہونے کے باوجود وہاں کی ادبی اور سیاسی زندگی میں شریک رہے۔ 'کامریڈ'، 'اودھ پنچ'، 'معلومات' جیسے اخباروں اور رسالوں میں لکھتے رہے۔ 'کامریڈ' کے بند ہونے کے بعد اور رسالوں میں لکھتے رہے۔ 'کامریڈ' کے بند ہونے کے بعد ایک دوسرا اخبار، نکالنے کا فیصلہ ہوا۔ راجہ غلام حسن کی زیر ادارت 1916 ، میں 'نیو ایرا' کی اشاعت کا آغاز ہوا۔ یہ رسالہ بہت دن نہیں چلا مگر اس نے 'کامریڈ' کے بند ہونے سے مسلم صحافت میں جو خلاء پیدا ہوگیا تھا اسے ضرور پُر کر دیا۔

بمبوق کا گھر مسلم سیاست کی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ اس مرکز میں ہونے والے سیاسی مباحثے، لطیفوں، چٹکلوں اور قہقہوں سے پُر ہوتے تھے۔ یہیں کانگریس اور مسلم لیگ کے آئندہ جلسوں کے لیے تجاویز لکھی جاتی تھیں اور منشور تیار ہوتے تھے۔ اس گروہ کے تمام افراد جاگیردارانہ حسن اخلاق رکھ رکھاؤ اور جدید تعلیم سے آراستہ تھے۔ وجیہ اور خوبصورت نوجوان تھے۔ حقے کے تمباکو کی خوشبو سے معطر فضاء میں شعر و شاعری ہوتی، اور طبع زاد کہانیاں اور افسانے پڑھے اور سنے جاتے۔ شعر و شاعری کی اسی نرم فضاء میں گرما گرم سیاسی بحثیں ہوتیں۔

متفرقات

”کشکولِ محمّد علی شاہ فقیر“

نمبر ا

یہ شاہ صاحب میدان ادب کے ایک چابک دست شہسوار ہیں جن کا انداز فقیری کے جامے میں بھی صاف پہچانا جاتا ہے۔

برگ سبز است تحفۂ درویش میں عجیب حکمت کا نسخہ پایا جاتا ہے۔ ہندوستان کے اطبّاء اس کے لیے جہاں تک سرا ہے جائیں، بجا ہے۔ پان کا بیڑا صرف ہندوستان نے اٹھایا ہے۔ سبز پان میں حسب ذیل چیزیں موجود ہیں جن پر زندگی کا مدار ہے، اور جن میں تفریح اور تقویت کا سامان ہے۔ ملاحظہ ہو۔

سبز پان کا پتا

پانی کا جز	۸۴ء۴	دُہنیت	۷ء۸
پروٹین (نشاستہ جو جسم کی		معدنی اجزاء	۲ء۳
تعمیر کے کام آتا ہے	۳۰ء۱	کاربوہائیڈریٹ (شکر وغیرہ کے	
		اجزاء جو جسم کی بھٹی کا ایندھن ہیں۔	۶ء۱
چونا	۰ء۲۳	کاربوہائیڈریٹس	۴۷ء۲
ریشے	۲ء۳	چونا	۰ء۰۵
فاسفورس	۰ء۰۰۴	فاسفورس	۰ء۱۳
لوہا	۵۰ء۷	لوہا	۱ء۵
کیلوریفک یعنی حرارت			

حیوانی، (سو گرام میں) ۴

حیاتین الف نہیں ہے

کروٹین جو حیاتین الف ۹۴

کی کمی کو پورا کرتی ہے (بین الاقوامی اکائی)

حیاتین ب نہیں ہے

حیاتین ج ۵

کیلوری یعنی حرارت کی

اکائی، فی اونس ۲

ڈلی (چھالیہ)

پانی	۳۱٫۳
پروٹین	۴٫۹
دُہنیت	۴٫۴
معدنی اجزاء	۱
ریشے	۱۱٫۲
حرارت حیوانی فی سو گرام	۲۲۹
حرارت کی اکائی فی اونس	۶۵

لونگ خشک

پانی	۲۳٫۵
پروٹین	۵٫۳
دہنیت	۸٫۹
حرارت حیوانی، ایک سو گرام میں	۲۴۸
کیروٹین۔ ایک سو گرام میں	۵
حرارت کا جز فی اونس	۷۰

الائچی

پانی	۲۰
پروٹین	۱۰٫۲
دُہنیت	۲٫۲
معدنی جز	۵٫۴
ریشے	۲۰٫۱
حرارت حیوانی کا جزو	۴۲٫۱
چونا	۰٫۱۳
فاسفورس	۰٫۱۶
لوہا	۵٫۰۰
ریشے	۹٫۵
حرارت حیوانی کا جزو	۴۷٫۹
چونا	۰٫۷۴
فاسفورس	۰٫۱۰
لوہا	۴٫۹
حرارت حیوانی سو گرام میں	۲۹۳

کتھا

مدل ہے، قابض ہے۔ چونے کا فاد کہلاتا ہے۔ چونے سے مل کر سُرخ ہو جاتا ہے۔ کیمیاوی اجزاء کا پتہ نہیں چلا سوا اس کہ ٹینک ایسڈاس سے نکلتا ہے اور دست پیچش اور آنتوں سے خون آنے میں دیا جاتا ہے۔

چونا

یعنی کیلشیم۔ خوبیاں جس ڈاکٹر سے چاہے پوچھ لیجیے۔ ہر کمزور آدمی جس کے پاس ڈاکٹر کو فیس دینے کے پیسے ہیں، اس کے فائدے سے واقف ہے۔ (سوا کتھے چونے کے اور سب حساب ہیلتھ بلیٹن نمبر 63 گورنمنٹ آف انڈیا سے لیا گیا ہے۔)

مرتبہ ڈاکٹر ایکرائڈ، ایم. ڈی

(تمبا کو اور کتھے کا حساب انسائیکلوپیڈیا برٹینکا سے لیا گیا ہے)۔

بدقسمتی سے تمباکو بھی پان کے ماتھے لکھ گئی ہے اس کا ذکر اس سلسلے میں نہ کرنا ایسا ہے جیسے کسی کہانی میں سے اس حرام زادے آدمی کا حال نکال ڈالو جو عاشق معشوق کو ملنے نہ دیتا ہو۔ اس میں نکوٹین ہوتی ہے جو زہر ہلاہل ہے۔ مگر غنیمت ہے کہ وہ بہت کم ہے اس کا زہر دور کرنے کے لیے مختلف چیزیں اس میں ملائی جاتی ہیں جو پرانے خیال کے موافق اس کا فاد سمجھی جاتی ہیں، جیسے زعفران وغیرہ۔ مگر آج کی کیمیاوی ترکیب ان کی قائل نہیں ہے۔ تمباکو میں مختلف نمک نشاستہ شکر اور نہ معلوم کون کون خاک دھول اَلابلا ہوتی ہیں۔ اس کا کھانا اس کے پینے سے زیادہ مضر ہے۔ کیوں کہ نکوٹین دھواں پیدا ہونے کے پہلے ہی جل جاتی ہے اس کا زہر پانی میں ہی مل جاتا ہے، اس لیے حُقے میں تو ہر طریقے سے کم مضر ہے۔

اگر میں شاعر ہوتا تو گلوریوں کی تعریف میں قصیدہ لکھتا مگر مجبوری ہے۔ پان کی ایک معاشرتی خوبی ہے جس پر اکثر لوگوں کی نظر نہیں جاتی یعنی بار بار منھ چلانے سے آدمی باتیں کرنے کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ یہ معاشرتی فائدہ بہت بڑا ہے۔ جیسے بخار میں پاؤں میں جھانواں کرنے سے مصنوعی گرمی اصلی کی طرف لے جاتی ہے اور ٹھنڈے پاؤں گرم ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح بار بار منھ کی حرکت سے موضوع دماغ میں آنے لگتے ہیں۔ جو لوگ صحبت میں منھ باندھے بیٹھے رہتے ہیں ان کو پان کھلا کر آزما لیجیے۔ کھانے کے بعد پان منھ کو غذا کی بو سے خوب صاف کرتا ہے۔ پان کھانے سے منھ کے اندر کے ہزاروں غدود رستے ہیں جن سے ہضم غذا کا کام شروع ہوتا ہے جو بہت مفید ہے۔ چہرے پر خون دوڑتا ہے نہ اس قدر کہ دماغ پر دھکا لگے، بلکہ صرف اتنا جو دیکھنے والے میں خوش دلی پیدا کرے کیوں کہ صحت اور تندرسی کے آثار دیکھ کر قلب کو سکون ہوتا ہے۔ اعتدال ہر چیز میں ضروری ہے۔ پان کی زیادتی سے منھ کو اگال دان بنا دینا ایسا ہی ہے جیسے زیادہ پلاؤ کھا جاؤ اور تُخمہ ہو جائے۔ دنیا لپ اسٹک کے لیے نہ معلوم کون کون زہریلی چیزیں اور اقتصادی تباہی اکٹھا کرتی ہے ہماری لپ اسٹک یہی گلوری ہے۔ ہاتھ لا اُستاد کیوں کیسی کہی۔

میرؔ: یوں کہتے، یوں کہتے جو یار آتا
سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

بیانؔ: جاتا ہے یار کچھ تو بیاںؔ منھ سے بول لے
اے بے نصیب مانع گفتار کون ہے

مجنوںؔ: بن کے سائل بھی نہ نکلا کوئی کام
در پہ پہنچا تو صدا بھول گیا

حالیؔ: مؤثر ہے بہت حالیؔ ترا واعظ

کل اس کے سامنے بھی کچھ بیاں ہو

جلالؔ: گئی تھی کہہ کے میں لاتی ہوں زلفِ یار کی خوشبو

پھری تو بادِ صبا کا دماغ بھی نہ ملا

غالبؔ: تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم

میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

حافظؔ: صبا بلُطف بگو آں غزال رعنا را

کہ سَر بکوہ و بیاباں تو دادہٗ مارا

نواب سعادت علی خان کے وقت میں ان کا ہوا دار رزیڈنٹ کی چوکڑی سے آگے نکل گیا۔ نواب نے کہاروں کو انعام دیا، حالانکہ سعادت علی خاں سے ذرا تعجب ہے۔ کہار لوگ اس خوشی میں ناچے یہ ناچ کہروا کہلایا۔ یہ ناچ دلّی میں نہ تھا، صرف لکھنؤ میں ایجاد ہوا۔ اس کے لَے ہے۔

''دِھن دھاگے ناتے تِک۔ دِھن دھا۔''

''دھا'' پرسَم ہے۔

عشق میں جی کو صبر و تاب کہاں   اس سے آنکھیں لگیں تو خواب کہاں

جاگ پڑی میں تو پیا کے جگائے   بھور ہوت جب پیا مورے آئے

اُن نین میں نیند کہاں ہے   جن نین میں آپ سمائے

یہ ٹھمری عالی جاہا والا قدر نواب وزیر مرزا (چوکھی والے) کی ہے۔ مرحوم نے اس کو تلنگ میں باندھا ہے۔

مدرس صاحب اعتراض نہ فرمائیں کہ صبح کو نیند آ گئی تو دوسرے مصرعہ کا دعویٰ غلط ہو گیا۔ صبح کو ذری سے آنکھ لگ جانا فطرت ہے۔ مثل ہے کہ نیند تو سولی پر آ جاتی ہے۔ مگر اس نیند کو نیند کون کہے گا۔

اس محرومی پر نظر کیجیے کہ جس کی وجہ سے نیندیں اڑ گئیں، اس نے صبح ہوتے جگایا۔ وہ یہ سمجھ ہی نہ سکا کہ اس نے رات بھر تارے گنے تھے۔

ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

(کشکول)

کشکول محمد علی شاہ فقیر

نمبر۲

نئی روشنی کے پڑھنے والوں اور لکھنے والوں کو پھاگن رُت کی خوشیاں نصیب ہوں، آمین۔ اس فصل میں دیہات میں فحش گیت گائے جاتے ہیں یہ کیوں؟ یہ اس لیے کہ

لالہ ساغر گیر و نرگس مست و برما نام فسق
داوری دارم بسے یارب کرا داور کنم

وقت کا تقاضا ہی یہ ہے۔ اراراراکبیر

"ارے چپ، ارے چپ خبردار جو منہ سے کوئی بے ہودہ بات نکالی۔ مردود! اب تو یہاں بیٹھ کر شریف مرد آدمیوں میں کبیر گائے گا۔"

جی۔ کیا ہرج ہے۔"اراراا۔"

پھر وہی۔ اٹھاتا ہوں تجھی۔

دیکھیے دیکھیے، سُن لیجیے، غصہ نہ کیجیے ہاتھ روکے رہیے تو عرض کروں، مورخ الفنسٹن نے ہندوستان کی ذہنیت کے سلسلے میں"اس معصوم صاف دلی"۔ کا ذکر کیا ہے جس کے رو سے جو چیزیں بلا اعتراض ہوسکتی ہیں وہ بلا اعتراض بیان بھی کی جاسکتی ہیں۔ ابھی پنتھ جی اس شان دار قدیم زمانے کا ذکر کرتے تھے جو گاؤں پنچایتوں کی وجہ سے واپس آکر گذشتہ رونق بڑھا دے گا۔ یعنی وہی معصومیت اور صاف دلی پھر جگمگا اٹھے گی۔"

تو اس کے معنی یہ تم نے کہاں سے نکالے کہ تم کبیر گانے لگو۔ بومارشے فرانسیسی ڈراماٹسٹ پہلے ہی فرما گیا ہے وہ حماقت انگیز چیزیں جو نثر میں نہیں بیان کی جاسکتیں نظم میں یا گا کر سنائی جاتی ہیں۔"

جی ہاں، تو میں بھی تو لحن سے کلام موزوں کر رہا ہوں۔ ارارارا۔ چٹ پٹ دھم۔ اچھا مولوی صاحب معاف کیجیے گا، اب کبھی نہ گاؤں گا۔"

(برٹرنڈرسل کی ایک تقریر کا خلاصہ جو انھوں نے یوروپین بِلسنرز سروس میں کی تھی۔ اقتباس از ورلڈ ڈائجسٹ جون ۱۹۴۷)۔

الفاظ کے دوکام ہیں۔ واقعات بیان کرنا اور جوش دلانا۔ دوسرا کام زیادہ قدیم ہے، جیسا کہ بچہ دینے کی فصل میں جانوروں میں ظاہر ہوتا ہے۔ تہذیب کی کوشش ہے کہ الفاظ معنی زیادہ بیان کریں اور جوش کم دلائیں۔ مگر پالیٹکس میں اس کی برخلاف ہوتا ہے۔ گو الفاظ کے معنی لغت میں متعین ہیں مگر پالیٹکس میں آ کر بدل جاتے ہیں۔ ایک لفظ کے معنی مختلف خیال کے لوگوں کے نزدیک مختلف ہوتے ہیں۔ مگر جوش دلانے میں ایک ہی طرح کام آتے ہیں۔ آزادی کے معنی ہیں "غیر کی حکومت کا فقدان"۔ پھر اس کے معنی ہوگئے بادشاہ کے اختیارات میں کمی۔ جب انسانیت کے حقوق کا مسئلہ نکلا تب اسی لفظ "آزادی" کے معنی ہوگئے۔ "کن کن باتوں میں گورنمنٹ کی حکومت سے آدمی آزاد ہے۔" پھر ہیگل کے وقت میں آکر اسی لفظ کے معنی ہوگئے کہ آزاد آدمی کن کن باتوں میں اپنی مقرر کردہ پولیس کا حکم مانے گا۔ آج کل لفظ "ڈیماکریسی" بھی اسی طرح کے برن بدل رہا ہے۔ پہلے اس کے معنی تھے "جمہور کی حکومت" اور اس کے ساتھ فرد کی آزادی کا بھی کچھ خیال شامل تھا۔ پھر اس کے معنی ہوگئے غریبوں کی حکومت، کیوں کہ غریب ہی ہر جگہ زیادہ تھے۔ پھر اس کے معنی نے نیا چولا بدلا۔ اور اس کے معنی ہوگئے غریبوں کے نمائندوں کی رائے۔" فی الحال اس لفظ کے معنی مشرقی یورپ اور ایشیا کے بعض حصوں میں قرار پائے ہیں کہ ان لوگوں کی جبریہ حکومت جو کبھی غریبوں کے نمائندے تھے اور ان کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ دولت مندوں کو کھا جاؤ۔ سوا ان دولت مندوں کے جو ڈیماکریسی کے تازہ ترین معنی کو تسلیم کرتے ہیں۔" لفظوں کے معنی بدلتے جائیں۔ مگر الفاظ کا اثر وہی ہونا چاہیے جو اصلی معنی کا ہوا تھا۔ بدلے ہوئے معنی سے پولیٹیکل جھپ جھالیے پن کو اچھی خاصی مدد ملتی ہے۔ الفاظ کے نت نئے معنی کے ذریعے سے اُن لوگوں کو چاند میں ہوا کے ذریعے سے آدمی بھیجنا ہو تو یہ رضا کار یہ

کہہ کر پکاریں گے کہ "وطن، وطن مالوفہ، وطن مالوفہ کو کون چلتا ہے۔" (یعنی سلوگن وہی رہے گا) مگر مفہوم بدلتے رہیں گے اور کام چلتا رہے گا۔ سائنس اور سائنٹفک فلاسفی کی تعلیم میں صحیح معنی پر بڑا زور دیا جاتا ہے لڑکوں کو پڑھانے میں بھی اس کا پورا خیال رکھا جانا چاہیے کہ نہ لفظوں کے معنی حسب ضرورت بدلے جاسکیں نہ ان کا اثر الٹا ڈالا جاسکے، اور اس طرح تعلیم صحیح صورت میں پیش نظر ہے۔ میرا تجربہ ہے کہ سائنٹفک فلاسفی کی تعلیم اس احتیاط کو اچھی طرح سمجھے ہوئے ہے اور اسی غرض کو پیشِ نظر رکھ کر اس کو کامیابی سے برت بھی لیتی ہے۔ مگر پولیٹیکل میدان میں وہی جذباتی معنی پیش پیش رہتے ہیں۔

لڑائی شروع ہونے سے پہلے ایک سائنٹفک فلاسفی کا جلسہ پیرس میں ہوا تھا، جہاں تمام ممالک سے بڑے بڑے لوگ جمع ہوئے تھے ان کی گورنمنٹ ایک دوسرے پر اعتراض اور سخت گیری جیسا کہ دنیا کا قاعدہ ہے کرتی رہتی تھیں۔ مگر یہ لوگ نہ صرف علمی ہی معاملات پر صحیح رائے قائم کر لیتے تھے بلکہ ملکی جھگڑوں، آپس کی اکھاڑ پچھاڑ۔ رد و قدح کے نظریوں پر بھی دو ٹوک رائے قائم کر لیتے تھے۔ اگر یہی لوگ عام ممالک کے کابینوں میں وزارتیں پا جاتے تو شاید سب معاملات سلجھ جاتے مگر پولی ٹیکل چالیں اور ایمانداری الگ الگ چیزیں ہیں۔ بدقسمتی سے مدرسوں میں ایسی تعلیم نہیں دی جاتی۔ وہاں تو اس طرح کی تعلیم دی جاتی ہے کہ سیاسی جوش بڑھے۔ لغت اور ایمانداری چاہے بھاڑ میں جائے۔ مثال کے طور پر سُن لیجیے۔ آیا آئرلینڈ کو یہ حق ہے کہ وہ برطانیہ سے علیحدہ ہو جائے؟ امریکہ کا ہر ریڈیکل کہے گا۔" ہاں" آیا ہندوستان دو حصوں میں تقسیم ہو جائے۔ دس میں نو ریڈیکل کہیں گے "نہیں" میں یہ نہیں کہتا صرف نظریہ ہی معاملات کو سدھار سکتا ہے، نہ صرف جوش ہی سدھار دے گا۔ لیکن اس نظریے کی تطبیق ایمانداری سے واقعات پر ضرور صحیح نتیجے پر پہنچا دے گی۔ اگر عام دنیا کے اسکول ایک بین الاقوامی ادارے کے تحت میں کر دیے جائیں تو یہ بات حاصل ہوسکتی ہے۔

(کشکول)

کشکول محمد علی شاہ فقیر

نمبر ۳

مغنیۂ آتش نفس بلبلِ ہند۔ سروجنی نائیڈو کی ایک نظم گولڈن تھریشولڈ کے ایک بند کا ترجمہ سنیے:

آؤ ہم تم مل کر مارچ کی صبح کا لطف اٹھائیں۔ فضا میں گرمی ہے۔ تیزی اور تندہی ہے، جوش اور ولولہ ہے۔ کائنات کی ہر شے بے دھڑک بے جھجک سرخوشی کے عالم میں زندگی کے اور محبت کے لیے مچل رہی ہے۔"

بلیک انگریزی شاعر کی ایک نظم جو تقریباً اٹھارہویں صدی کے آخری دھاکے میں لکھی گئی ہے۔ یہ بالکل ہی موجودہ نسل کے حسب حال ہے۔ میں نے یہ نظم لکھنؤ کے۔ ایک بہت بڑے بلکہ سب سے بڑے شاعر سلمہ اللہ تعالیٰ کو بھیج دی۔ موصوف نے لفظی ترجمہ کرکے بھیج دیا۔ اور دو شعر اسی رنگ میں اور جوڑ دیے تاکہ اردو میں کچھ مطلب اور واضح ہوجائے۔

ڈیڑھ سو برس کی نظم اور اس میں ڈاکٹر سگمنڈ فرائڈ اور جنگ کا رنگ! معلوم ہوتا ہے کہ تحلیل نفسی کی عمارت کا پتھر بلیک ہی نے رکھا تھا۔ اس جامدانی میں ٹاٹ کا پیوند لگا۔ اب اس نظم کا نظام حسب ذیل ہوگیا۔ پہلے بلیک کا ترجمہ، اس کے بعد ایک شعر اُستاد مدظلہ العالی کا پھر دس اشعار ایک نوسیکھیے کے پھر آخری شعر ایک ذرا سے تصرف کے ساتھ استاد کا۔ لیجیے سنیے۔

بلیک

مری ماں درد سے چلاتی تھی روتا تھا باپ

میں جب اس دہر پر آشوب میں کودا ناچار

چیتھڑوا تن پہ تھا کرتا تھا ٹھنوں ٹھنوں
بدلی کی اوٹ سے شیطان کی جیسے للکار
جب لیا باپ نے ہاتھوں میں تو مچلا کیا کیا
تاکہ آزاد جکڑ بند سے ہوں کپڑوں کی
تھک گیا اور یہ سوچا کہ یہی بہتر ہے
ماں کی چھاتی پہ پڑے رہیے اُداس اور خفا

اُستاد

ابتدا تھی یہی شاید مری سر تابی کی
قید ہر قسم کی ہے فطرت انساں پہ گراں

نوسیکھیا

ضد اِدھر، روک اُدھر، پڑ گئی بنیاد عیوب
عیب جنسی ہوں کہ ہوں دوسرے پہلو کے عیاں
عذر معقول فرائڈ نے گناہوں کے لیے
کر دیے پیش ہوئے جس سے خلائق شاداں
اثم دعدُد ان سے گر، اب بھی کوئی شرمائے
لوگ ہنس ہنس کے کہیں اس کو کہ ہے یہ ناداں
اک طرف جوش حیات آدمی کو اُکسائے
دوسری سمت سے شاباش پکارے شیطان
فلسفی عذر و وکالت کے لیے حاضر ہے
اورسائنس کرے روگ کی سختی آساں

ہے مزا یوں تو گناہوں کے سبھی شعبوں میں
عشق کا لطف مگر اور گناہوں میں کہاں

ہے زری سخت مگر قید حلال اور حرام
"اُتھ" سے کچھ خیر نکل جاتا ہے خوف یزداں
کر حقیقی و مجازی میں زری گھال کھیچ
پھر تو ہے صاف ترے شوق کے خاطر میداں
لے تصوف سے مدد فلسفہ و منطق سے
دے ثبوت اس کا کہ ہے زیست سراسر ناداں
پھاند پھر چوک کے دریا میں شناور ہے اگر
احتیاطاً رہے یہ شعر مگر وردِ زباں

اُستاد (بہ خفیف تصرف)

قید دنیا میں رہے قید محبت ہر دم
یہ نہ ہو تو کبھی انسان نہیں بنتا انساں

روس کی پالیسی کے اوپر ایک مرتبہ چرچل نے ایک جملہ کہا تھا، اس کا ترجمہ نئی روشنی کے ایڈیٹر کی تتبع میں کیا گیا تھا۔

جھمیلے کے میلے ہیں، گڑ بڑ جھالے کا بازار ہے۔ گورکھ دھندوں کا بیوپار ہے۔"

مسلمان، یہود، نصاریٰ اور ستارہ پرست ان میں سے جو اللہ اور آخرت پر ایمان لائے اور اچھے کام کرتے رہے۔ بے شک یہ لوگ اپنے رب سے اپنا اجر پائیں گے، نہ ان کو کچھ خوف ہوگا نہ کچھ غم ہوگا۔

یہ آیت (62) باسٹھویں آیت آٹھویں رکوع پر سورۂ بقر میں ہے۔ اور پھر یہی آیت بہتر ویں (72) آیت آٹھویں رکوع پر سورۂ مائدہ میں ہے، اور پھر یہی آیت کچھ اختلاف معنی اور الفاظ کے ساتھ سورۂ حج میں سترھویں (14) آیت ہے۔ اس آیت کے منسوخ ہونے کا گمان بھی نہیں ہے کیوں کہ سورۂ مائدہ جہاں تک خیال پڑتا ہے تنزیل کی رو سے آخری سورۃ ہے۔

اور پھر یہ آیت بہ تکرار آئی ہے۔ اس آیت کے سلسلے میں لوگ پہلے بھی لکھ چکے ہیں۔ اور آج عبداللہ ابن یوسف علی نے "صائبین" کی بڑی تحقیقات کی ہیں۔

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ باوجودے کہ بہت سے مفسرین اختلاف کریں گے۔ لفظ "صائبین" کے معنی ہیں، از روئے "قیاس" نیک نیت اور زردشتی وید کے ماننے والے۔ بودھ کنفیوشش اور دوسرے اخلاق کے معلمین کے پیرو بھی شامل کیے جاسکتے ہیں۔

سوالات

آبادی دس لاکھ، پہلے والی کا نام عبدالودود، رقبہ ۴ ہزار میل مربع ۱۹۰۷ء مالا کنڈ کی لڑائی میں لڑتے لڑتے ایک ولایت کا ڈھانچہ تیار ہوگیا۔ ۱۹۲۶ء میں حکومت قائم ہوگئی۔

ٹیلی فون، بجلی تعلیم سب ہی کچھ ہوگیا۔ عبدالودود اَن پڑھ تھے۔ اور شاید آج بھی ویسے ہی ہوں۔

(کشکول)

کشکول محمد علی شاہ فقیر

نمبر ۴

سائیں کی جھولی میں بندے کا دیا، اللہ کا دلوایا۔ کیا کچھ نہیں نکلتا۔ ایک شعر استاد جرأت کا سناتا ہوں۔ یہ ایرسٹا کریٹک شعر نہ روس والا کہہ سکتا ہے نہ امریکہ والا۔ یہ ہندوستان جنت نشان ہی کی سرزمین ہے جہاں یہ پودا لگتا ہے، پھبکتا ہے۔

نالہ و آہ و فغاں سب بُرا دم بھرتے ہیں
آپ کا جان کے سب مجھ پر کرم کرتے ہیں

''دیدی ناچت ہیں مُنہوں نچیہوں'' (میری بڑی بہن ناچتی ہے، میں بھی ناچوں گی)۔ ارے صاحب وہ جوان ہے، اس کے دل میں جوانی کا جوش ہے۔ سِن کا تقاضا ہے۔ امنگ ہے۔ ترنگ ہے، آپ چیاں ریزی کس برتے پر ناچیں گی۔ نہ چھب نہ تختی۔ گات نہ گولائی۔ کیا سبزۂ روئیدہ اُبھرے گا۔ کیا توڑا لیں گی مگر نہیں ناچیں گی ضرور۔ اچھا ناچو، خوش رہو، بابا ہم اللہ کے فقیر ہم کو اس سے واسطہ؟

ہل انسان کی قدیم ترین ایجاد ہے۔ لیکن زمین اس ایجاد سے پہلے بھی جوتی جاتی تھی، اور اس وقت تک وہ سلسلہ جاری ہے، کاشتکاری کی مدد میں کیچوے خاکسار آج بھی اپنا کام کیے جاتے ہیں۔ دریائے نیل کے سیلاب میں نباتات بہہ کر آتے ہیں، ان کو کیچوے کھا جاتے ہیں اور پنچپال بہترین پانس بن جاتی ہے۔ انگلستان میں رومیوں کے زمانے کے آثار اس طرح باقی رہے کہ کیچوے اپنی مٹی سے اوپر کی زمین بنایا کیے۔ اور قدیم آثار نیچے دبے پڑے رہے۔ پتھر وغیرہ کے ریزے بھی اسی طرح نیچے دب جاتے ہیں۔ کیچوؤں کی پیدائش زیادہ کی جائے تو زمین زرخیز ہو جائے امریکہ میں

تجربے کیے جا رہے ہیں۔

ورلڈ ڈائجسٹ اگست 1947

سَودا

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

سوز

یار یوں دور جا بسے اللہ
کیا زمانے کا انقلاب ہوا

کدّر پیا

موری انکھیا ڈھونڈ رہیں
کدّر پیا جن کا تم چاہت تھے
ناجائے کوئے اوُر گئیں
موری انکھیاں...... .... (پیلو)

کہانی میں جیسے راجہ کی بیٹی بال بال گج موتی پرو کر ابھیسار کو جاتی ہے اسی طرح ہندوستان کے دریا پہاڑ ہوائیں، فصلیں، پھل، پھول، اناج، گھاس، پھوس، درندے، چرندے، پرندے، بھارت ماتا کی لٹوں میں پروئے ہیں ان چٹانوں میں صرف کٹنکی چمپا کے پھول ہی نہیں ہیں ان میں مگر گھڑیال بھی ہیں انگریزی مثل ہے۔ مجھ کو چاہتے ہو تو میرے کتے کو بھی چاہو۔ اسی طرح جو کوئی اس ملک کو چاہے اس کی ہر چیز کو چاہے۔ اگر تم نے کوئی چیز چھوڑ دی تو اس معشوق کا سجاؤ کم ہوگیا۔ ''اگر ہم کو پیار

کرتے ہو تو ہماری ہر بات تم کو پیاری ہو۔" معشوق کی یہی آن ہے۔ اور یہی بھارت ماتا کی آن ہے۔ بارہ ابرن سولہ سنگار میں کچھ کم ہوگیا تو ماتا رانڈ ہوگئی۔

خلاف وطن ہر کسے رہ گزید که ہرگز بہ منزل نہ خواہد رسید

سیفو کا ایک شعر

محبت کا زمانہ گذر چکا۔ بہار کب کی جاچکی۔ اگر گئے ہوؤں کو آنسوؤں کی خبر ہوتی ہے تو یقین رکھ تیری معشوقہ موت کی نیند میں بھی تیرے بیٹھے سپنے دیکھتی ہے۔

ایک جاپانی عورت کا شعر

جیسے گہرے سمندر کا پہاڑ ہوتا ہے جوار میں بھی پانی کی تہہ میں رہتا ہے اور بھاٹے میں بھی۔ اسی طرح میری آستین ہمیشہ آنسوؤں سے تر رہتی ہے۔

سات اور جاپانی اشعار

1۔ اے شبنم کے قطرہ۔ لاؤ میں اپنی مصیبت زدہ زندگی کے دھبّے کو تم میں دھولوں۔

2۔ راستے میں چھوٹا پھول کھلا تھا کہ مسافروں کو دیکھے گا۔ گدھا آیا اور اس کو چر گیا۔

3۔ پیاری چھوٹی چڑیا یہ ننھی منّی کھی پھولوں کے بیچ میں مگن ہے، اس کو کیا کروگی کھا کے۔

4۔ دور دراز کی جھیل۔ مدتوں سے سکون کی نیند سو رہی تھی۔ نہ لہر نہ ہچکولا۔
اے لو مینڈک اس میں کود پڑا

5۔ لڑائی کا میدان ہزاروں کے خون سے رنگین بنا آج بہار کے پھولوں سے بھرا پڑا ہے۔ شکست و فتح کے خوابوں کی تعبیر یہ ہے۔

6۔ بوڑھے سفید بالوں والے کا جنازہ، باپ دادا کی ہڑواڑ میں رکھا ہے۔ جو زندہ ہیں لٹھیا پر ٹیک لگائے کھڑے ہیں۔

7۔ باغ کی گھاس کے کیڑے ابھی تو چوں چوں کر رہا تھا۔ کون کہہ سکتا کہ تو یک بارگی چُپ ہو جائے گا۔

اے ہے ان اشعار سے تو غم کے بادل چھا گئے۔ میری محفل سے رنجیدہ نہ اٹھیے۔ ایک ہولی سن لیجیے، اور خوش خوش گھر جایئے۔ نہیں تو مجھ کو شرمندگی ہوگی۔

ساری ڈار ما دینو موپہ رنگ کی گگر

ایسا دھوکہ دیا۔ میں تو بھولے سے دیکھن لاگی ادھر

ساری ڈار دینو.......... ....

بن رنگ ڈارے میں جانے نہ دوں گی۔

جاتے کہاں ہو کدر۔ ساری ڈارد ینو...... (کافی)

(کشکول)

کشکول محمد علی شاہ فقیر

نمبر ۵

کارڈنل نیومین کے مضمون کا خلاصہ ''شریف کا خاکہ''

جی میں جو آوے کیجیو پیارے
ایک ہونا نہ درپئے آزار

شریف کسی کو تکلیف نہیں دیتا ہے اس کا مطمحِ نظر یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے اردو گرد والوں کے خیالات یا عمل میں کسی طرح کی رکاوٹ نہ پیدا ہونے دے۔ وہ بات اس طرح کرتا ہے کہ گویا بجائے خود کہنے یا کرنے کے دوسرے کی گفتگو میں شریک ہو رہا ہے۔ شریف کی کسوٹی یہی ہے کہ وہ ہزار احتیاط و کوشش کرتا ہے کہ اپنے گرد و پیش والوں کے خیالات کی رَو کو روکے نہیں نہ ان میں ہچکولے پیدا ہونے دے۔ اس کی آرزو یہ ہوتی ہے کہ لوگ اس کی صحبت میں بیٹھ کر کھلے ڈلے محسوس کریں اور تکلّف نہ پیدا ہونے پائے۔ وہ تمام مجمع پر اس طرح نظر رکھتا ہے کہ کسی کی بھی رعایت ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ اگر کوئی شرمیلا ہے تو اس کے ساتھ ایسا برتاؤ کرتا ہے کہ معاملات اس پر آسان ہو جائیں۔ اگر کوئی اپنے کو ٹاٹ باہر سمجھتا ہے تو اس کے دل میں یہ کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ بھی اپنے کو پوری طرح شریک کار سمجھے۔ بے تکے کے ساتھ درگزر سے کام لیتا ہے اور مخاطب کی دماغی کیفیات کو جانچ کر اس سے خطاب کرتا ہے۔ ایسے کنائے کا پہلو بچا جاتا ہے جس کو دوسرا خلاف انصاف سمجھے یا جس سے کھرونچا لگے، وہ گفتگو کرنے میں اپنے آپ کو نمایاں کرنے کی کوشش نہیں کرتا نہ اتنا بولتا ہے کہ لوگوں پر گراں ہونے لگے۔

وہ اپنے جذبات ہلکے کر کے ظاہر کرتا ہے اور اس انداز سے احسان کرتا ہے جیسے

وہ خود زیر بار ہو رہا ہے۔ وہ اپنا ذکر صرف مجبوراً کرتا ہے اور اگر اپنے اوپر سے اعتراض دور کرتا ہے تو دوسرے کی غلطیاں دکھا کر طنز کے ذریعے سے اپنی بریت نہیں ڈھونڈھتا۔ وہ غیبت اور تہمتوں میں دل چسپی نہیں لیتا۔ نہ یاوہ گوئی پر کان دھرتا ہے۔ جو لوگ اس سے اختلاف کرتے ہیں، ان کی نیک نیتی پر بے وجہ شک نہیں کرتا، اور دوسروں کے افعال کے معنی لگانے میں تنگ خیالی سے کام نہیں لیتا۔ وہ بحث کرنے میں چھوٹا پن نہیں آنے دیتا۔

وہ مباحثہ میں دوسرے کی فروگزاشت سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھاتا۔ مسئلے اور ذاتیات کو خلط ملط نہیں کرتا، نہ چوٹ کرنے کو دلیل تصور کرتا ہے اور نہ ایسے کنایہ کرتا ہے جس کو صاف صاف نہ کہہ سکے۔

وہ دشمن سے ایسا برتاؤ کرتا ہے جیسے ایک دن دوست ہونے والا ہے اس میں اس قدر صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ بدتمیزیوں کو اپنی بلند نظری سے قابلِ اعتنا نہیں سمجھتا۔ وہ کینہ پروری نہیں کرتا۔ اور دوسرے نے اگر چوٹ کی ہے تو اس کو یاد نہیں رکھتا۔ وہ تحمل سے کام لیتا ہے۔ ضبط کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا اور حکیمانہ نظر سے اپنی قوت برداشت کو زیادہ کر لیتا ہے۔ اور درد کو یہ کہہ کر برداشت کرتا ہے کہ پڑنے والی پڑے ہی گی وہ مفارقت پر یہ کہہ کر صبر کرتا ہے کہ نعم البدل ممکن نہیں ہے۔ وہ موت پر یوں راضی ہو جاتا ہے کہ موت حضرت آدم کی میراث ہے۔ اگر وہ کسی سے بحث میں پھنس جاتا ہے تو اس کا کمایا ہوا ذہن تیز فہم لیکن نیم تربیت یافتہ مقابل کی تند کلامی سے اپنے D کو بچا لیتا ہے کیوں کہ ایسا مقابل اکثر اناڑیوں کے ایسے ہاتھ مارتا ہے جو بجائے صاف کاٹنے کے آری کی طرح کھرونچے دیتے ہیں اور موضوع بحث کو بھول کر ضمنیات میں جا پڑتا ہے جس سے مباحثے میں بجائے سلجھاؤ کے الجھاؤ زیادہ ہو جاتا ہے۔

شریف آدمی اپنی رائے میں صحیح ہو یا غلط لیکن ہٹ دھرمی سے کوسوں دور ہوتا ہے۔ وہ بڑے بڑے لفظوں سے اغلاق نہیں پیدا کرتا اور باوجود اختصار کے بات ایسی کہتا ہے جس کے معنی میں شک نہیں رہتا۔ اس کے کلام کا طرۂ امتیاز تین باتیں ہوتی ہیں:

(۱)۔ صفائی قلب (۲) رعایت اور (۳) درگذر۔ وہ اپنے مقابل کے نقطۂ نظر کو سمجھ کر اس میں درآتا ہے۔ اور اس کی غلطیوں کا سبب دریافت کر لیتا ہے۔

وہ عقل انسانی کے تنگ حدود سے بھی باخبر ہوتا ہے اور اس کی قوت کو بھی جانتا ہے۔ اس کے منصب سے واقف ہے اور اس کی خامیاں بھی اس کے پیش نظر ہیں۔

اگر وہ دہریہ ہے تو اپنے علم کی گہرائی اور وسعت کی وجہ سے وہ مذہب پر آوازے نہ کسے گا نہ اس کی توڑ پھوڑ میں لگا رہے گا۔ اس کی عقلِ سلیم باوجود اس کی دہریت کے اس کو مُلّا ٹا اور متعصب ہونے کے عیوب سے بچا لے گی۔

وہ باوجود اپنے خیالات کے، تقدس اور زہد کو احترام کی نظر سے دیکھے گا اور مذہب کے شعبوں کی حفاظت تک کرے گا۔ کیوں کہ کسی میں قدامت کسی میں خوب صورتی، کسی میں فائدہ ان کے باقی رکھنے کے لیے کافی سمجھے گا۔

ایسا شخص دوسرے مذہب کے بزرگوں کی بھی توقیر کرے گا، گو ان کے خیالات سے اتفاق نہ کرے، اس کے لیے یہ ضروری نہ ہوگا کہ اصول مذہب پر بے موقع اعتراض جڑا کرے یا اُن سے ہر وقت مخالفت ہی جتایا کرے۔ وہ مذہبی رواداری کا ضامن ہوگا۔ نہ صرف اس وجہ سے کہ اُس کا فلسفہ ہر خیال کو منصفانہ نظر سے دیکھنے کی تعلیم دیتا ہے بلکہ اس لیے بھی کہ خود اس کی طبیعت میں ایک نرمی اور لوچ ہے۔

اگر اس کا مذہب کوئی مروجہ مذہب نہیں ہے تو اس کے عقائد میں لازمی وہ بلندی۔ شان اور خوب صورتی ہوگی جس کے بغیر کوئی فلسفہ یا حکمت دنیا میں نہیں پائی جاتی۔

(کشکول)

وزیر گنج (اَودھ) کے غیر مطبوعہ گزیٹیر کا ایک ورق

کہانی وہ جس میں اصلیت کی چھاؤں ہو۔ دعویٰ وہ جس کے لیے کوئی دلیل پیش کی جاسکے۔ میں جو کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں وہ کوئی پا دَر ہوا بات نہیں ہے بلکہ آنکھوں سے دیکھی جاسکتی ہے، ہاتھ سے محسوس کی جاسکتی ہے۔ اگر آدمی عقیدت کا مضبوط ہو تو دل کی مراد بھی پاسکتا ہے۔ یہ وہ قصہ ہے جس سے راستہ ڈھونڈھنے والا نیک راستہ نکال سکتا ہے۔ صوبہ اودھ میں ایک قصبہ قدیم رُدولی ہے۔ آبادی مسلمان شرفاء کی ہے۔ ہنود بھی کافی تعددا میں ہیں۔ اس قصبہ میں کوئی خاص عیب نہیں بیان کیا جاسکتا۔ کوئی خاص صفت بھی نہیں رکھتا۔ لیکن چوں کہ روایات قصبہ اکثر اسلام کے کارناموں سے تعلق رکھتی ہیں، اس وجہ سے باوجود افلاس کے اس کو اسلام ہی کے عیوب و صفات سے زیادہ تعلق ہے۔ شمال و مغرب کے گوشے کی طرف ایک گاؤں وزیر گنج ہے۔ قربت کی وجہ سے فی زمانا رُدولی نوٹیفائیڈ ایریا میں جزاً شامل کر لیا گیا ہے، حالانکہ اس کی آبادی رُدولی سے علاحدہ ہے اور اسبابِ معاشرت و تمدن میں بھی رُدولی سے بے نیاز ہے۔ اس کے ضروری پیشہ ور، مثل بڑھئی، لوہار، خود گاؤں میں موجود ہیں۔ اس کا بنیا، اس کا کلوار، وہیں بستے ہیں، یہاں تک کہ اولیاء اللہ اور شہید مردوں کے معاملے میں بھی رُدولی کی محتاج نہیں۔ چناں چہ چالیس سال ہوئے کہ گاؤں کا کلوار اپنی رُدولی والی دوکان بڑھائے مکان جا رہا تھا۔ ممکن ہے کہ دوکان کا تھوڑا سا سودا دماغ میں لے کے چلا ہو، مگر مورخین اس بارے میں خاموش ہیں۔ قریب گاؤں کے ایک مقام پر بے ہوش ہوکر گر پڑا۔ لوگ گھر اٹھا لے گئے۔ وہاں جا کر اسرار کھلا کہ کوئی جنات صاحب نماز پڑھ رہے تھے۔ آپ نے بلا دیکھے ان کی جائے نماز پر پاؤں رکھ دیا۔ جنات صاحب کی برافروختگی سے معلوم ہوتا تھا کہ شاید حد گستاخی اس سے زیادہ رہی ہو، اور بخیال سبکی نہ بیان کی گئی ہو۔ لیکن انسان اندھی کھوپڑی کیا جان سکتا ہے۔ بہر حال

جنات صاحب اس بات پر اڑ گئے کہ کلوار نا ہنجار ایک قبہ ہمارے نماز کے لیے یہاں تعمیر کرا دے۔ ورنہ ہم سمجھ لیں گے چنانچہ قبہ تعمیر ہوگیا، اور جنات صاحب جو بہ لحاظ بے تکلفی ''مولوی صاحب'' کے نام سے مشہور ہیں۔ اس میں نماز پڑھنے لگے۔ رہنے کے لیے قریب ہی ٹیکرے پر پیپل کا ایک درخت تھا وہ کفایت کرتا تھا۔ مولوی صاحب کے نام سے شک ہوتا ہے کہ شاید یہ صاحب مادر زاد جنات نہ تھے۔ بلکہ اپنے نیک اعمال کی وجہ سے زمرۂ اجنہ میں شامل ہوگئے ہوں۔ بہرحال جو اصلیت ہو، فی الحال تو وہ اچھے خاصے جنّات ہیں۔ اس مقام کا نام دُودھا دھاری ہے۔ مشہور ہے کہ اگلے زمانے میں یہاں کوئی فقیر رہتا تھا، جس کو گاؤں کی گوالن روز دودھ دے جاتی تھی۔ ایک دن فقیر صاحب خوشی کی موج میں تھے، گوالن نے دودھ عمدہ دیا تھا، کہنے لگے جا بٹی تیرا دودھ بڑھے وہ دن بھر بیچا کی، مگر دودھ ویسے کا ویسا رہا۔ گوالن بہت گھبرائی کہ گھر والے کیا کہیں گے۔ مٹکی بھری کی بھری ہے اور پیسے اتنے کما لائی۔ عطائے تو بہ لقائے تو، اس نے مٹکی فقیر کے قدموں کے نیچے انڈیل دی، دودھ کی دھار بہہ گئی اور اس جگہ کا نام دودھ کی دھار سے بن گیا۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہاں کوئی سائیں رہتے تھے جو صرف دودھ ادھاری تھے، یعنی صرف دودھ کا استعمال کرتے تھے۔ یہ نام ان کی نسبت سے پڑ گیا۔ بہرحال اصلیت جو کچھ ہو۔ انداز سے معلوم ہوتا ہے۔ آج کے جنّات از روئے ارتقا اگلے زمانے کی جوگی رہے ہوں تو تعجب نہیں، خیر یہ تو پرانی باتیں تھیں۔ اب یہ کلوار جناب مولوی صاحب قبلہ کا خدمتی ہوگیا۔ اور جمعرات کی مٹھائی، پھول، پان کا حق دار قرار پایا۔ نماز کے حُجرے سے مولوی صاحب کو کچھ ایسا آرام ملا کہ بود و باش کے لیے بھی پختہ عمارت کا خیال آیا۔ اِدھر مالک آراضی نے کسی ضرورت سے وہ پیپل کا درخت جو مولوی صاحب کا اڈّا تھا، کٹوا لیا۔ اب تو مولوی صاحب بہت چراغ پا ہوئے اور کلوار کے ذریعے سے اپنی کبیدگی خاطر کی خبر زمیندار تک پہنچا دی۔ مگر وہاں کچھ اعتنا نہ ہوئی جس سے ان کا ملال اور بڑھا، اور آخر کار انھوں نے سیتلا دیوی سے مل کر اس زمین دار کی سہ سالہ لڑکی کو مار ڈالا۔ اب زمین دار اور جناب مولوی صاحب میں کھلم کھلا صید ٹھہر گیا۔ زمیندار نے بھی ان کے چند ہوا

خواہوں کی اچھی خاصی مرمت کروا دی۔ اب کیا پردہ باقی رہا تھا۔ اس جھگڑے کی خبر گاؤں بھر میں پھیل گئی، اور مولوی صاحب نے بحکم ''القبض دلیل الملِک'' اپنے آئندہ مکان مسکونہ کی داغ بیل بھی ڈلوا دی۔ اور اسی کلوار کے بیٹے کے ذریعے سے مدد بھی لگا دی۔ زمیندار کی طرف سے روک ٹوک ہوئی۔ اہل کاران مولوی صاحب بُری طرح بھگا دیے گئے۔ بلکہ لوگوں کا تو یہ خیال ہے کہ اگر مولوی صاحب بہ نفس نفیس موقعۂ واردات پر موجود ہوتے تو ان کی بھی آؤ بھگت قرار واقعی کی جاتی۔ عین اسی وقت رُدولی میں ہیضے کی وبا عام تھی۔ مولوی صاحب کو موقع ہاتھ آیا۔ اپنے قدیم دوست کی مدد سے اس جدید دشمن یعنی زمیندار کو مار لیا۔ اب کیا تھا مولوی صاحب کے ڈنکے بج گئے۔ طوطی بولنے لگا۔ گاؤں میں ہر جمعرات کو مولوی صاحب دو چار جوان عورتوں کے سروں کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے مشرف کرنے لگے۔ تمام معاملات و مقدمات دیہہ فیصل ہونے لگے۔ ورثائے زمیندار میں صرف ایک کم سِن لڑکا تھا۔ لوگوں نے از راہِ ترحم اس کو مولوی صاحب کے مقابلہ کے لیے نہ بھیجا اور ظاہراً یک طرفہ صلح ہوگئی اور تعمیر پھر سے شروع ہوگئی۔ پٹواری نے بھی خانہ ملکیت میں ''جنّات خاں'' لکھنا شروع کیا۔ سب سے پہلے مولوی صاحب نے اپنی مشغولہ محبوبہ مسماۃ پری کا قبہ بننے کا حکم دیا۔ اس کے بعد اپنی سالی بی مری کا قبہ اس کے برابر بنوایا۔ بعدہٗ خود اپنی قبر اور مقبرہ بنوانا شروع کیا۔ اور چند دنوں میں بہمہ وجود مکمل کروا لیا۔ پرانے لوگوں کی وضع داری دیکھیے کہ باوجود اس محبت و پاس خاطر کے پری کی جگہ علاحدہ قرار دی، اور اپنی قبر کے پہلو میں اپنی منکوحہ بیوی ہی کو جگہ دی۔ پھر اپنے اعزا و احباب کی قبریں تیار کرائیں۔ سب رہائش اور آرام کا انتظام کر کے چار امام باڑے دو مسجدیں، ایک جمعہ مسجد تعمیر کرا دی۔ امام باڑے کے بغل میں امام باڑہ مسجد کے بغل میں مسجد، جنّاتوں کی باتیں جنّات ہی جانیں۔ ہمارے آپ کے نزدیک تو سودائی کا کام معلوم ہوتا ہے۔ جب اس سے بھی فراغت ہوچکی تو چبوترے، فصیلیں، تالاب کی سیڑھیاں، چہاردیواری سے تعمیر کو زینت دی گئی۔ میر تعمیر میاں کلواری صاحب استفسار معاملہ پر گول ہو جاتے تھے۔ اور سوائے اس کے کہ جنّات صاحب عالم رویا میں نقشہ بتاتے ہیں، اور تکیے کے نیچے روپیہ رکھ

جاتے ہیں۔ کچھ نہ کہتے تھے، مگر دنیا کی زبان کس نے بند کی ہے۔ ہر خیال والا اپنے معنی پہناتا تھا۔ خوش عقیدت حضرات قرآن شریف کا حوالہ دے کر کہتے تھے کہ جن وانس کا ہمیشہ سے ساتھ ہے۔ نئی روشنی والے حضرات بھی ہاں میں ہاں ملاتے تھے۔ اور یہ مزید ثبوت کہتے تھے کہ جن وانس کا ساتھ چولی دامن کا کیوں کر نہیں ہے، جن ایک شراب ہوتی ہے اور کلوار بھی اولاد آدم ہے۔ دونوں کا علاقہ محتاج بیان نہیں۔ ایک گروہ متحیر تھا، بہت بڑا گروہ جنات کے خوف سے کچھ نہ کہتا تھا، گاؤں کا تکیہ دار جو ترقی کر کے مجاور ہوگیا تھا زبان حال سے کہتا تھا کہ جن بوتل کے ہوں یا ہوا کے، ہم کو حلوے مانڈے سے کام ہے۔ حلوائی، تنبولی، مالی جس کی بدولت سودا کرتے تھے اس کا بول بالا مناتے تھے۔ ایک فرقہ ایسا بھی تھا جو ''لادریت'' کا آوازہ بلند کرتا تھا۔ "قیل ان الا اللہ دو ولد قیل ان الرّسول قد کھن" جب خدا اور رسول مُشککین کی دستبرد سے نہ بچے تو بے چارے جنات کیا مال تھے۔ اس گروہ کا قول تھا کہ ممکن ہے کلوار ''مانومیک'' رہا ہو۔ طرف داران جنات کہتے تھے یہ ''مانومیک'' کس ولایت کا میوہ ہے۔ اجی حضرت ایک ہندو مذہب والے کو اسلامی عمارت سے کیا واسطہ۔ اگر جنات کا پاؤں درمیان میں نہ ہوتا تو ایک ہندو ایسے کام میں کا ہے کو ہاتھ ڈالتا۔ وہ جواب دیتے تھے۔ اکثر اہلِ ہنود مسلمانوں کی مذہبی مراسم برتتے ہیں۔ طرف داروں کی طرف سے دوسرا سوال ہوتا تھا کہ اچھا یہ سب صحیح، مگر کلوار اس قدر روپیہ کہاں سے لایا۔ معترضین کہتے تھے کہ ممکن ہے کہ دفینے والی روایت صحیح ہو اور گواہی میں زمیندار کے کارندوں کو پیش کرتے تھے، جنھوں نے دفینے کی افواہ سن کر تحقیقات کی تھی۔ اور ٹوٹے گھڑوں کے اندر سیاہ سیاہ مدور نشان دیکھے تھے۔ طرف دار یہ بھی کہتے تھے کہ کلوار بے چارے کو کیا تمیز تھی کہ وہ مسلمانوں کے اصولِ فن تعمیرات کی پابندی اس خوبصورتی اور خوش اسلوبی سے کرسکتا۔ مُشککین جواب دیتے تھے کہ ہر معمار جس کے گھر میں یہ کام دو چار پشت سے ہوتا چلا آتا ہے۔ ایسی عمارتیں بنا سکتا ہے۔ اور اس پر بھی کلواریت کا تصرف جا بجا پایا جاتا ہے مقبروں کے گنبد اسلامی نہیں کہے جاسکتے۔ راسخ العقیدہ حضرات زچ ہو کر کہتے تھے کہ اچھا اگر آپ اپنے خیال کے پختہ ہیں تو رات کو وہاں

ہو تو آیئے۔ چوں کہ اس شرط کو آج تک کسی نے پورا نہیں کیا اس لیے از راہِ انصاف غیر جذبہ دار لوگ عقیدت مندوں ہی کو ڈگری دیتے چلے آئے ہیں۔ اس میں کلام نہیں کہ رات کو وہاں کوئی آدمی نہیں جاتا۔ البتہ اہلِ دیہہ جو اکثر اُدھر سے قریب ہو کر نکلتے ہیں مختلف روایات گانے بجانے، گھونگرو، اللہ اکبر، الا اللہ کی آوازوں کے بیان کیا کرتے ہیں۔ مشہور یہ ہے کہ رات کو مولوی صاحب محفل رقص و سرور ترتیب دیتے ہیں اور باوجود کبر سنی کے مسماۃ پری کی صحبت سے دل بہلاتے ہیں۔ اکثر لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ رات کو انھوں نے کبھی کبھی دور سے ایک عورت اور مرد کو وہاں ٹہلتے ہوئے بھی دیکھا ہے اور پھر نظروں سے اوجھل بھی ہوگئے ہیں۔ چونکہ رات کو وہاں انسان نہیں جاسکتا، پھر آپ ہی فرمایئے، سوائے جنات کے اور کون ہوسکتا ہے۔

اس مکان میں چند سال پہلے کچھ جھاڑ فانوس، قمقمہ، قندیل وغیرہ کی آرائش تھی۔ مگر اب نہیں ہے۔ انھیں چیزوں کے متعلق ایک عجیب قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ چونکہ دس ہی پندرہ برس کی بات ہے۔ لہٰذا بالکل بے اصل نہیں ہوسکتا۔ یوں تو واقعہ مختلف پیرایوں میں بیان ہوتا ہے۔ لیکن چھان بین کرنے والے حضرات یہ کہتے ہیں کہ ایک شخص یہاں سے کچھ شیشۂ آلات چرا لے گیا تھا۔ کلوار نے رپورٹ وغیرہ نہیں لکھوائی۔ بلکہ یہ کہا کہ جس کا مال ہے وہ جانے، جو لے گیا ہو وہ جانے جس شخص نے چوری کی تھی، مال لے کر فیض آباد پہنچا۔ اسی وقت ایک بزرگ بلند بالا، عبا و قبا، جریب دستار والے تھانے دار صاحب کے پاس پہنچے، اور اپنے نقصان کی رپورٹ زبانی دے کر مال کا نشان اور پتا بتا کر نظروں سے غائب ہوگئے۔ چنانچہ اسی نشان دہی پر مال برآمد ہوگیا، اور ملزم سزا پا گیا۔

تھانے دار صاحب کے جاننے والے کہتے ہیں کہ داروغہ جی کوئی لغو آدمی نہ تھے۔ اور قسمیں کھا کر بیان کرتے تھے کہ رپورٹ بوقت اول، صبح صادق، جو صبح کاذب بھی کہی جاسکتی ہے، ہوئی تھی، وہ بزرگ رپورٹ کرکے نظروں سے غائب ہوگئے۔ ہزار آنکھیں مَل مَل کر دیکھا، مگر پھر نظر نہ آئے، داروغہ صاحب بہ حلف کہنے کو تیار ہیں کہ وضع قطع ریش سفید، لب و لہجہ ان کا بالکل جنات کا سا تھا، کیوں کہ انھوں نے ایسا نور

والا چہرہ انسان کا کبھی نہیں دیکھا۔

اس میں کلام نہیں کہ تھانے دار صاحب کے معاندین اس واقعہ کو ایک دوسرا رنگ دے کر پیش کرتے تھے، جس میں وزدو عسس کے ساتھ ساتھ ایک زنِ بازاری کا ذکر بھی تھا۔ مگر اس بہار دانش کی سیر کا دماغ کس کو ہے۔ "ظن المومنین خیرا" اور تحقیق کہ ہر تھانے دار مومن ہے۔

اسی قبیل کے مختلف واقعات جناب مولوی صاحب کی کرامتوں کے لوگوں کی زبان پر ہیں، جن کا جمع کرنا، اور شائع کرنا خالی از زحمت نہیں۔ اگر کسی صاحب کو ان واقعات میں شک ہو تو رُدولی اہالیانِ اودھ کے لیے کوئی دور نہیں ہے۔ غیر صوبہ جات کے لوگ بھی بآسانی پہنچ سکتے ہیں۔ مگر خوش عقیدگی شرط ہے۔ ورنہ صرف مکان نظر آئے گا، مکیں کی زیارت مشکل ہے۔

(کشکول)

ٹیگور

رابندر ناتھ ٹیگور نے بہت سے کام کیے اور ہر کام میں چار چاند لگا دیے۔ گانے میں نئے نئے راستے نکالے۔ بڑھاپے میں تصویر کھینچنے کی سوجھی۔ وہ تصویریں کھینچیں کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں روشن ہوگئیں۔ رنگوں کو زبان دے دی۔ لائنس کو وہ کمال بخشا جیسے کوئی سامنے کھڑا بھاؤ بتا رہا ہے، اور پھر اپنا رنگ سب سے الگ رکھا، کبھی کسی کی نقل نہیں اتاری۔ پالیٹکس جس سے شاید ان کی طبیعت کو مناسبت نہ رہی ہو، اس میں بھی بڑے بڑے کام کیے۔ تقسیم بنگال کے واقعات جس کو یاد ہوں گے وہ جانتا ہوگا کہ ٹیگور نے اس میدان میں بھی کیا کچھ کرکے نہیں دکھایا، مگر ہر چیز میں اپنا رنگ چوکھا رکھا۔ اس زمانے میں بنگال میں بہت سی باتیں ملک پرستی کے نام سے ایسی بھی ہوئیں جن میں بناؤ کم اور بگاڑ زیادہ تھا۔ برخلاف اس کے ٹیگور نے جو کچھ بتایا جو کچھ سکھایا کسی چیز میں تعمیری پہلو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ زراعت کی طرف انھوں نے لوگوں کو مخاطب کیا کوآپریٹیو کام میں انھوں نے حصہ لیا۔ سب کچھ ہوا مگر دل کوئی اور ہی چیز ڈھونڈھا کیا۔ آخر پالیٹکس چھوڑ چھاڑ کے اصلی رنگ پر آگئے، شاعری اور تعلیم شانتی نکیتن کے نام سے کون سا مہذب ملک ہے جو نہیں واقف۔ گیتانجلی نے کس ملک کو روحانیت کا پیغام نہیں پہنچایا۔ اس اسّی برس کی چھوٹی سی زندگی میں ایسا کردیا کہ ہندوستان بھی ادبی پہلو سے کسی گنتی شمار میں آنے لگا۔ اسّی برس کی کم عمری نہیں کہی جاسکتی۔ اگر ہم نے اتنی عمر پائی تو اجیرن ہو جائے گی۔ خود ہمارے کاٹے نہ کٹے گی۔ اور دوسروں کے لیے آندھی روگ ہی آوے گا۔

لیکن ٹیگور کے لیے ایسا نہیں کہا جاسکتا۔ سمپسن (Sampson) جب اندھا کر دیا گیا، تو اس نے کہا روشنی کی ایسی نعمت اتنی چھوٹی مختصر اور نازک جگہ میں کیوں رکھی گئی کہ جس بدتمیز کا دل چاہے اس کو بگاڑ کر اندھیر کردے، ارے اس کو تو سر سے لے کر

پاؤں تک ہر جگہ ہونا چاہیے کہ اگر کوئی مٹانا بھی چاہے تو نہ مٹا سکے، یہی حال اچھے آدمیوں کی زندگی کا ہوتا تو خوب تھا۔ اسی وجہ سے میں کہتا ہوں کہ ٹیگور اگر صرف اسی برس جئے تو کیا جئے ان کو تو اس طرح جینا چاہیے تھا کہ جیسے ان کی شاعری زندہ رہے گی۔ رابندر ناتھ ٹیگور کے بہت سے کاموں میں اس وقت میری نظر میں دو کام ہیں، ایک تو ان کی یہ کوشش کہ دنیا ملک اور قوم کی پوجا چھوڑ کر آدمی کی پوجا کرنے لگے۔ اور یہ سوچنے کے پہلے کہ ہم جاپانی ہیں اور ہم روسی ہیں۔ ہر شخص یہ کہے کہ ہم انسان ہیں اس میں ٹیگور ویسے ہی ناکامیاب رہے، جیسے بابا آدم ہابیل قابیل کے ملانے میں ناکامیاب رہے تھے آیا ایسا سبق دینے میں وہ کامیاب ہو بھی سکتے تھے یا نہیں۔ اس کو آپ لوگ طے کیجیے۔

دوسرا کام ان کی شاعری ہے۔ اس چیز میں کامیابی کے ڈنکے بجے ہوئے ہیں۔ دنیا ان کا لوہا مانے ہوئے ہے۔ ہم کیا اور ہماری تعریف کیا اگر کچھ کہیں گے بھی تو اپنا دل خوش کرنے کے لیے۔ ٹیگور دنیا کا شاعر ہماری تعریف کا محتاج نہیں۔ ٹیگور کی نظمیں پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ پڑھنے والا تھوڑی دیر کے لیے دوسری دنیا میں پہنچ گیا ہے۔

ٹیگور کے یہاں اگر صرف اسی قدر ہوتا تب بھی ان کا سکہ دنیا کی ادبی تاریخ پر بیٹھ چکا ہوتا مگر ان کے یہاں تو نہ معلوم کیا کیا ہے۔ شاید گارڈنر میں ایک جگہ کہتے ہیں ''جو گیا رے توئی کا ہے مورے دُوارے بین بجاوے۔'' سوچیے ذرا اس کے مزے تو لیجے۔ لیجیے پھر پڑھے دیتا ہوں۔

''جو گیا رے توئی کا ہے مورے دوارے بین بجاوے''

کون اس کے معنی سمجھا سکتا ہے۔ اس کے مزے روح لیتی ہے دوسری دنیا سے معلوم ہوتا ہے کوئی تار لگا ہے جو دل میں کھٹ سے ہو جاتا ہے، کہیں سے پیغام تو ضرور آتا ہے مگر اس پیغام کے معنی پوری طور سے سمجھ میں نہیں آتے جیسے کسی عورت کے پاس اس کے شوہر کا خط دوسرے دیس سے آوے وہ پڑھ نہ سکتی ہو مگر لفافہ کھول ڈالے، اس کے اندر دو چار سوکھی سوکھی پنکھڑیاں گلاب کی رکھی ہوں اور اس وجہ سے وہ بغیر خط کو پڑھائے مطلب سمجھ جائے، پھر بھی خط پڑھانے کی ضرورت باقی رہے۔ اس

بھجن میں یہ سب کچھ موجود ہے۔ رہا پورے مطلب کا پڑھوا کر سُنتا یعنی بھجن کا پیغام پورم پور پا جانا یہ ہمارے آپ کے سمجھنے کی چیز نہیں، وہ ہماری روح کا ٹکڑا جانے اور وہ سوچا جہاں سے وہ ٹوٹ کر آیا ہے کہ جوگیا دوارے آکے بین کیوں بجاتا ہے، ہمارے قدیم شاعر ودیاپتی کی زبانی رادھکا نے اپنی سہیلیوں سے شری کرشن کے رہچلوں کا حال بیان کیا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے جوگی بین پر کیا بجاتا ہے اور کون سمجھاتا ہے۔ ایک جگہ ٹیگور نے کہا ہے۔ میں تیرے بھجن گانے کے لیے پیدا ہوئی ہوں، میرا دل چاہتا ہے کہ آدھی رات کے سے سکوت کے مندر میں مجھ سے خاموشی کا گانا سُن اور صبح کو دربار میں نکلا۔ ہر مذہب میں دو طرح کی عبادتیں ہیں۔ ایک ضروری جن کو انگریزی میں ریچولسٹک کہتے ہیں اور ایک وہ جو محبت کے تقاضے سے بعض پاک دلوں میں آتی ہیں۔

صاف بات ہے کہ اس قسم کے ذاتی رشتے خود آدمی نہیں قائم کرسکتا، جیسے تالی بن دونوں ہاتھ کے نہیں بجتی اسی طرح یہ بھی بغیر اوپر کے اشارے کے نہیں ہوسکتا، یہ آدھی رات کے سے سکوت کا مندر خاموشی کا گانا وہی آرزو ہے جو شاعر کے دل میں پیدا ہوئی ہے۔

پھر ایک ایک لفظ غور کرنے کے قابل ہے، آدھی رات کے سے وہ تجربہ ہے جو نہ صرف ہندوستان والوں پر موقوف ہے۔ بلکہ ہر ملک میں اور ہر صاحب دل کو معلوم ہے مسلمانوں کے ایک بہت بڑے شخص علیہ السلام کا قول ہے کہ آدھی رات کے تیر نہیں خطا کرتے، مسلمانوں کے یہاں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ رات کے وقت دو دو چار چار آدمی اٹھو اور غور کرو (ممکن ہے۔ الفاظ میں مجھ سے کچھ فرق ہوگیا ہو، مگر مفہوم یہی ہے) عیسائیوں کی (Litony) مسلمانوں کے یہاں تہجد، ہندوؤں کے یہاں دھیان اور بابی قرۃ العین کے یہاں اندھیرے منھ کی آہ۔ یہ ہے ٹیگور اور یہ ہے نور کی زنجیر جس، میں سب مذاہب ایک سلسلہ میں ہیں جیسے موتیوں کی لڑی جیسے آنسوؤں کے تار۔

خدمت کو ایک جگہ سراہا ہے جس کو پڑھ کر تھوڑی دیر کے لیے سمجھ میں آتا ہے کہ غریبی پر سے امیری قربان کی ہے۔ کہا ہے، میں بہت جھکڑ کے زمانے کا وہ اجلا بادل

ہوں جو ہوا سے ہلکا اور برسنے والے پانی سے خالی ہے اگر تم کو میرا رنگ روپ دیکھنا ہے تو دھانوں کی ہریالی میں دیکھو پھر فرمایا ہے۔ جو دوسروں کی بھلائی کرتے پھرتے ہیں۔ ان کو خود بھلے ہونے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ میرے سننے والو، اس شعر کا مطلب بالکل صاف ہے۔ ماشا اللہ آپ تو ضرور سمجھ گئے ہوں گے۔ اگر اتفاق سے آپ نہ سمجھے ہوں تو میں نہیں سمجھا سکتا۔ کیونکہ مجھ کو ڈر لگتا ہے کہ کہیں لوگ خفا نہ ہو جائیں۔ شاعری وہ ہے جس کی سچائی دل میں اتر جائے۔ ایک جگہ کہتا ہے، انھوں نے نفرت اور قتل سے کام لیا، خدا کو شرم لگی اور اس نے سبز گھاس سے اس کو چھپا دیا۔

(دیگر) آج کھجور کے پتے مل رہے ہیں چودھویں کا چاند سمندر کو ابھار رہا ہے، جیسے زمین کا دل دھڑک رہا ہو تو اس مسو سے دل میں محبت کا میٹھا درد کس آسمان سے لے آئی۔'' اہا ہا ہا کوئی شک نہیں کہ ٹیگور ہندوستان ہی کا شاعر نہیں تھا، بلکہ دنیا کا شاعر تھا۔ اور میں تو کہوں گا کہ عبقلی (؟) بھی شاعر تھا۔ ایسے ایسے پیغام لاتا ہے کہ اس دنیا میں تو اس کا پتہ نہیں چلتا ہاں البتہ حضرت سلیمان اور حضرت داؤد کے مواعظ وغیرہ پڑھیے اور اس کے بعد ٹیگور کا بھجن پڑھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ بھجن نہیں بلکہ کوئی خوب صورت عورت مذہب اور عقیدت کا چونکھ چراغ جلائے اس کی روشنی میں اکھیسار کو جا رہی ہے۔

حضرات شاعر کا صرف یہ کام نہیں ہے کہ وہ آپ کو نئی نئی باتیں ہی بتایا کرے، بلکہ وہ یگانگی، ہمدردی بھی کرتا ہے بچ کی محبت بھی جتاتا ہے، رنج اور مصیبت میں دل بھی بہلاتا ہے۔

ایک مرتبہ میرے ایک دوست پر مصیبت پڑی ان کا قول تھا کہ میری دلی تکلیف میں تین آدمی بہت کام آئے، ایک تو ایک شاعر ہیں اور موجود ہیں، اگر ان کا نام لے لوں گا تو لوگ کہیں گے کہ دوستوں کا اشتہار دینے کا اچھا طریقہ نکالا ہے۔

دوسرے حافظ شیرازی علیہ الرحمۃ۔ تیسرے ٹیگور کی مثال دیتے تھے۔'' قصہ ذرا طولانی ہے مگر سُن لیجیے۔

ٹیگور کی ایک نظم ہے اس کے مرنے کے بعد میں نے اس کے اسباب میں خطوط کی ایک پوٹ پائی، یہ وہ خطوط تھے جو میں نے کبھی اس کو لکھے تھے۔ اس نے میرے خطوط اس احتیاط سے عمر بھر رکھے، اب میں اس کے احسان سے اس طرح سبکدوش ہوسکتا ہوں کہ وہ اپنے لکھے ہوئے خطوط صرف اسی وجہ سے کہ اس نے ان کو محفوظ رکھا تھا، عمر بھر حفاظت سے رکھوں۔

بیان کرنے والے کا بیان ہے کہ مجھ کو بھی اسی طرح کا ایک خطوں کا پوٹ ملا تھا جو مجھ کو بھی ایسا ہی عزیز تھا، جیسے ٹیگور کو ان کے خطوط رہے ہوں گے۔ صرف فرق اتنا تھا کہ یہ معلوم کرکے کہ شاعر بھی بالکل اسی طرح کی مصیبت میں پڑچکا ہے۔ ایک طرح کی تسکین ہوتی تھی۔ جیسے بے آب ریگستان میں کسی دوسرے ہم سفر کو پا کر ہوتی ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ دنیا شاعروں سے بھری پڑی ہے، مگر ایسے شاعر بہت کم ہیں کہ جن کی شاعری سے نج کے معاملات میں مدد ملتی ہو۔ حافظ کے یہاں فال دیکھی جاتی ہے جو ممکن نہ تھا اگر شاعر کے خیالات فطرت کے موافق اور اس طرح دوسروں سے ملتے جلتے نہ ہوتے۔

جرمن شاعر گوئٹے کے لیے بھی یہی کہا جاتا ہے دوسروں کے خطوط آج بھی کلیجہ نکال لیتے ہیں۔ اور بھی بہت سے ہوں گے میرا دعویٰ صرف یہ ہے کہ ٹیگور بھی انھیں نادر اور کمیاب شاعروں میں سے ہیں جو اکثر نج کے موقعوں اور روزمرہ کی زندگی میں کام آتے ہیں۔

ایک مثال اور سن لیجیے۔ ایک گھر میں کئی ایک لڑکیاں تھیں کسی کو ماں سب سے زیادہ خوب صورت کہتی تھی۔ کسی کو باپ سب سے زیادہ خوبصورت کہتے تھے، ایک لڑکی تھی جس کو ماں باپ کے علاوہ دوسرے بھی خوب صورت کہتے تھے، مگر ایک بات پر سب متفق تھے یعنی یہ لڑکی؟ گھر کی سنڈریلا تھی، ہر وقت کام کاج میں لگی رہتی تھی۔ برناڈ شا نے کہا ہے کہ سب سے کم بدصورت لڑکی خاندان کی پری کہلاتی ہے۔ قصہ مختصر یہ وہی خاندان کی پری تھی؟ جس کو بدقسمتی سے چیچک نکل آئی۔ دشمنوں کی نظر لگ گئی، جان کے لالے پڑ گئے۔ بیماری کٹ گئی مگر رنگت جانے اور چیچک کے نشانوں کا دھڑکا

چاہنے والوں کے دل پر تھا۔ اتنے میں ٹیگور نے مدد کی۔

ان کی ''اسٹرے برڈس'' میں ایک شعر نکل آیا۔ چاند نے کہا میری چاندنی سب کے لیے ہے میرے داغ صرف میرے لیے۔'' میرے سننے والو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس شعر نے وہ کام کیا کہ مرہم کیا کرے گا، نہ صرف وہ لڑکی اپنی مصیبت پر راضی ہوگئی بلکہ گھر میں اس شعر کی وجہ سے ہر شخص کا رنج کم ہوگیا۔

اس طرح کی صرف ایک مثال اور اسی پر ختم اور آپ حضرات کے لیے دعا۔ اے عورت جب تو اپنے گھر کے کاروبار میں چلتی پھرتی ہے تو تیری چال میں ایک بے تکلفی ہے، جیسے پہاڑی ندی کنکریوں کے اوپر سے گاتی ہوئی بہتی ہے۔ میرے مرد سننے والو، اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہیے گا کتنی بار اس نے دنیا کو جنت بنا دیا ہے۔ میں نے بھجوں کا ترجمہ انگریزی سے اسی طرح کیا ہے جیسے فٹز جیر یلڈ نے عمر خیام کا ترجمہ کیا ہے یعنی لفظی ترجمہ نہیں ہے، صاف بات ہے، کہ کہاں ٹیگور کی زبان اور کہاں ہماری۔

لیکن یہ کوشش ضرور کی گئی ہے کہ جہاں تک بس چل سکے خیالات وہی رہیں۔ نہ معلوم کامیابی بھی ہوئی یا نہیں حالانکہ اس کی امید بہت کم ہے۔ کیونکہ خود ٹیگور نے ایک شعر میں کہا ہے، لوگ مجھ سے اکثر پوچھتے ہیں کہ تمھارے اس شعر کے کیا معنی ہیں۔ میں جواب دیتا ہوں کہ اس کے کچھ معنی نہیں۔

گرو دیو اسی برس میں تمھارے ملک کی پیاس نہیں بجھی، پھر لوٹ آؤ اور دیس کو سیراب کرو۔

(کشکول)

''پیرس کی ایک کہانی اناٹول فرانس کی زبانی''

فرانس میں عشق و محبت کی کہانیاں جیسے بچوں کا ہپّا کہ اگر ہر وقت پائے جائیں تو بھی منہ نہ پھیریں۔ زندگی کی نعمتوں، جوانی کی دلچسپیوں کو جیسا فرانسیسی سمجھے ہوئے ہیں کوئی کیا سمجھے گا۔ بی اے کی ڈگری سے کون ناواقف ہے۔ اس کے لفظی معنی ہوئے فنون لطیفہ کا کنوارا۔ کنوار پن میں جنس کا پہلو ظاہر ہی ہے۔ فنون لطیفہ کی بہت سی راہوں کو بعض مذاہب نے شاید اسی وجہ سے روک دیا ہو کہ یہ فنون اگر جنس میں شریک نہیں ہیں تب بھی جنس کی طرف راستہ ضرور سیدھا کر دیتے ہیں۔ آج ساربان یونیورسٹی میں چلے جایئے طلبا کو دیکھیے گا کہ ایک ایک خوبصورت لڑکیاں ڈوریائے چلے جاتے ہیں۔ کسی نے یوں ہی تصویر کھینچی، کسی نے فطرت کی نعمتوں کو بہتر سمجھنے کے لیے ماڈل کے کپڑے اتروا ڈالے۔ جسم کا اتار چڑھاؤ، گات کی گولائی چھب، تختی، جلد کی گھلاوٹ، پنڈے کی کساوٹ دیکھ کر کہنے لگا واقعی اللہ میاں سب سے بہتر فنکار ہیں۔ تصویر کھینچ چکے لے چلے کسی رستوران میں اس کو کھلانے پلانے۔ مقررہ زمانے کے بعد اگر کوئی تصویر قبول ہوگئی تو بی اے کا سرٹیفکیٹ مل گیا۔ یہ ہیں فنون لطیفہ اور یہ ہیں ان کے فرانسیسی قدردان۔ انھیں یونیورسٹیوں سے وہ لوگ بھی نکلے ہیں اور نکلتے ہیں جنھوں نے دنیا کو فلسفہ، معاشرت، پالیٹکس، سائنس اور دوسرے علوم کی نئی راہیں دکھائی ہیں خود اس کہانی میں ایسوں کے نام موجود ہیں جو اسی طرز سے پڑھے اور جو صفحہ تاریخ پر اپنے نام لکھ کر چھوڑ گئے ہیں۔ فرانس کے ملکی اداروں میں سے ایک فرنچ اکیڈمی بھی ہے جس کے چالیس ممبر ہوتے ہیں۔ فرانس ان کو چن کر اپنی توقیر بڑھاتا ہے اور یہ اپنے علمی کارناموں اور اپنی ایجاد سے اکیڈمی کی شہرت بڑھاتے ہیں۔ یہ علوم اور فنون لطیفہ کے ذمہ دار اور ملک کی خوش مذاقی کے مختار عام ہیں۔ مختلف شعبوں میں جب انھیں علماء کی مہر لگ جاتی ہے تب وہ چیز قبول ہوتی ہے۔ چنانچہ بہترین نظم کا بھی انعام یہی لوگ دیتے ہیں۔ ایک مرتبہ اکیڈمی کی طرف سے اسی طرح کا ایک اشتہار نکلا۔

لیکن انعام صرف دو ہزار فرینک مقرر تھے حالانکہ ان چیزوں میں نقدی انعام کچھ حقیقت نہیں رکھتا، مگر پھر بھی اوچھی سی رقم تھی اس لیے ملک کے بہترین شعراء نے کچھ اعتناء نہ کی۔ ایک تھیں ''میڈم کولے'' صورت شکل نک سک کی درست پڑھی لکھی، شعر بھی کہتی تھیں۔ شاعر مزاج بھی تھیں۔ بدقسمتی سے ان کی شادی ہوئی تھی ایک موسیقی کے معلم کے ساتھ، بے چارے معمولی حیثیت کے آدمی، موسیقی، ریاضی کی ایک شاخ ہے۔ ریاضی میں دو دونا چار، دوتیاں چھ الاپ کو رنگینی سے کیا واسطہ، پھاگن کی چڑیوں کی بے تابی، بے اختیاری پکے گانے میں کہاں ''میڈم کولے'' جن چیزوں کو ڈھونڈتی تھیں وہ اس تعلیمی گانے میں کیسے ملتیں۔ دل میں نہ معلوم کون کون تمنائیں کون کون آرزوئیں بھری تھیں، مگر جی مسوس کر رہ جاتی تھیں۔ نظم کا اشتہار دیکھ کر میڈم نے بڑی محنت سے نظم تیار کی اور بھیج دیا۔ خدا کا کرنا اور ان کی محنت کا پھل انعام مل گیا۔ اب دل کی بات پوری ہونے کا سامان بندھ گیا۔ اکیڈمی کے ممبروں سے ملاقات ہوگی ان کی صحبت میں بیٹھیں گی۔ ہنرشناسوں کے سامنے عرض جوہر کا موقع ملے گا۔ بیگم صاحبہ زیور، کپڑوں سے لیس ہوئیں، عورتوں کے ظاہری اور باطنی سلح خانے کے تمام حربے سنبھالے، اوپچی بن کر چلیں اکیڈمی کے ممبروں کا شکریہ ادا کرنے، سب سے پہلے بڑے فلاسفر ''رابرٹ کولیر'' کے یہاں پہنچیں۔ یہ صاحب فلاسفر تو تھے ہی مگر دلگی باز بھی واقع ہوئے تھے۔ بارہ ابھرن سولہ سنگار نازوادا کا ٹھاٹھ دیکھ کر بات کی تہہ کو پہنچ گئے کہ شکریے کے ساتھ ساتھ شکار کا بھی ارادہ ہے۔ انھوں نے مسکراہٹ کی بجلی چمکائی تھی کہ انھوں نے کہا ''ارے میں نے کیا کیا آپ کی طرف سے لڑے تو ''وکٹرکزن'' انھوں نے تمام ووٹ توڑ کر آپ کو دلوا دیے، نہ معلوم کون کون پیچ لڑائے کون کون فند کیے کچھ ایسے جتن کیے کہ دیکھنے والے دنگ رہ گئے۔ سننے والوں نے سرتسلیم خم کیا کون تھا جو ''وکٹرکزن'' کے انتخاب کو نظری کرتا۔'' یہ سن کر میڈم کولے، نے تجویز کرلیا کہ سب کچھ چھوڑ کر ''وکٹرکزن'' ہی کے مورچے پر حملہ کیا جائے، یہ مورچہ ٹوٹا تو فتح مندی ہاتھ باندھے کھڑی ہے پہنچیں ''وکٹرکزن'' کے یہاں لیجیے صاحب تاج الحکماء افسرالادبا۔ نقادوں کے بادشاہ، کانٹ اور ہیگل کے مفسر مل اور آسٹن کے بے تکلف دوست میڈم ''زاک میتھر'' کے گھر کے معزز آنے جانے والے جن پر فرانس نے وہ تمام علمی اعزاز جو فرانس دے

سکتا تھا نچھاور کیے تھے۔ کھیت رہے، ''وکٹرکزن'' جوان رعنا، دیدارو، منتخب زمانہ، بذلہ سنج جو باتوں میں دل موہ لیں، جن کے اوپر جوان لڑکیوں والی مائیں صدقے قربان تھیں جن کو دیکھ کر نہ معلوم کتنی عورتیں ٹھنڈی سانسیں بھرتی تھیں اور رال کی طرح ٹپکی پڑتی تھیں۔ ان کا پہلے ہی نظارے میں یہ حال ہوا، جوانو عبرت پکڑو، ان صاحب کی آستین آج تک نہ کسی کے عشق میں تر ہوئی تھی نہ دامن بھیگا تھا۔ ''وکٹرکزن'' نے اپنی قوتیں اپنے جذبے انسانی عقل و دماغ کی ترقی کے لیے وقف کردیے تھے۔ صورت شکل علم عقل کے رو سے فرانس کا بہترین نمونہ تھے۔ مگر راستہ انھوں نے برفستان کے راہبوں کا اختیار کیا تھا لیکن افسوس نتیجہ ان سب باتوں کا کیا نکلا ۔

لچکنے ہی نے اس کے مار ڈالا
کٹاری تو نہ تھی اس کی کمر میں

میدان میڈم کولے کے ہاتھ رہا۔ اب کیا تھا راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔ اکیڈمی کا سالانہ مقابلہ ان کی میراث ہوگیا۔ ''وکٹرکزن'' کی محبوبہ کے ہوتے اکیڈمی کے چالیسوں آدمی دوسرے کو کیسے انعام دے سکتے تھے۔ کئی سال کے بعد ایک مرتبہ ان کو نظم تیار کرنے کا موقع نہ ملا۔ صبح کو نظمیں داخل ہوں گی اور یہاں ابھی قلم تک نہیں اٹھایا تھا۔ میڈم کولے نے ''فلابیر'' اور ان کے دوست ''بولہے'' کو بلا بھیجا، ایک کمرے میں ایک بوتل اور سگریٹ رکھ دیے۔ دروازہ باہر سے بند کردیا، اور کہا کہ جب تک نظم تیار نہ ہوگی دروازہ نہ کھلے گا۔ رات کے بارہ بج گئے بوتل خالی ہوگئی۔ تمباکو دھواں ہو کے اڑ چکی اور یہاں ایک شعر بھی نہ ہوا۔ مجبوراً ایک نے الماری سے ''لامارٹین'' کا دیوان اٹھایا اور فال کی طرح کھول کر پڑھنے لگا اور دوسرے نے لکھنا شروع کیا اور تقریباً دو سو مصرعے لکھ ڈالے نظم تیار ہوگئی۔ انعام بھی مل گیا۔ معلوم ہوا کہ زندہ جاوید ادیب انعامی انتخاب میں نظمیں پڑھتے نہیں ہیں۔ یوں ہی انعام دے دیتے ہیں۔

ٹائمس آف لٹریچر
(کشکول)

ہندستان کی سیر

نہ کوئی کہانی ہے نہ کوئی قصہ، روزمرہ کی باتیں ہیں۔آخر بے کاری میں وقت کیسے کٹے، لیجیے بھی سنیے، لڑائی کے زمانے میں ریل گاڑیوں کا کوئی حساب نہیں، سواری گاڑیاں کم اور مال گاڑیاں زیادہ۔ بیچ بیچ میں فوجی اسپیشل، قصہ مختصر نہ چلنے کا ٹھیک نہ پہنچنے کا ٹھکانا، مگر پاؤں کا سنیچر دوڑائے پھرتا ہے۔ اگر کسی درجہ میں چپقلش کم ہوئی۔ ہم سفر مرد آدمی ہوئے تو وقت اچھی طرح گزر گیا نہیں تو میر تقی میر کی طرح جیسی پڑی جھیل لی ۔

عمر کٹنے کو کٹی پر کیا ہی خواری سے کٹی

ہم پانچ آدمی ایک درجہ میں بڑی دیر سے بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک مال گاڑی آکر جاچکی تھی۔ ایک فوجی اسپیشل جانے والی تھی۔ ہم لوگوں کو اپنی گاڑی چھوٹنے کا وقت معلوم نہ تھا، ہمارے ہم سن ایک مولوی صاحب تھے۔ نوجوان آدمی، حمائل گلے میں اور ڈنڈا ہاتھ میں۔ تھوڑی ہی دور کے مسافر معلوم ہوتے تھے۔ دوسرے صاحب ایک پنڈت جی تھے۔ ایک طالب علم اور ایک وکیل صاحب کچھ ہوائی جہاز کا ذکر ہو رہا تھا۔ میں ایک رسالہ پڑھنے میں ایسا مصروف تھا کہ کچھ دھیان دے کر باتیں نہیں سن رہا تھا۔ اتنے میں پنڈت جی کی آواز نے مخاطب کر ہی لیا۔

پنڈت جی : وِمان ہمارے یہاں اگلے زمانہ میں تھا۔ یہ ہوائی جہاز کوئی نئی چیز نہیں ہے۔

طالب علم : اس کا میں نہیں قائل۔ اگر تھا تو یہ اس طرح بنتا تھا یا کسی اور طرح، چار حرکت والے انجن کے طریقہ پر چلتا تھا یا ہوائی کے اصول پر چلتا تھا۔ ہوا سے ہلکا ہوکر اڑتا تھا یا ہوا سے بھاری ہوکر، بجلی کے زور سے چلتا تھا یا کوئی اور طاقت چلاتی تھی، خالی وِمان کا خیال تو چڑیا کو اڑتے دیکھ کر بھی آسکتا ہے۔ جب یہ نہ

بتائیں بتایئے تو ومان کا قائل کیسے ہوجاؤں۔

پنڈت جی: کتابوں میں سب کچھ موجود ہے اگر کوئی نہ دیکھے تو کیسے معلوم ہوگا۔

مولوی صاحب: ہم مسلمانوں کے یہاں بھی تخت سلیمان تھا یہ کوئی نئی چیز ہرگز نہیں۔

طالب علم: مسلمان حضرت سلیمان کے وقت میں کہاں تھے اور تخت سلیمان کی بھی حکمت نہیں معلوم۔

مولوی صاحب: یہ آپ نے کیا فرمایا۔ حضرت سلیمان کے وقت میں مسلمان کیسے نہیں تھے۔ ہمارا دین تو وہی ہے جو حضرت آدم کا تھا۔ آپ قرآن شریف کو دیکھیے تو معلوم ہوجائے گا۔ اللہ تعالٰی فرماتا ہے............

وکیل صاحب: بحث تو ہوائی جہاز کی تھی، مسلمان کبھی سے رہے ہوں اس کو چھوڑیے۔

مولوی صاحب: جی ہاں اسی کو تو عرض کر رہا تھا۔

اتنے میں ایک بندر مولوی صاحب کا حیدرآبادی رومال جس میں کچھ بندھا تھا اٹھا لے گیا۔ بندر کی صفائی کو بھلا مولوی صاحب کیا پہنچتے مگر مولوی صاحب اور میں بلا سوچے سمجھے باہر نکل آئے یہاں کیا دیکھتے ہیں کہ یہی مضمون بندر اور پوٹلی کا پلیٹ فارم پر مختلف انداز سے باندھا جارہا ہے۔ سائبان کے نیچے سائبان کے اوپر مختلف درجوں کے اندر گاڑیوں کی چھت پر، دوپٹا کہیں چادر کہیں، دوسری چیزوں کی لوٹ پڑی ہے۔ لوگ چھڑیاں لیے بندروں کو بھگا رہے ہیں۔ روٹیوں، امرودوں کی رشوتیں کھلم کھلا چل رہی ہیں۔ ان چیزوں کے بدلے پھٹے کپڑے گرتے ہوئے اناج کی گٹھریاں بندر لوگ نہایت بے پروائی سے چھوڑ رہے ہیں۔ ایک فرسٹ کلاس میں تین امریکن سفر کر رہے تھے۔ ایک بندر ان لوگوں کے بیچ سے ایک سیب نہایت صفائی سے لے گیا۔ اور اچک کر سائبان کے نیچے ایک لوہے پر جا بیٹھا۔ یہ ادا ان لوگوں کے کچھ ایسی بھائی کہ ایک نے اور سیب نکالے اور اس بندر کی طرف پھینکنے لگا۔ لیکن بالکل دوسرے انداز سے یعنی دوسروں کی روٹیاں اور امرود لیتے وقت نگاہ چاروں طرف دوڑایا کرتے تھے اور نہایت ہوشیاری سے ہاتھ پاؤں بچا کر کارروائی ہوتی تھی۔ مگر اس امریکن سے کچھ عجیب طرح

کا بھائی چارا تھا جس میں احتیاط اور خوف کا پہلو کم دکھائی دیتا تھا۔ اس افسر نے سیب پھینکا تو مگر کافی اونچا نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بندر اس کو نہ لے سکا اور سیب پلیٹ فارم پر ہی رہ گیا۔ اس کے گرتے ہی ایک خارشتی کتا، ایک لنگڑا لڑکا جو بھیک مانگ رہا تھا اور ایک کوڑھی فقیرن تینوں اس کی طرف لپکے اس امریکن کا انداز دیکھ کر کئی آدمیوں نے ان تینوں کو ڈانٹا، کتا دب گیا، کوڑھن بھی ہٹ گئی۔ لیکن منچلے لنگڑے لڑکے نے اس کوا ٹھا ہی لیا۔ امریکن افسر نے دوسرا سیب اچھالا جو بندر کو مل گیا اور وہ امریکن ہندستانی کوڑھن، لنگڑے لڑکے، خارشتی کتے اور بندر کا تماشا دیکھ کر اپنے درجے میں جا بیٹھا۔

(کشکول)

ایک عمدہ کتاب

سر رضا علی کی کتاب اعمال نامہ پڑھی جارہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ سرسری تنقید بھی ہوتی جاتی تھی۔

ایک دوست: ''بھئی مجھ کو جو بات اس دال روٹی پوس کاٹ میں سب سے زیادہ پسند آئی وہ سچائی کی کھنک ہے۔ بے چارے نے اپنے دل کے دونوں کنواڑ کھول کر رکھ دیے ہیں کہ جو کچھ ہے دیکھ لو، کوئی پردہ نہیں ہے۔

دوسرے دوست: اب چاہے دال روٹی پوس کاٹ کہہ کر ہنسئے چاہے اس کی صاف دلی کی داد دیجیے۔

تیسرے دوست: دل کے دونوں کنواڑ کھول کر لکھ دینا کوئی معمولی بات نہیں ہے زیادہ سے زیادہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے اس کی کوشش کی ہے، کامیاب بھی ہوئے یا نہیں۔ یہ ذرا غور کے قابل ہے۔ اگر یہ فرمایئے کہ زبان خوب کمائی ہوئی ہے تو میں ماننے کو تیار ہوں۔ اگر یہ کہیے کہ انھوں نے تہذیب کو کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے تو یہ بھی درست ہے لیکن پوری بات کہہ جانا کارے دارد۔

دوسرے دوست : میں مطلب نہیں سمجھا۔ بے چارے نے اپنے خانگی معاملات ساس بہو کی اَن بَن تک کہہ گزاری ہے۔ پھر اور کیا کرتا بڑے بڑے بزرگوں کی خامیاں، کمزوریاں نہایت صفائی سے بیان کردی ہیں اور کیا چاہیے۔

تیسرے دوست : ہاں ہاں یہ بالکل ٹھیک ہے۔ انھوں نے بھرپور اس کی کوشش کی ہے مگر ہر شخص روسو نہیں ہوسکتا۔ آپ تہذیب کا بھی دامن نہ چھوڑیں گے، قانونی گرفت بھی نہ آنے دیں گے۔ بزرگوں کی وکالت بھی کرتے جائیں گے اور سچائی کو بھی لیے رہنے کی کوشش کریں گے تو اللہ ہی نے کہا ہے کہ کہیں نہ کہیں ٹھوکر

دھری ہے۔ غریب نے کتاب کو دلچسپ بنانے کے لیے نہ معلوم کتنے قصے عشق عاشقی کے بیان کر ڈالے ہیں، مگر انسان کے مبارک گناہ یعنی اس کی جنسی لغزشوں سے سب کو بچا لیا ہے۔ حضرت آدم و حوا کے پہلے گناہ سے ایسے ڈرے ہوئے ہیں کہ عملاً سب کچھ کریں گے مگر منھ سے نہ کہیں گے۔ اس طرح کی باتوں سے اور صداقت سے جس سے انسانیت پر روشنی پڑتی ہے کوسوں کی دوری ہے، اگر آپ کہیں کہ ہندو مسلمان اختلاف کی تاریخ اچھی بیان کی ہے اردو ہندی کے جھگڑے کا بھانڈا خوب پھوڑا تو میں بھی تسلیم کرنے کو تیار ہوں، لیکن یہ کیونکر مان لوں کہ کسی کو خفا بھی نہ کیجیے گا، قدیم تہذیب کے خلاف باتیں بھی نہ کہیے گا اور پھر سچائی کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دیجیے گا۔ تو یہ کیسے بنے گی، آپ کی جتنی ہیروئن ہیں وہ سب کی سب کنواری بیٹھی رہیں گی۔ آپ کے جتنے ہیرو ہیں وہ سب بسم اللہ کے گنبد کے پلے ہوں گے اور پھر بھی زندگی ویسے ہی اصل دِکھائی دے گی جیسی کہ ہوتی ہے تو یہ کیسے ہوسکتا ہے۔

دوسرے دوست: (ذرا گرمی کے ساتھ) کیا آپ کا مطلب ہے کہ سر رضا علی نثر میں وہ کھلی ڈلی حماقتیں کرتے جن کی اجازت صرف نظم اور بندا دین کی ٹھمریوں میں ہے۔

تیسرے دوست: (خفیف سی اونچی آواز میں) نظم اور بندا دین کی ٹھمریاں تو میں جانتا نہیں لیکن حد سے زیادہ تہذیب برتنے میں کھیل بنتا ہی نہیں۔ محسن الملک مرحوم کا حال لیجیے۔ مرحوم کا قصہ تو الگ رہا خود پڑھنے والے اس چکر میں پڑ جاتے ہیں کہ جتنی نیک دلی اور درگزر سر رضا علی اپنے میں ظاہر کر رہے ہیں یہ فطرت میں بھی ہے یا نہیں، جو پھس پھسی، عشق و محبت کی کہانیاں انھوں نے لکھی ہیں، آیا دنیا میں ایسا بھی ہوا کرتا ہے یا کہیں انسانیت جوش حیات سے دب بھی جاتی ہے۔

پہلے دوست: جناب مرزا صاحب آپ کچھ نہیں بولتے۔

مرزا صاحب: جی سن رہا ہوں ''ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے''۔

تیسرے دوست : ہاں مرزا صاحب، آپ فرمائیں ہم لوگوں کو جو کچھ کہنا تھا کہہ چکے، فیصلہ آپ ہی کے ہاتھ ہے۔

دوسرے دوست : مجھ کو کوئی عذر نہیں لیکن دونوں فریق کو جو کچھ کہنا ہے وہ پہلے سن لیں، اس کے بعد حکم سنا دیں۔

مرزا صاحب : فیصلے دوسرے کرتے ہوں گے، میں تو اقبال جرم کرتا ہوں، سزا آپ حضرات خود تجویز کریں (پہلے دوست کی طرف مخاطب ہوکر) اس دنیا میں بے عیب کون ہے جب ہمارے آپ کے ایسے لوگ اتفاق سے غلطی کر جاتے ہیں تو بے چارے سر رضا علی کی کتاب میں خامیاں ہوئیں تو کیا تعجب ہے لیکن بحیثیت مجموعی کتاب خوب ہے۔ پالیٹکس ان کا کام ہے وہ بہت اچھا کیا ہے احباب کا ذکر اس انداز سے کیا ہے کہ جس میں احباب سے زیادہ خود ان کی نیک دلی اور اُجلی روح کا پتا چلتا ہے۔ آدمی یقیناً دل پھینک قسم کے واقع ہوئے ہیں اور ان لوگوں میں معلوم ہوتے ہیں جو کر گزریں گے مگر کہہ نہ سکیں گے، بقول سعدی کے۔ ''جوانی میں اے ہم نشیں جیسی پڑتی ہے تو بھی جانتا ہے'' معلوم ہوتا ہے ۔

انھیں بھی آتش الفت جلا چکی اکبر
حرام ہوگئی دوزخ کی نار ان پر بھی

مگر ساٹھ سے اوپر کے آدمی ہیں، بے چارے صاف گوئی کی کوشش کرتے ہیں مگر کامیاب نہیں ہوتے۔

دوسرے دوست : بزرگوں میں آپ بھی ہیں۔

مرزا صاحب : ابی ہم سینگ کٹا کر بچھڑوں میں داخل ہوئے ہیں، ہمارا کیا کہنا، کتاب کی تنقید آپ حضرات کریں، ہم تو صرف اپنی تنقید کرتے ہیں جس میں بہ حیثیت انسان کے ہمارا آپ کا سر رضا علی اور ازاڈوراڈنکن سب کا حال ہے۔ یہ نہیں کہ کوئی سن لے گا۔ کوئی سمجھ جائے گا، ''کوئی غیر مہذب ٹھہرا دے گا'' اس لیے تصویر ادھوری چھوڑ دی۔

اجی حضرت ہومر سے لے کر سعدیؔ، گیٹے اور مرزا محمد ہادی رسوا کی پیروی میں اگر ہم وکٹورین پنچایت سے ٹاٹ باہر کردیے جائیں گے تو ٹھینگے سے لیجیے آپ بھی سنئے۔ مگر پہلے ذرا کچھ گزارش کرلوں، ہم آپ کی نئی نئی باتوں پر نہیں ہنستے۔ آپ ہماری پرانی باتوں پر کیوں ہنسیئے، آدمی کی فطرت نہ بدل گئی ہے اور نہ آئندہ ہی اس کے خدانخواستہ فرشتہ ہوجانے کا ڈر ہے۔ پھر یہ نوجوانوں کا برتری کا گھمنڈ کس برتے پر؟ زمانے کے ساتھ کچھ ردوبدل ہوجاتا ہے، کچھ انداز میں فرق آجاتا ہے بس لوگ سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم اپنے پہلے والوں سے اچھے ہوگئے۔ ہم نے ترقی کرلی، مجھ کو جو بات ان نوجوانوں میں بھاتی ہے وہ یہی بھولاپن ہے جنسی ہی معاملات کو لے لیجیے، وہی عشق و محبت کی کہانیاں ہیں۔ وہی دل کی حکمرانیاں ہیں، اگلے لوگ رنڈیاں نوکر رکھتے تھے، اب گھر گرہستیوں کا راج ہے۔ پہلے پیشہ ور تھے، اب دل بہلاؤ کے لیے انیلی خوش باش ہیں، رنڈیوں کی لڑکیاں برابر اپنے پیشے کے لیے تیار کی جاتی تھیں جو اپنے کام کی اونچ نیچ سے واقف ہوتی تھیں۔ ان کے سر پر ان کے بزرگ ہوتے تھے جو بے راہ چال سے ان کو روکے رہتے تھے۔ اب ہر 'بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی' اب جس چھوکری کو دیکھیے بن سانپ کا منتر جانے بل میں ہاتھ ڈالنے پر تلی ہے۔ کہیں خودکشیاں ہیں، کہیں بدنامیاں ہیں، کاتا اور لے دوڑی اور چیز ہے۔ کرنے کی وِدّیا اور ہے۔ اچھا تو اب قصہ سنئے۔

ہمارے مکتب میں ایک رئیس زادے تھے جو سِن میں ہم سب سے بڑے تھے۔ قریب قریب باپ بیٹے کا فرق رہا ہوگا۔ ان کی تعلیم ہم سے دس گیارہ برس پہلے ختم ہوئی تھی، مگر بے چارے ایسے اچھے آدمی تھے کہ بزرگی کا خیال نہیں کرتے تھے اور ہم کو باوجود عمر کے فرق کے اپنی بے تکلف صحبت میں داخل کیے ہوئے تھے۔ ان کے پاس ایک نئی رنڈی نوکر ہوئی۔ نہایت خوبصورت، بڑی خوش مزاج اور اس فلسفہ کی قائل تھی جس کا پہلا کلیہ یہ ہے کہ جوانی پھر لوٹ کر نہیں آتی، ہمارے دوست کا جو سِن رہا ہو ہم کوئی اٹھارہ انیس کے تھے۔ رنڈی کا سِن ہمارے اور ان کے درمیان میں توازن قائم کیے تھے جس کے پاس بھر دِل جوانی اور تجربہ دونوں تھے۔ ہم لوگ گنجیفہ کھیل رہے تھے

مگر عجیب اتفاق کہ سوائے ہمارے دوست کے اور کسی سے کھیل بن ہی نہیں رہا تھا، اس رنڈی کے لاکلو سوخت ہوگئے اور ہم کھیل اعلیٰ کا دوسرا سر دینا بھول گئے اور پھر بجائے سوختی ہونے کے ہنسی برابر چلی آرہی ہے جیسے زمین و آسمان کے بیچ میں گدگدی ہی گدگدی بھری ہو۔ ہمارے دوست الجھ الجھ کر رہتے ہیں۔ کئی مرتبہ پتے بھی پھینک دیے کہ اس کھیلنے سے کیا فائدہ، مگر ہم نے سنجیدگی کا وعدہ کیا اور پھر وہی کیا۔ ہم ناکند بچھیرے ایک نیا لطف محسوس کرتے تھے، مگر یہ لطف کس وجہ سے تھا، یہ نہ سمجھ میں آتا تھا، نہ اس کے سمجھنے کا خیال ہی ہوتا تھا۔ معلوم نہیں ان دونوں کے دلوں میں کیا لہریں اٹھ رہی تھیں۔ اس رنڈی کی دل آویزی ہمارے دل میں جگہ قرار کرتی چلی جاتی تھی۔ جنسی خیالات بھی ابلے پڑتے تھے، مگر ان خیالات کو عملی جامہ بھی کس طرح پنہایا جاسکتا ہے۔ اس کی بابت کوئی امید افزا یا مایوس کن منصوبے ناتجربہ کاری کی بنا پر دل میں آہی نہیں رہے تھے۔ جو کچھ تھا وہ ہی کیا کم مزے کا تھا جو اور زیادہ کی ہوس ہوتی کیونکہ غریب آدمی کی دولت ناواقف کاری ہی میں ہے۔ اب برسوں کے بعد سمجھ میں آتا ہے کہ ہمارے تجربہ کار دوست کیوں الجھ رہے تھے اور آزمودہ کار سپاہی کی طرح وہ رنڈی کیوں نہایت اطمینان سے کھیل رہی تھی اور ہنس بھی رہی تھی۔ عورت اس قسم کے ہر نئے موقع پر مرد سے اپنے کو کیونکر زیادہ لیے دیے رہتی ہے اور کیونکر زیادہ نڈری سے کام کرتی ہے اس کو عورت کے نفسیات جاننے والے سمجھیں یا وہ سپاہی جو میدان میں صرف مورچہ ہی نہیں سر کرچکا ہے بلکہ شکست اٹھانے پر بھی جی نہیں ہارا ہے، اس کے بعد کئی موقعوں پر ہم تینوں کا ساتھ رہا ہے لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے کوئی بات یاد رکھنے کے قابل نہیں ہوئی اور نہ کوئی خاص یگانگی ہی بڑھی۔ اس واقعہ کو دو تین ہفتہ ہوگئے اور ہم اپنی اس مختصر سی کائنات عیش و رنگ ہی کو بہت سمجھا کیے کہ اتنے میں ایک تار ملا ''آٹھ بجے شام کی گاڑی پر ہم سے ملو'' بھئی واہ یہ تو خوب ہوا! بھلے کو رات کے آٹھ بجے گاڑی آتی ہے، اگر دن کے آٹھ بجے گاڑی آتی تو بڑی گڑبڑ ہوتی۔ دیکھیں یار ملاقات میں کوئی کھنڈت تو نہیں پڑتی اور اگر اسٹیشن پر کوئی بزرگوں میں سے مل گیا تو کیا کریں گے! اونھ ہوگا! کوئی دیکھ ہی لے گا تو کیا کرے گا اور ہم اس سے

کچھ تعلق کرنے تھوڑی ہی جارہے ہیں۔ خالی ملاقات میں کیا ہرج ہے۔

ایک ساتھ کھیلے رازدار نوکر کو ساتھ لے کر اسٹیشن پہنچے۔ نوکر سے مشورہ کرنے لگے۔ سنو جی اسٹیشن پر آٹھ بجے آنے والی گاڑی کا میل، ادھر سے آنے والی گاڑی سے اگلے اسٹیشن پر ہوگا۔ اگر موقعہ ہوا تو ہم وہاں تک چلے جائیں گے اور زیادہ سے زیادہ 35 منٹ میں واپس آجائیں گے، تم اسٹیشن پر ہی موجود رہنا۔ ہاں اور سن لو، جب ہم اشارہ کریں گے، تب تم ٹکٹ لینا، گاڑی آئی اور بہت سی خوشی تھوڑی وحشت سے ملاقات کی۔ بھلے کو درجہ بالکل خالی تھا اور سردی کی وجہ سے جھلملیاں چڑھی ہوئی تھیں یہ اچھا ہوا۔

اگلے اسٹیشن تک چلیے ساتھ رہے گا۔ شروع شروع کی کم ہمتی میدان خالی پاکر کھل کھیلی۔ اپنے پن کو فطرت نے راہ دکھائی۔ پھر بھی جو کمی رہ گئی وہ استاد نے بتا دی۔ دبکی ہوئی تھی، گربہ صفت خواہشِ گناہ چمکارنے سے پھول گئی شیر ہوگئی۔

بھئی اہاہا، زندگی میں اتنے بڑے بڑے راز پنہاں تھے اور ہم آج تک بے خبر، خیراب سے آئے گھر سے آئے۔ کیسا اگلا اسٹیشن اور کیسا پچھلا اسٹیشن، گاڑی پٹریوں پر چل رہی تھی اور ہم رنگ برنگ کے بادلوں میں سے ہوتے ہوئے چاند کے پاس پہنچ رہے تھے۔ پہلے دوسرے تیسرے نہ معلوم کس آسمان پر تھے کہ یکبارگی جو چیتے تو گھر سے تین سو میل پر ایک بڑے جنکشن کے اوپر کھڑے ہیں، صرف چند ریزگاریاں اور چھ میل کا ٹکٹ جیب میں اور ٹکٹ چیکر کا سامنا ہے۔

ٹکٹ چیکر: یہ ٹکٹ تو صرف فلاں اسٹیشن سے فلاں اسٹیشن تک کا ہے۔

میں: ہاں ہم کو ادھر کی گاڑی سے بھیج دیجیے جس قدر دام کہیے گا وہیں دے دیں گے۔

ٹکٹ چیکر: یہ کیسے ہوسکتا ہے۔

میں: تو آپ میری گھڑی اس وقت تک کے لیے رکھ سکتے ہیں جب تک میں روپیہ نہ دوں، یا میں تار بھیج کر روپیہ منگوا سکتا ہوں۔

ٹکٹ چیکر۔ اور وہ لیڈی کون تھیں جو آپ کو رخصت کرکے پھر گاڑی میں بیٹھ گئیں۔

میں: یہ آپ کیوں پوچھتے ہیں، یہ میں نہ بتاؤں گا، آپ کو روپیہ چاہیے وہ آپ میری
گھڑی سے وصول کر سکتے ہیں۔
ٹکٹ چیکر: چلیے اسٹیشن ماسٹر کے پاس یہ وہی طے کریں گے۔
اسٹیشن ماسٹر صاحب نے ٹکٹ چیکر سے حال سنا، پھر میری طرف مخاطب ہوئے
اور تقریباً سب وہی باتیں پوچھیں جو اوپر آچکی ہیں۔
اسٹیشن ماسٹر: اگر تار دیا جائے تو کہاں۔
میں: فلاں اسٹیشن کو۔
اسٹیشن ماسٹر: (دلچسپی سے) آپ کا نام کیا ہے۔
میں: (اک ذرا رک کر) منّے (جو میرا عرف ہے)
اسٹیشن ماسٹر: (اور زیادہ دلچسپی سے) آپ کے والد کا نام۔
میں: (باپ کا نام غلط بتانا حمیت کے خلاف، شرافت کے خلاف یہ تو غلط نہیں بتا سکتا)
میں نے صحیح نام لے لیا۔
اسٹیشن ماسٹر ہاتھ پھیلا کر دوڑے اور مجھ کو گلے سے لگا لیا۔
اس کو حسن اتفاق کہتے ہیں۔ کہاں آپ اور کہاں یہ جگہ۔ آپ ہم کو کیا جانیں مگر ہم
آپ کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ ہم نے آپ کو گودیوں میں کھلایا ہے آپ کے
والد سے اور ہم سے بڑے مراسم تھے ہم وہاں سے برسوں ہوئے چلے آئے۔
ہمارے والد صاحب سید غلام حسین کو آپ جانتے ہوں گے۔
ہاں ہاں خوب جانتا ہوں۔
اسٹیشن ماسٹر: جب انھوں نے دوسری شادی کر لی تو ہم لوگ اپنے ننھیال چلے آئے،
وہاں کا سلسلہ ہی چھوٹ گیا۔
میں: بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔
اسٹیشن ماسٹر: اس وقت جو حالت میرے قلب کی ہے وہ میں ہی جانتا ہوں ۔ اس وقت
وہ صحبتیں یاد آگئیں۔ وہ بھی کیا زمانہ تھا مجھ کو آپ کی صورت دیکھتے ہی کچھ یاد

آرہا تھا۔ (ہنس کر ہی ہی ہی) اور یہ لیڈی کون تھیں؟
میں: اب اس کو کیا کیجیے گا پوچھ کر۔
اسٹیشن ماسٹر: ہی ہی ہی اچھا جانے دیجیے، مگر ہی ہی ہی ہمارا زمانہ بھی خوب تھا۔
(کشکول)

خطبۂ صدارت جو ایک اسکول کے مشاعرے میں پڑھا گیا

حضرات۔ مشاعرہ جیسے انگور کی پٹاری جس میں انگور کم اور روئی زیادہ اور صرف چوٹی پر چند اچھے دانے، دوسری پرت میں سوکھے سیجے پھل اور تیسری پرت تو سڑی پھپھوندی لگی ہوئی۔ اسی سبب سے مشاعرے سے بھاگتا ہوں اور مشاعرے والے بھی مجھ کو منہ نہیں لگاتے۔ مگر آپ کے جلسے سے انکار نہ کرسکا، کیوں کہ اس میں نوجوان ہونہاروں کا پاؤں درمیان تھا اور اس وجہ سے میرا ہاتھ بھی پتھر کے نیچے دبا تھا کیوں کہ آپ حضرات کا صرف دعا گو ہی نہیں ہوں بلکہ یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ میں امنگ ہے جس سے آئندہ کی امیدیں بندھتی ہیں۔ آپ میں جوانی کا جوش ہے جو نئی راہیں نکالے گا۔ آپ کے دلوں پر ابھی کھرونچے نہیں لگے ہیں، اس پر عمدہ نقش بنیں گے۔ یہی وجوہ تھے جو اس بہی خواہ کو یہاں تک کھینچ لائے۔ آپ کی عزت افزائی کا ممنون ہوں۔ شکریہ قبول فرمایئے۔

شاعری کی ضرورت دنیا نے ہمیشہ سے مانی ہے، لیکن کس طرح کی شاعری واقعی شاعری ہے ذرا کٹھن معاملہ ہے۔ اس مسئلے پر بحث کرنے میں جوکھم ہے، خدا واسطے کو کوئی خفا ہو جائے تو کیا فائدہ! پھر بھی کچھ نہ کچھ تو عرض کرنا ہی پڑے گا، نہیں تو خطبۂ صدارت ہی کی ٹھیک نکلی جاتی ہے۔ ادب اور علم کے حامیوں کے نزدیک شعر میں علاوہ اور باتوں کے تین چیزیں ضروری ہیں جدّت، اثر، سادگی۔ جدّت سے مقسوم یہ نہیں کہ مضمون اچھوتا ہی ہو، بالکل نیا مضمون کسی کو کہاں نصیب، خیال پرانا ہی سہی مگر شاعر نے محسوس کرکے کہا ہو، اس کو مت ڈرے کہ دل سے نکلے ہوئے مضمون کو لوگ نقل ہی سمجھیں گے۔ یہ دھوکا کسی میں ہوتا ہے۔ اگر آپ کے پیٹ میں درد ہے تو دوسرا

مریض یہ نہیں کہہ سکتا کہ آپ نے اس کی بیماری چرائی ہے۔ دل سے نکلا ہوا شعر، کھرے روپے کی کھنک کہ وہ چھپتی ہی نہیں، اسی کا نام صداقت بھی ہے اور چوں کہ آپ نے اپنی تکلیف دوسرے سے علاحدہ بھی کر لی ہے اس لیے بدّت بھی کہی جاسکتی ہے۔ شعر میں صداقت کا ذکر امیر خسرو کی انمل معلوم ہوتی ہے مگر واقعہ ہے۔ جب نام ترا لیجیے تب چشم بھر آوے۔ اس طرح سے جینے کو کہاں سے جگر آوے اس شعر کے متعلق مجھ کو دو واقعہ یاد ہیں۔ میرے ایک عزیز کی بیوی کا انتقال ہوگیا تھا۔ ایک دن دوپہر کو آرام کر رہے تھے آنکھ شاید لگ گئی تھی، یکبارگی یہ کہتے ہوئے اٹھ بیٹھے۔ ''جان عذاب میں کر دی ہے اس عورت نے۔'' دوسرا واقعہ اس سے بھی سخت ہے، ایک صاحب کا قصہ ہے جو بیوقوف مشہور تھے اور اسی وجہ سے اکثر سچ بولتے تھے۔ ان کا جوان بیٹا جدائی کا داغ دے گیا، جو کچھ ان پر گزری گزر گئی۔ لوگوں نے ہمدردی کا مرہم رکھا، زمانے نے اِندمال کیا، خدا نے صبر دیا۔ اس واقعے کو کوئی مہینہ بھر ہو چکا تھا۔ ایک دور کے رشتے دار کسی ضرورت سے تشریف لائے، بڑے میاں نے وہیں سے دیکھ کر آؤ بھگت کی، مزاج پُرسی کرنے لگے۔ نووارد صاحب نے سو دو سو قدم پہلے ہی سے رگ پٹھوں کو توڑ مروڑ کر تعزیتی چہرہ بنا رکھا تھا کہنے لگے ''صاحبزادے کے انتقا............'' بڑے میاں الجھ پڑے ''بھئی آفت میں جان ہے، اگر کسی وقت بھول بھی جاؤ تو یار لوگ نہیں بھولنے دیتے'' اگر اجازت ہو تو وہ سچائی اور اثر سے بھرا ہوا شعر پھر عرض کردوں۔ جب نام ترا آوے تب چشم بھر آوے۔ اس طرح سے جینے کو کہاں سے جگر آوے۔ یہ شعر ایسا ہے کہ جس میں تینوں جذبے موجود ہیں، اس کے علاوہ چیزیں بھی ہوسکتی ہیں۔ فغاں کا ایک شعر ہے۔ اے فغاں دیکھنا سمجھ لینا۔ دے کے دل پھر لیا نہیں جاتا۔ اس میں سب کچھ موجود ہے................ (نامکمل)